حمائل شریف

مشہور خوش نویس فاطمۃ الکبریٰ بنت محمد دین صاحب خوش نویس کی لکھی ہوئی حمائل شریف جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ کتابت کی دلآویزی اور پاکیزگی کی وجہ سے خاص شان کی مالک ہے۔ ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ محترمہ فاطمۃ الکبریٰ وہی خاتون ہیں جنھیں اپنے فن میں کامل ہونے کے باعث حکومت حیدرآباد سے ایک گراں قدر وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ہدیہ ...

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۵ — نمبر ۲ | بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مطبوعاتِ جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو
اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی
کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی ہیں
اربابِ ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

اقبال

برون زیں گنبد در بستہ پیدا کردہ ام راہے — کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحر گاہے
پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند — جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے!

(اقبال)

(یہ غنائیہ نظر اور خیال کا ایک سفر ہے جو کلام اقبال کی روشنی میں بارگاہ تجلی تک کیا گیا ہے اس میں میں نے اقبال کے چند خاص تصورات اور ان کا مقام دکھانے کی کوشش کی ہے اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کو دیکھنے اور دکھانے کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں میں نے ان میں سے وہی پہلو لیا ہے جسے میں سب پر حاوی اور اہم سمجھ سکا۔ یہ غلط نہیں کہ فکر اقبال کی گہرائیوں تک پہنچنا دشوار ہے۔ یہ شاید توفیق ازلی تھی کہ ایسے نازک موضوع پر سب سے پہلے مجھے غنائی تمثیل لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میری اس "سعی دشوار پسند" پر رائے زنیاں ہوں گی لیکن اقدام اولین کی دقتوں سے قطع نظر، اگر اس میں ناظر کو شاعر مشرق کا پیام نظر آ جائے تو مجھے بڑا اطمینان ہوگا)

پہلا منظر

میلادِ آسمانی

(جنت کے ایک رنگین ترین حصہ میں جہاں شاعروں کی روحیں اپنے بلند تخیل اور دلی تمناؤں کو پھولوں کی طرح کھلتا ہوا دیکھتی ہیں اور ان کی آزادی کے ساتھ آبیاری کرسکتی ہیں غالب کی روح ایک بلند مقام پر کھڑی ہوئی مسرور نظر آرہی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

روحِ غالب۔ نور ریزانِ تصور، مری یزداں نگہی ‏ ‏ برقِ طوفانِ تجلی، میری پروازِ خیال
آج آشفتہ ہوئے گیسوئے شبگونِ فراق ‏ ‏ آج بیتاب ہوا شاہدِ رنگینِ وصال
قابلِ رشک ہے اندازِ جنوں کا انجام ‏ ‏ ہوگیا جنتِ اسرار بیابانِ خیال
سجدہ ریزی میں ہے مصروف مری لوحِ جبیں ‏ ‏ ہو آئینۂ فردا ہے مرا ذوقِ جمال

ایک فرشتہ۔ ہمرہِ طائرِ سدرہ ترے ارمان بلند ‏ ‏ رنگِ بیتابیِ فطرت ترے دل کے احوال

دوسرا فرشتہ۔ بحرِ فردا پہ مچلنے لگی تیری امید ‏ ‏ بھر گیا بادۂ الفت سے ترا جامِ سفال

(جنت کے پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ ہاتھ میں لئے ہوئے روحِ حالی آتی ہے اور غالب کو پیش کرتی ہے)

روحِ حالی۔ میرے اشکوں نے دیا تھا جسے اک رنگِ نمو ‏ ‏ اس گلستانِ تمنا میں بہار آئی ہے
خشک تھی وادیٔ ناشادِ محبت کی زمیں ‏ ‏ آج اس دشت پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہے

ارمغاں یہ اسی گلزار کا لایا ہے غریب
آپ کے ہاتھ میں بیدار ہوں اور اسکے نصیب!

(سامنے سے گورنمنٹ کی روح ایک عجیب و غریب شیشہ سنبھالے ہوئے گذرتی ہے۔ اس میں چند حسین جلوے نظر آتے ہیں بعض انسان بعض پھول بعض پریاں بعض ستاروں اور چاند سے ملتی جلتی ہیں کبھی کبھی ایک عجیب و غریب شکل بھی اس میں سے جھانکتی ہے چلتے ہوئے گورنمنٹ کی روح غالب کو دیکھ کر مسکراتی ہے)

گورنمنٹ کی روح۔ جامِ افلاک میں رقصاں ہے مری صہبائے نظر ‏ ‏ فرشِ انجم پہ درخشاں مری مخلوقِ خیال
عشق نے توڑ دیا بندِ نقابِ ماضی ‏ ‏ آج رنگیں نظر آتا ہے سراپردۂ حال

(ایسے میں حافظ اور عراقی کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے آتی ہیں گوئٹے کی روح ان کے لئے تھوڑا سر جھکاتی اور گذر جاتی ہے)

حافظ۔ دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند | گل آدم بسرشتند و بپیمانہ زدند

عراقی۔ نخستیں بادہ کاندر جام کردند | ز چشم مست ساقی وام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش | عراقی را چرا بدنام کردند

(اس گلشن سے دور ایک چٹان پر ورجل اور دانتے کی روحیں کھڑی ہوئی باتیں کر رہی ہیں ان کے بوڑھے چہروں پر بھی جوانی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غالب اور رومی یہ نظارہ دیکھتے ہوئے گذرتے ہیں تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں ایک وسیع میدان ملتا ہے اور اس میں ایک بلند فصیل نظر آتی ہے۔ اس پر دو روحیں چڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک شوپنہار اور دوسری حکیم نطشے کی ہے۔ دونوں کچھ تھکی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان کے چہروں پر غیر معمولی شگفتگی ہے)

شوپنہار کی روح مستی عقل و ہوش سے گریز شش جہات ہے | میرا جنون و بیخودی زینۂ کائنات ہے

وہم وجود ہے نقاب فطرت بے نیاز کا | مرحلۂ حیات پھر مرحلۂ حیات ہے

نطشے کی روح گنگناتی ہے)

لذت وہم و گماں چھائی ہر غم خانوں میں | گونج اٹھا نغمۂ غم میرے صنم خانوں میں

میرے سیماب سی افکار نے ڈالے رخنے | دہر کے خالق و مخلوق کے افسانوں میں

شکر ہے چھائے گا اک شاعر بیتاب کا رنگ | زندگی آئے گی کچھ دہر کے ویرانوں میں

(غالب اور رومی کی روحیں ایک ایسے مقام پر پہونچتی ہیں جہاں سیکڑوں قسم کی روشنیاں جگمگا رہی ہیں سارا باغ عالیشان ایوانوں سے مزین ہے۔ سامنے خوبصورت پہاڑ اور وادیاں نظر آتی ہیں۔ اتنا سایہ دار مقام ہے کہ روح کو نیند سی آنے لگتی ہے چشموں میں بجلیاں بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نور کے آبشار نگاہوں کے سامنے گرتے ہیں۔ باغ کی ایک زرنگار محراب سے پیر رومی کا تاج پہنے ہوئے نکلتے ہیں یہ اقبال کا ہاتھ تھامے ہوئے فرشتوں کے آگے چل رہے ہیں پیچھے فرشتوں کا نغمہ رہتا ہے)

فرشتوں کا نغمہ۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگرے، خودشکنے خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

(پیامِ مشرق)

دوسرا منظر

کوہ ہمالہ

(کوہ ہمالہ کی سر بہ فلک چوٹیاں کہر اور بادوں کا ایک پر شکوہ نقاب ڈالے ہوئے ہیں۔ زور کے جھکڑ چلتے ہیں اور چوٹیوں سے برف پھسل پھسل کر گرتی ہے۔ دور بلند قامت چنار کے درخت حسین وادیوں میں جھومتے ہیں۔ کہر، بادل، برف اور چنار اپنا اپنا حال دل بیان کرتے ہیں۔)

کہر۔
اس نیلگوں فضا میں سردی جمی ہوئی ہو — یا چتر آسماں کو جھالر لگی ہوئی ہے!
اک وحی زندگی ہے زنگ نزول میرا — شاید پیام ہستی ہوگا قبول میرا

بادل۔
کتنا اجلا ہے مرا ذوق تجلی یا رب! — ماہ و خورشید بناتے ہیں مجھے اپنی نقاب
ایک بیان تسلی ہیں مرے اشک حزیں — ایک طوفان تماشا ہے مرا رنگ سحاب!

برف۔
دہشت ہے زندگی کی جوش زوال میرا — کہسار کی جبیں پر ہے انفعال میرا
تعمیر سے کسی کی گرتی ہوں آہ بن کر — دل وقت سنگدل کا ہے پائمال میرا

(زور کا طوفان آتا ہے۔ چنار کے درختوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ جلتے ہوئے درخت پکارتے ہیں۔)

چنار کے درخت۔
ہوا اور پانی سے ہم جل رہے ہیں — یہ رحمت کے اضداد میں پل رہے ہیں
فرشتہ اجل کا ہمارا دروں ہے — یہ جنگل ہے یا موت کا ارغنوں ہے
ہماری صداؤں کی آتش نوائی — کئے جا رہی ہے لگائی بجھائی!
محبت کی گرمی سے پامال ہیں ہم — خدا رکھے شاید جواں سال ہیں ہم!

(فطرت کی اس ہم نوائی کا ساتھ ہمالہ نہیں دیتا۔ سب حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ہمالہ جواب دیتا ہے۔)

ہمالہ۔
مری خاموشیوں میں میری فطرت کی نوازش ہو — بلندی فطرت خاموش کی اک آزمائش ہو

ثنا اے ہمنوا! مجھ سے اپنی ہو نہیں سکتی — مری جاں اپنا گنج خامشی یوں کھو نہیں سکتی
اگر جو طائر بام فلک استعجاب انجم ہے — بپا بحر ازل میں فکر کا جس کے تلاطم ہے
صدا اس کی سنو روح تصور جھوم جائے گی — نظر اک فطرت عالی کی نغمہ بن کے آئے گی!

(اس وقت ہمالہ کی خاموش اور بلند چوٹیوں پر فضائے آسمانی میں یہ نغمہ گونجتا ہے)

اے[1] ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو! (بانگ درا)

تیسرا منظر

نغمۂ کائنات

(کرۂ ارض کی ایک پرسکون وادی۔ آبشار گرتا ہوا۔ آسمان پر ستارہ زہرہ جگمگا رہا ہے۔ اقبال کی روح اس میں کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان روح اور ہے۔ یہ دنیا میں کسی دن پیدا ہونے والے شاعر کی ہے اقبال اسے زمین کی طرف رخصت کر رہے ہیں۔ نوجوان روح اقبال کو سلام کر کے آگے بڑھتی ہے اور سطح ارض پر اتر آتی ہے اسے آتا ہوا دیکھ کر روح ارضی یہ ترانہ گاتی ہے)

کھول[2] آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ — مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ — ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

---

[1] بانگ درا ص ۳ [2] بال جبریل ص ۱۶۸

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے — پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

(شاعرِ مستقبل کی روح جب گزرتی ہے تو اقبال فلکِ زہرہ سے مسکراتے ہیں۔ اتنے میں عالمِ ناسوت ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے)

عالمِ ناسوت۔ مجھ پہ کھلا یہ عکسِ جاں آئینہ حیات کا — میں بھی تو ایک شعر ہوں محفلِ کائنات کا
میرے یہ باغ و راغ ہیں حسنِ ازل کی داستاں — محفلِ ناز و دست میں رنگ ہوں التفات کا

(روحِ اقبال عالمِ ناسوت سے کہتی ہے)

عالمِ آب و خاک و باد، سرِ عیاں ہے تو کہ میں[1] — وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟
وہ شب درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے — اس کی سحر ہے تو کہ میں اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر — شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟
تو کفِ خاک و بے بصر، میں کفِ خاک و خود نگر — کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

(اس کے اثر سے افلاک میں نغمے گونجنے لگتے ہیں۔ چند آوازیں اس طرح آرہی ہیں)

ستارے۔ کسی کی شوخیٔ غم دل کی آہ بن کے رہی — کسی کی روح ہماری نگاہ بن کے رہی
ہمارے آگے بھی پہونچا خیالِ حسن پرست — شعاعِ منزلِ جاں خضرِ راہ بن کے رہی

چاند۔ لے رہا تھا میری ہستی کا سکوں انگڑائیاں — سوزِ خاموشی میں جلتی تھیں مری تنہائیاں
میرے غاروں میں اداسی تھی عدم آباد کی — میرے کہساروں میں وحشت تھی دلِ برباد کی
کس نے روحِ آسماں کو اپنی منزل کر دیا — کس نے مجھ کو سینۂ آفاق کا دل کر دیا

خورشید میری نگاہ و دلگداز آگ کی برق گاں تھی — میری فضائے آتشیں ہیبتِ ذوالجلال تھی
خنجرِ برق آشنا میری تجلیوں میں تھا — دشنۂ غیظ کبریا میری تپیدوں میں تھا
آتشِ دل بجھا سی دی کس کی صدائے درد نے — سوزشِ عشق بخش دی کون فلک نورد نے؟

---

[1] بال جبریل ص

فضائے آسمانی۔ کون کہتا ہے کہ طے کرتی ہو اک جست نگاہ یہ طلسم برق و رنگ و نور کی جانسوز راہ؟

رضواں۔ مری نگاہِ محبت کا آشنا ہے کوئی مجھے خیال عبادت سے دیکھتا ہے کوئی

فردوس۔ یہاں نہ روحوں میں تشنگی تھی نہ ان کی بیتاب تھیں نگاہیں!

نہ کانپتی تھیں نظر سے اُن کی عروس فطرت کی بارگاہیں!

یہ کون بولا مرے مکانوں میں فکر و ذوقِ عمل نہیں ہے؟

یہ کون بولا کہ عشق انساں کا دو جہاں میں بدل نہیں ہے!

دوجہاں۔ شکر ہے ہم بھی آ گئے ایک نگاہِ ناز میں پردۂ چشم ہٹ گیا محفلِ امتیاز میں

وقت۔ کس نے دیکھی تھی مرے رنگِ سیاست کی بہار کس نے سمجھا تھا مرے دورِ حکومت کا مدار؟

کس نے ظلمت سے نکالا تھا شبستانوں کو کس نے انجم سے اُجالا تھا گریبانوں کو؟

ساقی۔ محبت سے دل کو گرما گئی وہ آواز تشنہ دہن آ گئی

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا مری خاک جگنو بنا کر اڑا

بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

تری آگ اس خاکداں سے نہیں جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

ملائکہ۔ نعرۂ اللہ ہو کے پاسباں رہتے تھے ہم بینوائے سوزِ دل تسبیح خواں رہتے تھے ہم

کس نے ہم کو آشنائے دردِ انساں کر دیا کس نے ہم کو رازدارِ سوزِ ایماں کر دیا

جبریل۔ نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذبِ مستی کی تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

سروش۔ لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

لعبل جبریل کی اس نظم میں اشعار مختلف مقامات سے انتخاب کر کے [illegible] ہیں۔ انگریزی الفاظ [illegible] کا ترجمہ

چوتھا منظر

مسجد قرطبہ

(روحِ اقبال مسجد قرطبہ میں ہے ہسپانی آسمان کا چاند مسجد کے مینار سے کہتا ہے)

چاند۔ موجِ ہستی کوئی ساحل سے نکل کر دیکھے
رنگِ عالم مری منزل سے نکل کر دیکھے

کس قدر اوج پہ ہے قیسِ محبت کا جنوں
میری لیلیٰ مجھے محمل سے نکل کر دیکھے

لا الہ کی جو صدا مسجد و محراب میں ہے
ایک ایمان بھرے دل سے نکل کر دیکھے

عہدِ اسلام کے ماضی پہ تمنا بن کر
آہِ غم سینۂ بسمل سے نکل کر دیکھے

مینار۔ نظر اٹھائی تو برباد تھا جہانِ عمل
میں سرفراز ہوا یا گناہگار رہا

گیا نہ حج کے دن تک مری نگاہ کا تیر
سمجھ رہا تھا کہ اس کے جگر کے پار ہوا

سنی تھی میں نے تری شان کی صدائے اذاں
وہی نشہ مرے افکار کا خمار رہا

نظر نہ آئے گا شاید کبھی زمانے میں
جو انقلاب کہ عالم پہ آشکار رہا

مسجد قرطبہ۔ روحِ اسلام کبھی دہر سے ہو گی نہ فنا
ایک پُر درد کی سن اب بھی صدا آتی ہے

(روحِ اقبال عالمِ محویت میں)

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لے میں ہے ذوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند، جلوہ گہِ جبرئیل

(پھر اٹھ کر وادی الکبیر کی طرف جاتی ہے اور کہتی ہے)

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانہ کا خواب

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

ایسے میں زندگی اقبال کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے وہ اس سے لانگ فیلو کی نظم "نغمۂ حیات" سنانے کی

۱؎ بالِ جبریل ۱۹۳۵ء بانگِ درا ص ۲۹۲

فرمائش کرتے ہیں۔ زندگی مسکراتی ہے اور چند خوبصورت لڑکوں کو سامنے لاکر کھڑا کرتی ہے۔ زندگی کہتی ہے
لانگ فیلو کی نظم انھیں یاد نہیں رہی۔ ایک اور نغمہ سنئے)

لڑکوں کی سنگت

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی میں تو ابھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

(”عہد مسلم“ سامنے آتا ہے اور کہتا ہے)

اے کلیمِ مدح و دل اور اے خلیلِ سوزِ جاں — تیری چشمِ شوق پر روشن زمین و آسماں
تیری فطرت رازدانِ شوکتِ اہلِ حجاز — تیری حکمت امتِ مرحوم کی آئینہ ساز
تیرے دل میں مرتعش نورِ محمدؐ کا چراغ — تیرے ہاتوں میں منورِ علم و عرفاں کا ایاغ
قومِ مسلم نیم جاں ہے، ہیچ و بے انجام ہے — ان غریبوں کے لئے اب تیرا کیا پیغام ہے؟

(روحِ اقبال جواب دیتی ہے)

نہ سلیقہ[1] مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ مجھ میں خلیل کا — میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو — میں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری
دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی — غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری
تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم — وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

(عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں سے آمین کی صدائیں آتی ہیں، اور پھر چند شعر کہتے ہیں)

مکہ۔ یاں گرمیٔ طواف تو ہے سوزِ جاں نہیں — لب پر وہ سجع زمزمۂ الاماں نہیں
مدینہ۔ گم سیاست میں ہے پیامِ مصطفےٰ — ہے دماغوں میں مقامِ مصطفےٰ

---
[1] بانگِ درا ص ۲۸۳۔

درس اب دیتی نہیں اُم الکتاب — انقلاب اے دورِ ہستی انقلاب!

قسطنطنیہ۔ ماتم جورِ زمانہ میں سنا کرتا ہوں — پاکیٔ حسنِ عمل کی میں دعا کرتا ہوں

دستِ جمہوریت آزاد قیادت بیدار — اک نئی لذتِ ایماں میں جیا کرتا ہوں

بغداد۔ کاش کہ سارے اہلِ دل کام لیں اعتماد سے — یاں کی زمین پاک ہے لذتِ اعتقاد سے

دمشق۔ ہے وائے انقلاب! روندی ہوئی ہوں میں — کن قدسیوں کے پاؤں کی روندی ہوئی ہوں میں

مصر۔ ہر چیز پہ چھایا ہے اب ذوقِ شہنشاہی — مذہب نے سکھائے تھے آدابِ خود آگاہی

ایران۔ عرب کی تہذیب سے ملا تھا عجم کی تعمیر کو سہارا — نہیں ہے اب دہر دوزباں کو صلیح و آشتی گوارا

شام۔ نغمۂ ضیا رہوں نغمۂ اغیار ہوں — کتنی دل افگار ہوں کتنی دل افگار ہوں

میری زمیں پاک تھی میری جبیں پاک تھی — آج اُس عہد کی دل سے طلبگار ہوں

ایک سے بڑھ کر ہے ایک میرے لئے دشنہ تیز — کفر کی آغوش میں قیدی غدار ہوں

فلسطین۔ جورِ یہود و جورِ نصاریٰ کیسے دکھاؤں — بہتا ہے خونِ مسلمِ ناداں کیا بتاؤں؛

ہندوستان۔ الفاظ شوخ و شنگ کی تلوار چل گئی — قاسم کی روح میرے بدن سے نکل گئی

(روحِ اقبال ان آوازوں کو سن کر دعا کرتی ہے)

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

(نوجوان شاعرِ مستقبل کی روح پُر اسرار طریقے سے مسجد کے ایک گوشے میں چھپی ہوئی یہ سن رہی ہے اور دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتی ہے)

شاعرِ مستقبل۔ روحِ فردا سے بنا ہے دلِ ناداں میرا — وقت آنے پہ نئے لائے گا گلستاں میرا

میری جاں روشنیٔ عشق پہ رقصاں ہوگی — گلشن بن جائے گا جس روز بیاباں میرا

دل مرے رہبرِ حالی پہ فدا ہوتا ہے — اس کے الہام میں پوشیدہ ہے ایماں میرا

روز بڑھتی ہی رہی تشنگیٔ ذوقِ صدا — ایسے نغموں سے ہوا درد کا درماں میرا

(شاعرِ مستقبل روانہ ہوتا ہے۔ روحِ ابلیس ایک زاہد کے لباس میں نمودار ہو کر راستہ میں حائل ہوتی اور کہتی ہے)

روحِ ابلیس۔ آ بتا دوں تجھ کو اپنے دل کی بات — فکر کی آزادیوں میں ہے نجات
دوسروں کی آنکھ سے دیکھیں اگر — ہیچ ہے یہ انتظام کائنات
غور سے خود پڑھ کلام اقبال کا — رائگاں ورنہ یہ صبح و شام ہے
کر خودی پیدا کہ مل جائے خدا — تیرے شاعر کا یہی پیغام ہے

(شاعرِ مستقبل ایک عالم فکر و اندیشہ میں پڑ جاتا ہے اور سر جھکائے ہوئے چلتا ہے۔ روحِ ابلیس پرستاران اقبال کے ذوق و شوق کا جائزہ لینے جاتی ہے کئی جگہ آزمائش کے بعد خوشی خوشی واپس آتی ہے کہ اس کے وسوسوں کو ہنوز دھکا نہیں پہنچا۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی ہیں وہ اطمینان کا سانس لیکر کہتی ہے)

روحِ ابلیس۔ شکر ہے علم نے کی میری تسلی ورنہ — میں بھری بزم میں بے چین ہوا جاتا تھا
شور ہستی کا بھلا ہو کہ مٹا یا اس کو — نعرہ حق و یقیں مجھ سے سنا جاتا تھا!
میں نے دکھلائی زمانہ کو وفاؤں کی بہار — شاعرِ دل مری تعریف کئے جاتا تھا!

چھٹا منظر

بارگاہ فطرت

(ایک دن بارگاہِ فطرت میں مظاہر حیات کی ایک مجلس گرم ہوتی ہے۔ ہوا، پھول، شبنم، صبح، نور، روح رقص، فوارہ، لالۂ صحرا، سمندر، موج، شمع، پروانہ، جگنو، ہر کوہسار، نسیم سحری، امید و جود و نگاہ، جلال و جمال جدت و تخلیق کے حسین پیکر سب جمع ہوتے ہیں۔ ہوا کی پری پاؤں میں شبنم کے گھنگرو باندھ کر رقص کرتی ہوئی آتی ہے اور یوں نغمہ سرا ہوتی ہے)

ہوا کی پری۔ چھنن چھنانن، چھنن چھنانن — چھنن چھنانن، چھنن چھنانن
سحر[1] مرا دل نظر مری جاں — اثر مرا غم خطر مری شاں

---

[1] یہ بحر موسیقی کی ایک خوبصورت لیکن مشکل تال "ہولی" یا "چاچر" پر قائم کی گئی ہے۔ بول ہیں۔ دھا دھن دھا دھا تن تا تن دھا دھا دھن اور تقطیع ہوگی۔ فعَلن فَعَلن فعلن فعلن۔

پانچواں منظر

وسوسۂ شیطانی

(روح ابلیس عالم تنہائی میں بے قرار نظر آرہی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

روح ابلیس: آہ تیرہ سو برس پہلے جو گونجی تھی صدا — کیا غضب ہے پھر وہی روحوں کو گرمانے لگی
گم کیا تھا جس کو میں نے خوابہائے زیست میں — پھر وہی تعبیر میرے سامنے آنے لگی
کروٹوں میں زندگی کی میں نے ڈالا تھا جسے — بے قراری پھر وہی آفاق پر چھانے لگی
کیوں ہوا اک آب جاں میں نور کا روشن چراغ — ظلمت قلب و نظر کیوں دل سے شرمانے لگی
یا الٰہی کیوں مٹا جاتا ہے مغرب کا فسوں — روح مشرق کس لئے پھر ہوش میں آنے لگی؟
کیوں ہوا پیدا دیار ہند میں اک بے قرار — کس لئے روح غلاماں ہجوم کرگانے لگی؟
نعرۂ جذب قلندر سے لرز جاتا ہوں میں — کیوں صدائے حق دلوں میں پھر جگہ پانے لگی؟
خیر اب بھی اک تسلی ہے کہ شاید اہل ہوش — سن کے آواز جرس ہوں گے بیاباں میں خموش
جا کے بزم زیست میں یہ راز دیکھوں تو سہی — عظمت شاعر کو دیوانوں سے پوچھوں تو سہی

(اتنے میں شاعر مستقبل کی روح ایک شفاف چشمہ کے کنارے کلام اقبال کا مطالعہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہہ رہی ہے)

شاعر مستقبل: کیسے نظر آئے گا اس کا مقام بلند — جو ہے ستاروں سے دور جو ہے تصور سے دور
عقل و خرد جس کے پر ذوق جنوں جس کی روح — بزم یقیں کے قریب چشم تحیر سے دور
چاہتا ہوں جاننا اس کے سخن کا پیام — نغمۂ ذات و صفات جس کی صداؤں میں ہے
چاہتا ہوں منکشف مجھ پہ ہو اس دل کا راز — تاب و تب کائنات جس کی اداؤں میں ہے

(اس وقت حضرت خضر سامنے آکر شاعر مستقبل کو ایک مسیح رہبر کا پتہ نشان بتاتے ہیں جو ہنگامۂ ہستی سے دور ایک خانقاہ میں اقبال پر خاموشی کے ساتھ تفکر کر رہا ہے)

حضرت خضر: اے خوش خیال بزم محبت نہ فکر کر — جا اور اس کی محفل علم و ہنر کو ڈھونڈ
ہر گام پر خیال رہے راہ راست کا — ہو طالب پیام ازل یا بشر کو ڈھونڈ

میں پیام عالم راز ہوں میں صدائے بزم حیات ہوں

وفا کا فلک دعا کی زمیں — خضر ہے کہیں سفر ہے کہیں

میں پیام عالم راز ہوں میں صدائے بزم حیات ہوں

وطن میں کبھی چمن میں کبھی — چمک میں نہاں گگن میں کبھی

میں پیام عالم راز ہوں میں صدائے بزم حیات ہوں

فلک سے پرے زمیں پہ سفر — ملک سے ملوں خدا پہ نظر

میں پیام عالم راز ہوں میں صدائے بزم حیات ہوں

چھنن چھنا نن، چھنن چھنا نن — چھنن چھنا نن چھنن چھنا نن

(ہنستے ہوئے پھول شبنم پری سے کہتے ہیں)

پھول۔ شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا — اے قاصد افلاک نہیں دور نہیں ہے
ہوتا ہے مگر محنت پرواز سے روشن — یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

(صبح اٹھلاتی ہوئی آتی ہے)

صبح۔ مانند سحر صحن گلستاں میں قدم رکھ — آئے تہ پا گوہر شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن — ہاتوں سے ترے دامن افلاک نہ چھوٹے

(اتنے میں آفتاب کی کرنیں نور برساتی ہوئی مسکراتی آتی ہیں)

ایک کرن۔ مرے نزول میں جاں بخشیوں کا فیض و عطا — مرے خرام میں ارواح آسماں کا جمال
میں چل رہی ہوں کہ فطرت میں ہو نمود ہری — میں چل رہی ہوں کہ گردش میں آئے جام سفال

(اسے دیکھ کر شبنم پری گاتی ہوئی اڑ جاتی ہے۔ کرن کہتی ہے)

کرن۔ دل آئینے کی طرح صاف ہے صبح کا — نگاہ صاف کو عالم میں کوئی باک نہیں
نوا کرتا ہے موج نفس سے زہر آلو — وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

(اتنے میں ایک صدا گرجتی ہوئی آرہی ہے)

سمندر۔ میں بھی ہوں[1] روحِ یزداں　　مجھ میں ہے زورِ طوفاں

تاروں کا میں افسانہ　　جلووں کا میں دیوانہ

عالم میں میری شوکت　　ہستی میں میری عظمت

آئینہ نورِ جاں کا　　گنجینہ میں ایماں کا

شورش ہے نیز دل میں　　میں بھی ہوں آب و گِل میں

(موجِ دریا لہریں مارتی ہوئی آتی ہے اور کہتی ہے)

موجِ دریا[2] میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے　　جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے

ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے　　کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے

زحمتِ تنگیِ دریا سے گریزاں ہوں میں

وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(شمع زرتار پہنے ہوئے آتی ہے اور کہتی ہے)

شمع۔ پوچھتا ہے مجھ سے یہ ایک شاعرِ رنگیں نوا　　کس کی ممنونِ کرم ہے میری فطرت کی ضیا

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی　　کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی؟

(جگنو چمک کر کہتا ہے)

جگنو۔ کس طرح میرا جلوہ کوئی دکھا رہا ہے　　آتی ہیں سن صدائیں فطرت کی انجمن میں

جگنو کی[3] روشنی ہے کاشانۂ چمن میں　　یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ　　یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا　　ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی　　نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

---

[1] یہ بحر موسیقی کی ایک اور تال سہ ماترا پر ہے بول ہیں۔ دھن دھن نا۔ دھاگے ترکٹ دھن نا　　تن تن نا۔ دھاگے ترکٹ دھن نا۔
… تقطیع ہوگی۔ مفعولن، مفعولاتن　　مفعولن، مفعولاتن۔ [2] بانگ درا ص۵۵ [3] بانگ درا ص۹۳۔

(پروانہ آواز دیتا ہے)

پروانہ۔ پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو — کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو؟

(جگنو جواب دیتا ہے)

جگنو۔ اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں — دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

(ایک آواز آتی ہے)

اے کرمک شب تاب سراپائے تو نور است
پرواز تو یک سلسلۂ غیب و حضور است — آئین ظہور است

مائیم کہ مانند تو از خاک دمیدیم
دیدیم تپیدیم نہ دیدیم تپیدیم — جائے نہ رسیدیم

(نگاہ کی پری مسکراتی ہوئی آتی ہے اور گنگناتی ہے)

نگاہ کی پری۔ بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی — شباب و مستی و ذوق و سرود و رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی — یہ بحر، یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماریٔ شب میں — طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں — کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

(روح اقبال اس روح پرور بارگاہ میں لب جو ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی اپنا گیت گارہی ہے۔ پہاڑوں سے آواز ٹکرا کے ساری فضا میں گونجتی ہے۔ پریاں حسین پیکر اور ساری محفل رقص کرتی اور روشیوں کی بانسریاں بجاتی ہے)

روح اقبال۔ تیری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں — میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند — میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں
گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود — گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں!

ا پیام مشرق۔ ۲ ضرب کلیم ۔ ۳ بال جبریل ۔

(آواز سروش پر اسرار طریقہ سے گونجتی ہے۔ روح اقبال اسے سن کر)

شادیا مرے ساقی نے عالم من و تو پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ہو
نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شورِ چنگ و رباب سکوتِ کوہ و لبِ جُو و لالۂ خودرو!

ساتواں منظر

خانقاہ

(شاعر مستقبل کی روح حضرت خضر کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہی ہے اور خاموش منکر کی خانقاہ کی طرف جا رہی ہے راستے میں اسے کالج، فوجی تربیت گاہیں، سیاسی دفاتر، وزراء کے مباحث ملتے ہیں یہ ان کی طرف سے منہ پھیر کے گذر جاتی ہے۔)

(شہر کی سرحد پر پُر فضا جنگل اور گنجان درختوں کی چھاؤں میں ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے۔ اس کے کنگرے پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا روح شاعر کا استقبال کرتا ہے۔)

پرندہ۔ اے گلستان عشق کے راہی خوش آمدی اے پیکرِ حسین نگاہی خوش آمدی
گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے عالم تمام رحمتِ پروردگار ہے
ہنگامۂ حیات سے خاموش ہے فضا مستیٔ جاں سے میکدہ بردوش ہے فضا
آشفتگیٔ فکر و تماشا یہاں نہیں اک نور منتظر ہے زمیں آسماں نہیں
ہر موجۂ نسیم میں ہیں خوشگواریاں ہر پردۂ نگاہ میں ہیں یادگاریاں
پرواز میں طیور کے طوفان زندگی ہر برگ گل کی چھاؤں گلستان زندگی
یاں غور مطمئن ہے یہاں فکر پُر سکوں ہر جنبش خیال محبت کا ارغنوں
شہرت کی دھوپ سایہ مٹاتی نہیں کبھی گرمی غلط نگاہ کی چھاتی نہیں کبھی
خوش ہوں کہ تیری روح میں اک ارتعاش ہے خوش ہوں کہ تجھ میں جرأت فکر و تلاش ہے
یاں آکے اپنے دل کی تمنا مٹائے گا خاموشیٔ حیات سے کچھ فیض پائے گا!

(شاعر کی روح پرندے کا یہ گیت سن کر محو ہو جاتی ہے پھر کہتی ہے)

شاعر مستقبل۔ اے مطرب خیال ابھی نغمہ سنائے جا — اس منزل سکوں کا ابھی گیت گائے جا

(طائر پھر نغمہ سرا ہوتا ہے)

پرندہ۔ منزل گہ سکون کی تمنا خدا گواہ — تسکین آرزو کا تقاضا خدا گواہ

اک زندگی ہے دولت کون و مکان ہے — اک جنت خیال ہے جنت آسمان ہے

اس سرزمین پاک کے نزدیک کے دیکھ — یہ خاک بے نیاز جبیں سے لگا کے دیکھ

یاں کھلکھلیاں ہیں جلوۂ حسن و جمال کی — چمن چمن کے گرد ہیں شمعیں خیال کی

(یہ گا کر پرندہ اڑ جاتا ہے۔ شاعر کچھ سوچ کر خانقاہ میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں ایک درویش کتابوں کا انبار لگائے ہوئے کچھ کہہ رہا ہے روح شاعر اجازت مانگ کے یوں گویا ہوتی ہے)

شاعر مستقبل اے رہنمائے فکر و نظر خضر بے نیاز — جس کی نگاہ پاک پہ ظاہر دلوں کا راز

اک بے قرار زیست ہوں آشفتہ نگاہ — کرتا ہوں فکر شعر کا ہر سانس میں گناہ

اقبال کے کلام سے مجھ کو نیاز ہے — اقبال میری زیست، مرا فخر و ناز ہے

کرتا ہوں اس کے ساتھ تماشائے زندگی — پاتا ہوں اس میں اپنی تمنائے زندگی

لیکن بہت عمیق یہ بحر خیال ہے — مجھ سے بہت بلند یہ اوج کمال ہے

آتا نہیں ہے فہم میں اس زور کا کلام — سمجھائیے مجھے مرے اقبال کا پیام!

(درویش کچھ تبسم کرکے اور تھوڑی سی فکر کے ساتھ عینک کتاب پر رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقبال کے پیام سے پہلے انہیں ایک نصیحت کرنی ہے)

مفکر درویش۔ سن پہلے کہ آیا ہے تجھے بزم جہاں میں — کر غور کہ تاثیر ہے کچھ تیری زباں میں

نزدیک ہے آزاد خیالی کا زمانہ — بن جائے گی یہ بزم جہاں غم کا فسانہ

تو ہو نہ کبھی بادہ کش محفل اغیار — برباد نہ کر دہر میں آزادی افکار

آفت ہے دل و جاں کیلئے دہر کا جادو — اک آگ ہے انساں کے لئے دہر کا جادو

عظمت کے کلام میں بہ جا کہ ہے ادا — ہیہات پرائی ہی کے جاتا ہے انساں

پھیلا ہے تیرے سامنے مستقبل خاموش   وا ہیں دل و جاں کیلئے وقت کی آغوش
ہوگا تیرے ہاتھوں میں زمانے کا تخیل   آئے گا ترے سامنے قوموں کا تجاہل
عظمت کی مے ناب سے بھر ساغر الہام   ہے شاعر عالی سے دل پاک کا انعام
اس میں مگر آزادی فطرت نہ بہا دے   کو نین کو اپنا کوئی پیغام سنا دے

شاعر مستقبل۔ اپنی کمزوری تعلیم کو پہچان گیا   واہ کیا بات بتائی ہے کہ دل مان گیا

(مفکر درویش پھر کہتے ہیں)

اے نوجوانِ شوق ترے درد کے نثار   اقبال کے پیام کا اب کر نہ انتظار
کھول آنکھ اور دیکھ نگاہ نیاز سے   آتے ہیں کون کون حریم مجاز سے؟

(شاعر مستقبل دیکھتا ہے کہ چار خوبصورت پیکر جن کے چہروں پر آسمانی تجلیاں برس رہی ہیں زرنگار تاج پہنے ہوئے داہنے ہاتھوں میں ستاروں کی شمعیں لئے اور اپنے بائیں ہاتھ ایک دوسرے سے ملائے ہوئے رقص کناں آ رہے ہیں۔ ان پیکروں کے تاجوں پر سنہری حروف میں "عشق" "یقین" "خودی" اور "عمل" لکھا ہوا ہے۔ جلوس یہ ترانہ گاتے ہوئے گذرتا ہے)

عشق۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
خودی۔ قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر   چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
یقیں۔ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم   مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
عمل۔ تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا   ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
سب مل کر۔ اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا   کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

(درویش کہتے ہیں)

مفکر درویش۔ اس گوشۂ تاریک میں ہم اہل نظر ہیں   اک مشعل رہ، روشنی راہ گذر ہیں
سمجھاتے نہیں آنکھوں دکھاتے ہیں مسائل   رہتے نہیں الفاظ یہاں دید کے حائل
اقبال کے پیغام کے یہ چار عناصر   احساس پہ تیرے ہوئے اس شان سے ظاہر

بالِ جبریل ص [illegible]

اللہ کرے دل ہو ترا ان کا پرستار
اللہ کرے ان کا ہو نزدیک سے دیدار

(صدائے الہام آتی ہے)

عشق و خودی یقین و عمل چار عکس ہیں
یہ ایک آئینہ ہیں تری جلوہ گاہ میں

ان چار موتیوں کو پرو ایک ہی جگہ
اک رشتۂ خیال ہو تیری نگاہ میں

شاعرِ مستقبل۔ قربان اس نگاہ کے جس نے بہ یک نگاہ
اقبال کے پیام کو آنکھوں دکھا دیا

کوندائیں بجلیاں مرے وہم و گمان پر
گویا مرے خیال کو عارف بنا دیا

(پھر یوں دعا کرتا ہے)

رواقِ فلک پر کھلی ہیں نگاہیں
نظر آ رہی ہیں تری بارگاہیں

الٰہی مجھے ذوقِ فکر و عمل دے
الٰہی مجھے قوتِ بال و پر دے

سرافراز ہے انقلابِ زمانہ
تلاطم میں ہے زندگی کا فسانہ

ملے مجھ کو اس بزم میں راست راہی
تجلی سے پیدا ہو روشن نگاہی

میں جذباتِ عالم کو رستہ دکھاؤں
نظر کی طرح ساری دنیا پہ چھاؤں

مرے دل پہ روشن ہو پیغامِ شاعر
دل و جاں رہیں آسماں کے مسافر

ہو جوشِ محبت مری رہنمائی
مرے دل پہ چھا جائے رنگِ خدائی!

(باقی آئندہ)

عبدالقیوم خاں صاحب باقی

علامہ اقبال کا فلسفہ

(جوہر صاحب نے اس مضمون میں علامہ اقبال کے فلسفہ کو ان کی تقاریر سے اخذ کرکے اور ان کے کلام سے ان کی تشریح کرکے واضح کرنے کی کوشش کی ہے ضمناً وہ ابہام بھی ظاہر کیا ہے جو دل اور عقل کے مقامات پیش کرنے میں علامہ کی تقریروں میں پیدا ہو گیا ہے، تن کی دنیا، اور من کی دنیا، کی کشمکش کو بھی واضح کیا ہے۔ علامہ اقبال من کی دنیا کے قائل ہیں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تمام صوفیا من کی دنیا کے قائل رہے ہیں لیکن علامہ تصوف کے خلاف ہیں کیونکہ یہ خودی کو فنا کی طرف لے جاتا ہے، حقیقت کو منفی طور سے حاصل کرنے کی بجائے وہ مثبت طریقے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنی خودی کو طاقتور بنا کر لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ علامہ عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں لیکن عشق کا جذبہ اگر بغیر عقل کے ہو تو وہ فنا کی طرف لے جاتا ہے عشق کی انتہا خود کو دوسرے میں محسوس کرنا ہے لیکن اس انتہا تک پہونچنے کے یہ معنی ہیں کہ فرد اپنی خودی سے ہاتھ دھو بیٹھے اس طور پر خودی اور عشق خود متضاد چیزیں ٹھہریں۔ خودی کی ترقی کیلئے عقل و عمل کی زیادہ ضرورت ہے بہ نسبت عشق کے، کہتے ہیں کہ عشق کا جذبہ عمل کی طرف راغب کرتا ہے لیکن خودتعمیری اور خودی کو ترقی کرنے کا جذبہ بھی عمل اور تڑپ کی طرف مائل کرتا ہے عشق دوسروں کی تعمیر میں خود کو فنا کر دینے پر مائل کرتا ہے خودتعمیری کا جذبہ اپنی اور دوسروں دونوں کی تعمیر کی طرف راغب کرتا ہے بغیر خود کو فنا کئے یہیں علامہ کے بیان میں ابہام پیدا ہو گیا ہے ایک طرف وہ صوفیوں کے عشق کو سراہتے ہیں دوسری طرف وہ خودتعمیری کے جذبہ کو ابھارتے ہیں کہ خود کو بھی خدا میں جذب کرنا نہیں چاہتے بلکہ یزداں گیری کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

عشق، دل، من کی دنیا، روح اور ضمیر کا کرب و اضطراب جب سکون پذیر ہوتا ہے تب کچھ اصول بنا لیتا ہے تاکہ من کی دنیا مطمئن رہے۔ غارِ حرا اور وحی کے نزول نے اسی من کی دنیا، کی خاطر بنیادی اصول مقرر کر دئے تاکہ امت انسانی مزید کشمکش میں نہ پڑے اس لئے اب من کی دنیا کا ذکر کرنا ہی عبث ہے اگر ان اصولوں کی پابندی کی جائے۔ اب اگر فکر کی جائے تو تن کی دنیا، کی کیونکہ یہی ہماری زندگی ہے اور ساتھ ساتھ بنیادی اسلامی اصولوں کی۔ من کی دنیا یا عشق یا تصوف میں پڑنا ایک سعی لاحاصل ہے۔

چنانچہ اس مضمون میں انہی باتوں کی طرف جوہر صاحب نے اشارہ کیا ہے اگر کوئی صاحب اس موضوع پر کچھ اور لکھنا چاہیں تو شکریہ کے ساتھ ہم اسے قبول کریں گے)

(مدیر)

اختر:۔ آداب عرض یوسف صاحب! کیا مطالعہ ہو رہا ہے؟

یوسف:۔ آئیے اختر صاحب! علامہ اقبال کے لکچر کتابی شکل میں نکل آئے ہیں انہیں دیکھ رہا ہوں۔

اختر:۔ خوب کیا کچھ ادق کتاب ہے۔ پہلا باب کس موضوع پر ہے۔

یوسف:۔ وہی موضوع جس سے مرحوم کی شاعری پُر ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے چراغ رہ گذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغ رہ گذر کو کیا خبر ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اختر:۔ جی ہاں۔ یہ امام غزالی کا فلسفہ ہے۔ ضرب کلیم میں علامہ نے امام صاحب کا فلسفہ اس طرح بیان کیا ہے

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن — عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرم کتابی نہ بن — عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

یوسف:۔ پہلے لکچر کا موضوع بھی یہی ہے کہ کیا حقیقت کو صرف عقل سے سمجھ سکتے ہیں؟ علامہ کا خیال ہے کہ خدا یعنی حقیقت کو عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس کا صرف تجربہ کر سکتے ہیں اور وہ تجربہ بھی عقل سے نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لئے وجدان یعنی عشق یا نظر کی ضرورت ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات — علم مقام صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات — علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

علامہ کے نزدیک خرد سے تو حقیقت کو جزوی طور پر سمجھا جاتا ہے لیکن دل یا عشق یا نظر سے کل حقیقت کا مجموعی طور پر احساس یا تجربہ کیا جاتا ہے۔ خرد حقیقت کو سمجھنے کے لئے ناکمل ہے لکھتے ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اُس کی تقدیر میں حضور نہیں

علامہ کے نزدیک خرد و نظر ایک ہی شے کے دو رُخ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ممد و مددگار ہیں۔ علامہ برگسان کے اس خیال سے متفق ہیں کہ عشق یا نظر یعنی وجدان بھی اعلیٰ قسم کی خرد ہوتی ہے۔

اختر:۔ میں کچھ سمجھا نہیں یوسف صاحب!

یوسف۔ آپ کیا نہیں سمجھے۔ برادر یہ وہی خیال ہے جس کا علامہ بار بار اظہار کرتے ہیں بال جبریل میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں — ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اور ایک جگہ کہتے ہیں ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں — راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

اختر۔ یوسف صاحب! میں خرد اور نظر کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں اگر خرد اور نظر میں وہی فرق ہے جو عقل اور تیز عقل میں ہوتا ہے تو یہ کہہ دینا کافی ہے کہ حقیقت زیادہ غور و فکر کرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔ اس شکل میں حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نئی شے ایجاد کرنے کی ضرورت ہے جس کو علامہ نے کبھی دل کبھی عشق کبھی نظر کہا ہے۔ نہ صرف یہی کہ علامہ عشق و نظر کے قائل ہیں بلکہ عقل کو باغی اور کم مایہ خیال کرتے ہیں کبھی فرماتے ہیں ؎

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق — کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

کبھی فرماتے ہیں ؎

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور — ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

جیسا ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے علامہ کے نزدیک نظر اور خرد کی نوعیت میں فرق ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق نظر کو تیز عقل کہنا غلطی ہوگی۔

یوسف۔ علامہ فرماتے ہیں کہ نظر سے حقیقت کے اس پہلو کا شعور ہوتا ہے جس کو خرد سے نہیں سمجھ سکتے۔ علامہ کے نزدیک دل بھی مشاہدہ کرتا ہے اور اگر اس مشاہدہ کی درست ترجمانی کے بعد عمل کیا جائے تو انسان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ بزرگان دین کی سوانح کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کے مشاہدات اسی طرح حقیقی تجربہ ہوتے ہیں جس طرح خرد کے تجربات۔ البتہ دل کے مشاہدات کو تحلیل کر کے نہیں بتا سکتے ؎

معجزۂ اہلِ فکر فلسفۂ پیچ پیچ — معجزۂ اہلِ ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اختر۔ کیا علامہ کا یہ خیال ہے کہ تجربہ دو طرح ہوتا ہے ایک دل سے اور دوسرا دماغ سے اور یہ دل ہی ہے جو بیک وقت کل حقیقت کا تجربہ کر سکتا ہے؟

یوسف۔ علامہ کا یہ خیال ہے کہ دل کی نظر سے حقیقت کو دیکھنے اور تجربہ کرنے سے انسان کو وہ الہامات ہوتے ہیں جن سے خرد بے بہرہ ہے۔ آپ خرد کے ذریعہ سے مجموعی حقیقت کا دیدار نہیں کر سکتے لیکن دل بسا اوقات دھوکا کھا بھی جاتا ہے اور غیر حقیقت کو حقیقت اور غیر حقیقت کے پیغام کو حقیقت کا پیغام یعنی وحی و الہام سمجھنے لگتا ہے ہاں بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دل حقیقت کے پیغام کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا اور اس وجہ سے غلط راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ دماغ صرف جزوی حقیقت معلوم کر سکتا ہے اور جزوی اور مجموعی حقیقت میں وہی فرق ہے جو باجے کے ایک سر اور ایک راگ میں ہوتا ہے۔ راگ اگرچہ سروں کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن وہ اثر اور نوعیت میں کسی ایک سر سے مختلف ہوتا ہے بعینہٖ مجموعی حقیقت جزوی حقیقت سے اثر اور نوعیت میں جدا ہوتی ہے

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی ۔۔۔ نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اختر۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ درست علم حاصل کرنے کے لئے عشق پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

یوسف۔ جی ہاں۔ علامہ نے یہ لکھا ہے کہ نبیوں اور پیغمبروں کے لئے بھی شیطان کی پیش کردہ حقیقت اور پیغام اور اصل حقیقت اور پیغام میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ علامہ نے اس خیال کی تائید میں کلام مجید کی ایک آیت بھی پیش کی ہے۔

ترجمہ: تم سے قبل بھی ہم نے رسول اور پیغمبر بھیجے جن کی خواہشات میں شیطان نے غلط خواہش داخل کر دی لیکن خدا شیطان کے چاہنے کو پورا نہیں ہونے دے گا۔

بال جبریل میں سالک راہ کو اس طرح خبردار کرتے ہیں ؎

دل ہمہ غلام خسر دیا کہ امام خرد ۔۔۔ سالک راہ ہوشیار سخت ہے یہ مرحلہ

اختر۔ تب تو یوسف صاحب اول بنیا بھی خرد چالاک کی طرح ہو گیا غلطی کا امکان دونوں جگہ ہے خرد بھی غلطی کر سکتی ہے اور نظر بھی۔

یوسف۔ نظر بھی غلطی کر سکتی ہے لیکن خرد تو صرف جزوی حقیقت دیکھ سکتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس　　　بیا کہ عشق کمالے ز یک فنے دارد

اختر۔ لیکن یوسف صاحب یہ تو فرمائیے کہ جب آپ نے دل کا غلطی کرنا تسلیم کر لیا تو یہ معلوم کرنے کا کیا معیار رہا کہ دل کا فلاں مشاہدہ حقیقت کا مشاہدہ تھا یا غیر حقیقت کا۔ پھر علامہ ایک اور بات بھی فرماتے ہیں کہ بعض دل مشاہدات کی درست ترجمانی نہیں کر سکتا اس شکل میں یہ کس طرح فیصلہ ہوگا کہ دل مشاہدہ کی درست ترجمانی کر رہا ہے یا غلط۔

یوسف۔ اختر صاحب علامہ نے دو معیار بھی بیان فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا لکچر ان معیاروں کی بحث ہے۔ علامہ نے دو معیار مقرر کئے ہیں۔ ایک عقلی دوسرا افادی۔ عقلی معیار سے یہ مراد ہے کہ حقیقت وہ ہے جس کی نوعیت کو عقل قبول کر لے۔ افادی معیار یہ ہے کہ انھیں پیغامات کو حقیقی سمجھنا چاہئے جن پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے برآمد ہوں۔

اختر۔ یوسف صاحب! علامہ نے یہ معیار قائم کر کے اپنے دل بینا کے نظریہ کی تردید کر دی۔ علامہ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ عقل کے ذریعہ سے نہ مجموعی حقیقت کا شعور کر سکتے ہیں اور نہ اس کے پیغامات سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف بے چاری عقل پر حقیقت اور غیر حقیقت میں تمیز کرنے کا بار ڈالتے ہیں اگر علامہ کے نزدیک عقل میں یہ اہلیت ہے کہ وہ حقیقت اور اس کے پیغامات اور غیر حقیقت اور اس کے پیغامات میں تمیز کر سکے اور ان کو جانچ سکے تو گویا علامہ نے یہ تسلیم کر لیا کہ عقل چالاک دل بینا سے کہیں زیادہ بیدار ہے کہ وہ دل کی محسوس کردہ حقیقت اور پیغام کو پرکھتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ افادی معیار بھی عقلی معیار ہے عقل تو اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ حقیقت کے کسی خاص پیغام پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے نکل رہے ہیں یا برے۔

یوسف۔ اختر صاحب آپ کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اگر نظر یا دل بھی غلطی کر سکتا ہے تو دل کو دماغ سے الگ علم حاصل کرنے کا ذریعہ مان لینے سے مشکل حل نہیں ہوتی۔

اختر۔ یوسف صاحب میرے خیال میں عقل میں ہر حقیقت سمجھنے کی اہلیت ہے۔ صرف فکر و جستجو درکار ہے۔

حقیقت کے جن پہلوؤں کو ہم فی الحال نہ سمجھ سکیں ان کی طرف ہمارا غیر جانبدارانہ رویہ ہونا چاہئے نہ ان کا انکار اور نہ اقرار کرنا چاہئے مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ چونکہ کاملین کے بہت سے بنیادی تخیلات عقل میں نہیں آتے لیکن ان پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے ان مفکرین کو جنہوں نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے ضرورت ہوتی ہے کہ مذہبی تخیلات کو درست ثابت کرنے کے لئے عقل کو معذور اور دل کو روشن بتائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیں کہ دل جو علم حاصل کرتا ہے وہ عقل کے احاطے میں نہیں آسکتا۔ علامہ پہلے تو فرماتے ہیں کہ دل ہی حقیقت آشنا ہو سکتا ہے عقل انسانی مجموعی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ پھر یہ فرماتے ہیں کہ دل حقیقت کا تجربہ تو کرتا ہے لیکن بعض مرتبہ اس کو مشابہ لگ جاتا ہے اور وہ غیر حقیقت کو حقیقت تصور کرنے لگتا ہے۔ یہاں عقل اس کی مدد کرتی ہے اور تجربہ کی صحت اور غیر صحت کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب عقل دل کے تجربات کے حقیقی و غیر حقیقی ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے تو وہ خود اس حقیقت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے۔

یوسف صاحب اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو یہ عرض کر دوں کہ دل بینا کے فلسفہ نے دنیا کو عام طور پر اور ایشیا کو خاص طور پر جتنا نقصان پہونچایا ہے شاید ہی کسی دوسرے فلسفہ نے پہونچایا ہو۔ دل کو عقل پر ترجیح دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مشرق نے عقل کو معطل قرار دے دیا جس کی وجہ سے فکری اضمحلال پیدا ہوگیا اور بجائے زندگی میں جدوجہد کرنے اور عقل سے کام لے کر قدرت کی طاقتوں پر قابو پانے اور ان کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے استعمال کرنے کے ایشیا والے مراقبہ، تصوف اور علم باطن کے پیچھے پڑ گئے جس کے نتائج ہماری غلامی کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

یوسف۔ لیکن اختر صاحب علامہ کے فلسفہ میں عقل کے لئے بھی کافی میدان ہے عقلی جدوجہد کو کسی نے منع نہیں کیا بلکہ اس سے بھی جزوی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ جس قسم کے تصوف کے آپ خلاف ہیں علامہ بھی اس سے خوش نہیں ہیں۔ علامہ کے نزدیک وہ مراقبہ، تصوف اور علم باطن باطل ہے جس سے عمل پیدا نہ ہو۔ شاعر مشرق کے نزدیک مراقبہ وغیرہ سے انسان میں جرأت عمل پیدا ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ ریاضت بیکار ہے۔ اختر صاحب جہاں تک میں سمجھا ہوں علامہ نے خود دمشق میں تمیز صرف اس بنا پر

کی ہے کہ خود انسان کو عمل پر مجبور نہیں کرتی۔ اکثر صاحب دماغ بے عمل ہوتے ہیں یہ عشق کا کام ہے کہ وہ انسان کو عمل پر مجبور کرتا ہے

لا کھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

علامہ ضرب کلیم میں تصوف کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

پہ سکوتِ لا مکانی یہ مسلم لا ہوتی | حرم کے درد کے درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور | تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی اقبال کی اصطلاح میں انفرادیت کا نام ہے جو انسان کے اپنے ماحول پر عمل کرنے سے مستحکم ہوتی ہے۔ توحید کے عنوان سے علامہ فرماتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی | آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو | خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ | وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

خرد اگر عمل بھی پیدا کرتی ہے تو اس کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف خرد کے تابع ہو کر عمل کرنے کا نتیجہ ہے اگر عشق کے تابع ہو کر عمل کیا جائے تو اس سے بہت اچھے نتیجے برآمد ہوں۔ خرد کو عشق کے تابع رکھ کر عمل کرنا چاہیے۔

اختصار۔ حسن اتفاق سے ایسی دنیا میں یورپ اور امریکہ موجود ہیں جہاں کے انسان بلا دل و عشق کی مدد کے صاحب عمل ہیں۔ دل نہیں بلکہ خرد ان کے تمام تر عمل کی محرک ہے۔ ان کی خرد نے آپ کی دل کی دنیا کی تحلیل کر کے رکھ دی۔ اس حقیقت کے سامنے آپ کا دل کا فلسفہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ دل بینا کا فلسفہ اپاہج کا فلسفہ ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ جب یہ مان لیا کہ کل حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرنے کا طریقہ عقل سے جدا ہے اور انسان کا مقصد حیات حقیقت کا مجموعی دیدار ہے جس سے زندہ و پائندہ علم حاصل ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کل حقیقت کا دیدار اور زندہ و پائندہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور حقیقت کا دیدار ایک دو روز کے مراقبہ سے تو ہو نہیں سکتا اس کے لئے عمر درکار ہے

جس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان تمام عمر ریاضت اور مراقبے میں گزار دے۔ یوسف صاحب! ایشیا کی غلامی اسی عشق و نظر کے فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ یورپ کی زندگی اور ترقی سے متاثر ہو کر اقبال اس پر تو مجبور ہو گئے کہ ذوقِ کردار کا پیام دیں لیکن اس کے ساتھ انھوں نے عشق و نظر کا نظریہ پیش کر کے ایسا کیا جیسے کسی کے ہاتھ کاٹ کر اس کو عمل کی تلقین کی جائے۔ مسلمانوں میں عشق و نظر کا افیونی فلسفہ اتنا سرایت کر گیا ہے کہ اب ان کو افیونی فلسفہ کی خوشبو بھی پینک میں لانے کے لئے کافی ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ علامہ ہی کی ہستی تھی کہ جس نے وقتی تقاضہ کو سمجھا اور اردو شاعری کو نیا رنگ دیا اور گل و بلبل اور خط و خال سے ہٹ کر عمل کا پیام دیا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ علامہ نے دل کی دنیا کا راگ الاپ کر اپنے پیام کو کالعدم کر دیا۔

ع۔ اختر صاحب یہ تو آپ درست فرماتے ہیں کہ باطن کی کشاد اور مراقبے کے ذریعہ سے حقیقت کی جستجو کی آڑ لے کر ایشیا اپاہج بن گیا۔ مشرق من کی دنیا میں پھنس گیا اور تن کی دنیا سے اتنا بے نیاز ہوا کہ ایک عرصہ سے یورپ کا غلام ہے لیکن اختر صاحب جیسا میں عرض کر چکا ہوں علامہ اس قسم کے تصوف سے بہت بیزار ہیں اور اس کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں :۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

ا۔ یوسف صاحب یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ اقبال کے فلسفہ میں کردار پر ازحد زور دیا گیا ہے لیکن علامہ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ خرد کے علاوہ عشق و نظر کو مانتے ہیں اور ان کو جوش کردار پیدا کرنے کا سبب بتاتے ہیں۔ عشق و نظر کے فلسفہ پر کسی تمدن کی بنیاد رکھ کر افراد کو کردار کا پیام دینا ایسا ہے جیسے پیاسے آدمی کا گلا دبا کر اس کو پانی پلانے کی کوشش کرنا۔ یورپ اس فلسفہ کی مجسم تردید ہے یوسف صاحب میں تو ایشیا کے زوال کا یہی سبب سمجھتا ہوں کہ ایشیا والوں نے فکر و جستجو سے کنارہ کیا اور عقل سے بیگانہ ہو کر اپنے آپ کو معجزات کے سمندر میں ڈال دیا جہاں توہمات کی مچھلیوں نے

انہیں ہڑپ کر لیا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ایشیا کو صاحب جذب و سوز و مستی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صاحب عقل کی ہے جو جستجو و تجربہ سے کام لے کر حقیقت کو پہچانے۔ علامہ اگرچہ دنیا کو پیام عمل دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تلقین بھی جاری ہے۔

من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق — تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ جب آتی ہے تو جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

ایشیا والوں کی ساری عمر من کی دولت حاصل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے اور تن کی دولت اغیار کے حصہ میں آتی ہے اور لطف یہ ہے کہ تن کی دنیا میں آلودہ رہنے والے من کی دنیا میں غرق رہنے والوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

یوسف صاحب آپ کو یہ تو علم ہوگا کہ علامہ رہبانیت اور خانقاہی کے بہت خلاف ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر — کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

علامہ ہر بات میں کچھ مذبذب معلوم ہوتے ہیں

یوسف ساختر صاحب۔ دراصل ایشیا والوں کی تباہی اس لئے ہوئی کہ مولانا روم نے من کی دنیا میں رہنے والوں اور دل بینا کے دعویداروں کے لئے جو کسوٹی بتائی تھی جس کے علامہ بھی قائل ہیں۔ اس کسوٹی کو ہم نے فراموش کر دیا ہے

اختر — وہ کسوٹی کیا ہے؟

یوسف — آں کہ بر افلاک رفتارش بود — بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

مولانا فرماتے ہیں کہ جو افلاک پر چل سکتا ہے اس کے لئے زمین پر چلنا کیا مشکل ہے جب ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں شخص واقعی بزرگ یعنی حقیقت آشنا ہے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی دنیاوی حالت کیسی ہے۔ باطن کی تلاش کا یہی طریق ہے جو ظاہر کو اپنے تابع کر چکا ہو۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے — بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

ایشیا میں اب تک یہ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ جب دنیا کے طمانچے نہ سہہ سکے تو تارک الدنیا ہو کر مراقبہ کرنے لگے۔ جو تن کی دنیا پر قابو نہ پا سکا وہ من کی دنیا میں کیا کر سکتا ہے۔ مجھے علامہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں ۔۔۔ بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور ۔۔۔ کہ معرکے ہیں شریعت کے دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی ۔۔۔ اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

اختر۔ خیر آپ نے یہ تو مانا کہ پہلی حقیقت تن کی دنیا ہے اور من کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے مادی دنیا کو مسخر کرنا ضروری ہے معاف کیجئے گا میں من کی دنیا کے فلسفہ ہی کو ایشیا کی تباہ حالی کا باعث خیال کرتا ہوں یورپ والے بلا جذب و شوق و عشق و مستی اور من کی دنیا کے پیچھے پڑے ہر اعتبار سے ہم سے بہت بہتر ہیں۔

یوسف۔ اختر صاحب یورپ میں جو کشت و خون ہو رہا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یورپ کی نظر صرف تن کی دنیا تک محدود ہے

شرق حق را دید عالم را نہ دید ۔۔۔ غرب در عالم خزید از حق رمید
چشم بر حق باز کردن بندگی است ۔۔۔ خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

اختر۔ یوسف صاحب یورپ کی نظر تن کی دنیا تک محدود سہی لیکن وہ ایشیا سے تو بہتر ہے جس کی نظر خلا میں دیکھتی ہے۔ مشرق کو ترقی کرنے کے لئے دونوں دنیائیں فتح کرنی ہوں گی لیکن یورپ نے تن کی دنیا فتح کر لی ہے اور علم نفسیات کے ذریعہ سے من کی دنیا بھی قریب نصف کے فتح کر لی ہے رہا یورپ کا کشت و خون تو وہ تباہی نہیں ہے

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے ۔۔۔ جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

جس طرح بچہ پیدا ہوتے وقت ماں کو درد و کرب برداشت کرنا پڑتا ہے اسی طرح جب جہان کہنہ کے بطن سے جہان نو پیدا ہوتا ہے تو تمام دنیا میں تشنج پیدا ہوتا ہے یہ جنگ وہی تشنج ہے جس کو آپ تباہی و بربادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یوسف۔ عصر حاضر با خرد زنجیر پاست ۔۔۔ جان بے تابے کہ من دارم کجاست

اختر۔ مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں انھیں ۔۔۔ پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں انھیں

[illegible]

جدید تعلیمی نظریہ

تعلیم کی تعریف | تعلیم کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں لیکن اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کے بالغ ممبروں کی سعی اور جد وجہد ہے جس سے آنے والی نسلوں کی نشو ونما اور تشکیل، زندگی کے نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔ یہ سچ ہے کہ اکثر تعلیم کا لفظ اس سے وسیع معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جان اسٹوارٹ مل نے تعلیم کے دائرہ میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا ہے جو" نوع انسانی کے تعمیر میں مدد ومعاون ہوتی ہیں" اور شاعرانہ حیثیت سے ہم تمام بنی نوع انسان کی تعلیم بھی مراد لیتے ہیں لیکن یہ تمام استعمالات خطیبانہ ہیں جو حماسیانہ خیالات پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں ذاتی ہدایت اور تربیت ایک ضروری عنصر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیمی اسکیمیں تمام تر پڑھے لکھے لوگوں کے تجربات سے بنائی جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمام تجربات (بچے کے لئے) سبق آموز ہوتے ہیں۔ آیا ایک تجربہ ایک فرد (یعنی بچہ) کی تعلیم کا جزو ہے یا نہیں؟ اس کا جواب اس وقت دیا جا سکتا ہے جب ہم یہ معلوم کر لیں کہ تعلیم کا طریقہ ان لوگوں نے مرتب کیا تھا جن کی آغوش تربیت میں پلا تھا اور وہ اسی کا تجربہ تھا اگر وہ بچہ کا تجربہ تھا تو تعلیم کا جزو ہوگا ورنہ نہیں) اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم خواہ اچھی ہو یا بری، اس کی اچھائی یا برائی کا انحصار معلم کی حسن سیرت، دانائی اور ذکاوت پر ہوگا۔ وہ اچھی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب اس سے صحیح نتیجہ نکلے اور اس کیلئے جو ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں وہ اس قدر موزوں ومناسب ہوں کہ ان سے مطلوبہ نتیجہ حاصل ہو سکے۔ نیز وہ عقلمندی ایک رنگی اور ثابت قدمی سے کام میں لائے جا سکیں۔

یوں تعلیم معین طور پر ایک انفرادی فعل ہے اور ہر سوسائٹی میں اس کی وسیع تاثیر اور وقعت کے درمیان اختلاف ہوگا۔ کیونکہ تمام زمانوں اور تمام مقامات میں ان لوگوں کی فضیلت، دانائی اور صلاحیت کے متعلق اختلافات ہیں جن کے ہاتھوں میں بچوں کی ذمہ داری اور نشو ونما ہے۔ تاہم باوجود ان اختلافات کے ہر معلم اپنے عہد اور ملک کے رائج تصور اور نظریہ کو کم وبیش مکمل اور واضح طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس بنا پر کامیاب تعلیمی جد وجہد کیلئے پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ قوم کو بہ حیثیت مجموعی تعلیم کی فطرت اور قیمت کا ٹھیک اندازہ کرنا چاہئے۔

ہر کیف اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک بیدار اور حساس قوم میں معلمین کا جو قوم کی حاجتوں کو پورا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں پیلے کرنا بہت ہی عام اصطلاحات کے سوا ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کس طرح دیں کیونکہ جب ہم ان افراد پر نظر ڈالتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو افلاطون سے متفق ہونا چاہئے کہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ افراد کے جسم و روح میں ان تمام خوبیوں اور کمالات کی نشو و نما ہو جن کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ اس سے ان خوبیوں اور کمالات کی فطرت سامنے نہیں آتی اور ان نقطہ ہائے نظر پر کبھی عالمگیر اتفاق نہ ہو سکا بلکہ ہر عہد میں اندازے کے بیّن اختلاف رہے ہیں۔ انفرادی حسن و کمال کا مظہر حقیقی زندگی اور صرف حقیقی زندگی ہے۔ اور ایسی زندگی زمان و مکان، تہذیب و تمدن، قومی جذبات اور مادی حالات پر دسترس کے معین حالات میں بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے افلاطونی عہد کے ایتھنز کا کمال زندگی، موجودہ لندن، پیرس اور نیویارک سے بہت مختلف تھا۔ لہذا جہاں تک کوئی تصور تعلیم عملی طریقے کی رہبری کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرہ کی حالت ترقی اور تعلیم میں ہر لحاظ سے تعلق ہو جس میں وہ دی جاتی ہے۔

تعلیم اور قوم ایک لحاظ سے قوم کے آئین اور عام نظریہ کا اس کی تعلیمی سیرت پر خاص اثر ہوتا ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کی زندگی کے تحفظ و تکمیل میں سرگرم رہے لیکن وہ زندگی انفرادی ممبروں کی زندگی سے وابستہ ہے۔ ایک مثالی قوم میں انفرادی اور اجتماعی اغراض و مقاصد کی مماثلت ہونی چاہئے لیکن تاریخ مثالی اقوام کے وجود پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی اور اس کے حالات کے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل سادہ ہیں۔ عملاً اختلافات کا دور دورہ ہمیشہ رہا ہے جس کا نتیجہ کہیں جلب منفعت اور کہیں انسداد ترقی ہوا ہے۔ مختلف زمان و مکان میں معاشروں کا باہم اختلاف رہا ہے۔ ہر ایک کی دلچسپیوں اور انفرادی ترقی کے دعووں میں مصالحت یا موخر کو مقدم کا تابع بنانے میں سوسائٹیوں کی رغبت بڑی حد تک کامیاب ہوتی ہے، اور ان کے تعلیمی تصورات میں اختلافات کی جھلک فطرتاً نمایاں ہوتی ہے۔ اقوام کا ابتدائی رجحان افراد کی شخصیت کو کمل طور سے تابع بنانا ہے لیکن مغربی قبائل میں عیسائیت کی آمد کے وقت سے، انفرادی زندگی کی اہمیت بڑھ جانے کے سبب اس رجحان کو روکا گیا اور بطیت بنا کر منعطف کیا گیا۔ ذہنی طور پر متناقض لیکن واضح واقعہ ہے کہ جنگ عظیم (١٩١٤ء تا ١٩١٨ء) نے اپنی بہت وسیع صنعت کے حیرت انگیز کھلم کھلا مظاہرے سے گھرے، قرب سے اور جدید اجتماعی تنظیم کے وسیع ایجاد

نے واقعتاً قدیم رجحان کے خلاف ردِ عمل پیدا کیا۔ اور تعلیمی خیالات میں اس کو ظاہر کیا۔ تعلیمی نظریہ کو ہمیشہ کم و بیش مرکزیت طفل پر مبنی ہونا چاہئے یعنی پہلے ایک ہی بچہ پر ساری توجہ منعطف کرنی چاہئے اور ان فطری صلاحیتوں اور خلقی قوتوں کو جو اس کو تعلیم یافتہ بناتی ہیں مرکز توجہ بنانا چاہئے۔ لیکن موجودہ میلان اس سے بہت آگے بڑھ گیا ہے اس کی رو سے فرد کی تکمیل تعلیمی جدوجہد کی علت غائی ہے۔ اس میں اجتماعی مطالبات سے بے پروائی شامل نہیں ہے اور نہ اس سے معاشرتی انتشار ہی مراد ہے بلکہ نقطہ نظر یہ ہے کہ قومی زندگی کی بہترین تشکیل ایسی تعلیم سے ہوگی جس میں معاشرتی سرگرمیوں کو انفرادی زندگی کے اعلیٰ درجوں تک ترقی کرنے کا ایک ضروری واسطہ خیال کیا جائے۔ یہ بہتر ہے اس چیز کی بہ نسبت جس کے ماتحت انفرادی نشوونما کے مطالبات کو قرار دیا جائے۔ یہ تصور کم و بیش صاف طور پر محسوس ہو کر امریکہ، برطانیہ اور دیگر متمدن ممالک میں نشوونما کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتا رہا اور ۱۹۱۸ء کے بعد سے اس کی روشنی میں متمدن قوموں نے عملی ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔

نظریہ کے تغیر کی حیرت انگیز علامت ترقی کرنے والے ملکوں میں جمہوری تعلیم کی از سر نو تشکیل تک منتج ہوتی ہے۔ اس کی امتیازی صفت قدیم تصور کو مٹا کر جدید کو لانا ہے جس میں ابتدائی اور ثانوی مدارس، اہم معاشرتی طبقات سے مطابقت رکھیں۔ اس خیال سے ہر طبقے کے بچے ایسی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع پائیں جس میں طفلانہ ضروریات بہم پہونچانے کا سامان موجود ہو۔ نیز اس میں ثانوی تعلیم عنفوان شباب کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ابتدائی تعلیم کی عمارت اسی ستون پر قائم ہے۔ اس لئے وہاں جونیر اور سینیر ہائی اسکول موجود ہیں جو چھ چھ تین تین۔ اصول پر قائم ہیں۔ انگلستان میں ۱۹۲۶ء میں تعلیمی بورڈ کی کمیٹی نے عنفوان شباب کی تعلیمی رپورٹ اسی اصول پر شائع کی ہے۔ جرمن ریخ بھی ان تعلیمی تغیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک حد تک یہ ترقیاں اس لئے ہوئی ہیں کہ جدید صنعت و حرفت اور آئین حکومت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر اوسط درجہ کے شہری کا قدیم شہریوں سے زیادہ بلند معیار علم و تربیت ہونا چاہئے لیکن اس کی اصولی تشریح اس تصور میں موجود ہے۔

۱؎ امریکہ میں قدیم آٹھ سالہ نصاب تعلیم ختم کر دیا گیا ہے اور اب اس کے بجائے چھ سال کا ایک جدید نصاب تیار کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے تین سال تک جونیر ہائی اسکول کورس کی تعلیم ہوتی ہے جس میں بچوں کے حیاتیاتی، نفسیاتی اور سماجی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے اور تین سال کا سینیر ہائی اسکول کورس عنفوان شباب کیلئے مرتب کیا گیا ہے جس میں ان کی نفسیاتی ضروریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے

کہ ایک قوم کا فرض ہے کہ وہ ذاتی ترقی اور خود فہمی کے بہترین مواقع تمام افراد کی دسترس میں دیدے جو اُن سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

نصاب | ان اعتبارات سے نصاب تک خیال کا پہونچنا فطری بات ہے۔ بچوں اور بچیوں کو کیا پڑھنا چاہئے؟ اس کا صحیح جواب اُس اصول میں ہے جو مقصد تعلیم میں بیان کیا جاچکا ہے۔ اسکول کا یہ کام ہے کہ وہ ترقی زندگی اور خاندانی زندگی کے اثرات کی اصلاح کے ساتھ ساتھ بچوں پر ان روحانی قوتوں کا اثر ڈالے جو اس قوم یا جماعت کی خصوصیات میں سے ہو اور ان کو اس لئے تیار کرے کہ وہ قوم کی زندگی کی محافظت اور ترقی میں حصہ لے سکیں۔

اس کام کے انجام دینے میں اسکول کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک حقیقی معاشرہ ہو جس میں قومی سیرت کے بہترین نصب العین موجود ہوں اور اس لئے اس قابل ہو کہ بچوں کے رگ و ریشہ میں وہی خصلتیں اور سیرتیں منتقل ہو کر مستحکم ہو جائیں۔ انگلستان کے نام نہاد پبلک اسکولوں کی شہرت کا دارومدار انھیں اصول کو کامیابی کے ساتھ چلانے پر ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ ان اسکولوں کے معاشرتی نصب العین میں جسمانی قوت اور جرأت، نیک اخلاق، قومی روح، ضبط نفس اور آزادی و حکومت خود اختیاری کے لئے تربیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کسی شہری کی تخلیق کے لئے یہ تمام باتیں قیمتی عناصر ہیں اور اس لئے ان کا وجود ہر قسم کے اسکولوں کی زندگی میں لازمی ہے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اسکولوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبا کو متعدد مضامین کی تعلیم دیں۔ یہاں پر ہم جس اصول کی پیروی کرتے ہیں اس کے گوناگوں مفہوم ہوسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص قوم کی زندگی اور ضروریات کا وسیع یا محدود نقطۂ نظر رکھے۔ محدود نقطۂ نظر کی رو سے قوم کو کسی وقت کسی قسم کے علم و حذاقت کی ضرورت پیش آتی ہو تاکہ وہ اپنی اقتصادی اور دوسرے قسم کی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے اور اسکولوں کا یہ کام ہے کہ وہ ایسے نوجوان طلبا پیدا کریں جو اُس علم و حذاقت سے بہرہ ور ہوں۔ وسیع نقطۂ نظر کے لحاظ سے حال کی افادی ضروریات کو کم اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے بجائے طلبا کو ان عناصر سے روشناس کرایا جاتا ہے جو لوگوں کی تاریخی زندگی میں نہایت دائمی اور بنیادی طور پر وقیع خیال کئے جاتے ہیں۔ ان نظریوں کے تباین سے صنعتی اور لبرل (عام تعلیم جو تہذیب نفس کے لئے دی جائے) تعلیم اور جدید یا قدیم کلاسکی تعلیم میں اور کم واضح طور پر اس تعلیم میں جو علم کی قیمت پر زور دیتی ہے اور اُس میں جو ذہنی تربیت اور تادیب پر زور دیتی ہے تناقض پیدا ہوگیا ہے۔

ان متصادم خیالات میں جو مذکورہ بالا تناقضات میں شامل ہیں ہم کو ایک معقول نصاب تعلیم کا تعین لازمی ہے ایسے نظریہ کی بنیاد یقیناً اس پر قائم ہونا چاہیے جس کو وسیع نقطہ نظر کہا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے خاص اصول یہ ہونے چاہئیں کہ اسکولی معاشرہ اپنے تخلیقی اثرات میں ان ذہنی، جمالیاتی اور عملی سرگرمیوں کی کیفیتوں کو شامل کرے جنھوں نے انسانی روح کے ارتقا میں اہم حصہ لیا ہے اور جن کی وجہ سے عصر جدید کے دماغ کی تشکیل ہوئی، ادب اور آرٹ، موسیقی و صنعت ریاضی اور سائنس، جغرافیہ اور تاریخ مکمل نصاب کے ضروری جوہر ہیں لیکن یہ چیزیں صرف گوناگوں طریقوں سے نصاب میں داخل نہیں ہو سکتیں، وہ داخل ہو سکتی ہیں اگر مختلف قسم کے طلبا کی گوناگوں ضرورتوں کے لحاظ سے مناسب ہوں مثلاً کسی مخصوص صنعت کے لئے تیار کرنا کسی خاص اصول کے مطابق ہوتا ہے اگر اس کا مقصد صرف اوزار کے استعمال کی حذاقت یا تجربی صنعتی علم نہ ہو بلکہ متعلم کو اسکول میں کسی ایسے ضروری پیشہ یا فن کے اخلاقی، سائنٹفک یا جمالیاتی روایات کے اندر رکھا جائے جس نے ہمارے تمدن و تہذیب کی ترقی میں ایک اہم حصہ لیا ہے اور برابر لے رہا ہے۔ اس طرح عمل کرنے سے صنعتی تربیت آبادی کے بڑے حصوں کے لئے حقیقی لبرل تعلیم کی تکمیل اور ہمواری کا موزوں طریقہ ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف وہ تربیت جو زیادہ تر قدیم کلاسکس (ادب القدما) کے مطالعہ پر مبنی ہو لبرل کہلانے کی مستحق نہیں ہے جب تک کہ وہ ایسی نہ ہو کہ اس سے ایک طالب علم موجودہ دنیا میں آزاد انسان نہ بن سکے۔ اس کے خیالات حساس ہوں اور وہ اس تہذیب کی ذہنی اور معاشری تحریکات کی اہمیت سے باخبر ہو۔

اس نقطہ نظر سے ذہنی تربیت یا تادیب کا ترقی دینا اور سنوارنا تعلیم کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ تعلیمی نظریہ اور عمل پر وہ اتنا گہرا اثر برابر ڈال رہا ہے کہ اس کی پُر احتیاط تحلیل کی ضرورت ہے۔ اسی خیال کو لطیفے کے طور پر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک انسان کی تعلیم ان چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کو وہ اسکول میں سیکھنے اور پھر بھلا دینے کے بعد یاد رکھتا ہے لیکن ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ وہ کیا یاد رکھتا ہے؟ خام نقطہ نظر کے مطابق اسکولی مطالعوں سے بعض قابلیتیں اور دماغی قوتیں ترقی پاتی ہیں اور وہی ترقی ان کو جاری رکھنے کا اصل باعث ہوتی ہیں۔ خیالات جو کچھ روزانہ سیکھتا ہے، ممکن ہے کہ اسکول چھوڑتے ہی وہ بہت جلد نسیاً منسیاً ہو جائیں لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تعلیم سے اس کا حافظہ قوی ہو جاتا ہے اور یہی اس کی کافی تائید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو کبھی بھی اپنے حاصل کردہ علم طبیعیات اور علم کیمیا کے استعمال کرنے کا موقع نہ ملے لیکن کوئی مضائقہ نہیں اگر اس نے ان علوم سے

قوت مشاہدہ اور قوت استدلال حاصل کرلی ہوں جن کی قیمت عالمگیر ہے اور اس نے تمام بحث طلب امور میں سائنٹفک طریقہ کے استعمال کی عادت ڈال لی ہو۔ اسی طرح یہ خیال بھی رائج ہے کہ علم ہندسہ سے قوت تفکر کی تربیت ہوتی ہے اور جبر و مقابلہ سے دماغی درستی۔ ان مثالوں میں نفسیاتی قوت ذہنی یا نظریہ نقل تربیت ذہنی کا مسئلہ پیش نہیں کیا گیا ہے جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی فطری قوت کو ایک موضوع پر تربیت دینے میں دوسرے موضوع کی تربیت کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جدید نفسیاتی تجربات نے اس خیال پارینہ کی عمارت کو متزلزل کر دیا ہے۔ ان سے یہ ثابت ہے کہ ایک انسان جو اشعار کے یاد کرنے میں طویل مشق سے اپنی قوت حافظہ کو تربیت کرتا ہے وہ کسی حالت میں نثر کے ٹکڑوں کو اس سے کم محنت میں یاد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ بھی قابل یقین نہیں کہ علم نباتات اور علم طبقات الارض کا ایک ذکی ناظر جس نے اپنی تربیت سے آنکھ کی سرعت اور اعتماد کے اوصاف حاصل کرلئے ہیں وہ ان کو دہلی کی شاہراہوں پر موٹر چلانے میں مدد دیں گے۔ ان یقینی واقعات اور عمومی اعتبارات سے دماغی تربیت کا خیال باطل ثابت ہو رہا ہے لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ وہ ظنیات جو جان لاک اور دیگر قابل اور تجربہ کار معلموں کی کاوش کا نتیجہ ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب "تعلیم" میں صحیح نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسکولی مطالعوں کی قدر علم اور قدر تربیت کا تناقض بالکل غلط ہے۔ اگر ہم اپنے طلبا کو ایسے علم سے روشناس کریں جو بیش قیمت ہے یعنی وہ علم جس کی امور زندگی کے منضبط کرنے میں ناگزیر قیمت ہے تو ہم اس کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین ممکن دماغی تربیت کرسکیں گے کیونکہ یہ ناقابل یقین ہے کہ بہترین قسم کے علم کی تلاش سے بہترین دماغی تادیب نہیں ہو سکتی۔ اس دلچسپ عقیدہ کو جہاں تک اسپنسر کا ذاتی تعلق ہے مسئلہ ارتقا کے ماننے والے کے عقیدے کا ایک جزو سمجھنا چاہئے لیکن اس کو مذکورۂ بالا عام اصول نصاب کا نتیجہ بھی خیال کرنا چاہئے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ بہترین تعلیمی سرگرمیاں وہ ہیں جنہوں نے تمدن کی ترکیب اور ترقی میں ضروری اور مستقل مدد پہونچائی ہے۔ ان امدادوں کا حقیقی سہرا ان لوگوں کے سر ہے جو قوم کے نابغہ (Genius) تھے۔ مثلاً بڑے بڑے آرٹسٹ، صناع، شعراء، ادبا، مفکر اور سائنٹسٹ، ارباب سیاست یہی لوگ ہیں ان تمدن کے نقاش اور معمار ہیں اور انہیں لوگوں نے سرگرمیوں کی تشکیل اور شستگی کی ہے۔ ان کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی اور اس طرح ہمہ گیر شعبوں کی روایات ـــ ذہنی جمالیاتی اور عملی کی تکمیل ہے جن کی معین اور مخصوص شکلیں آج ہمارے سامنے

ہیں۔ اسی طرح شعری اور نفیس ادبی روایات کی نشو و نما عالمگیر عادت نطق اور ارتباط سے ہوئی ہے۔ فن تعمیر اور صنعت مادی زندگی کی عالمگیر ضروریات سے بڑھے ہیں۔ سائنس کی ترقی عالمگیر عطیہ تجسس اور بے پایاں عملی مقاصد کے لئے قطعی علم کی ہمہ گیر ضرورت سے ہوئی اور اسی طرح دوسری بنیادی سرگرمیوں کی جو نصاب تعلیم میں داخل ہیں نشو و نما ہوئی جس قدر ایک طالب علم کا مطالعہ ان روایات سے اس کا قریبی تعلق پیدا کر دیتا ہے یا اس میں ان کو جذب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اسی قدر اس کا دماغ ان اعلیٰ دماغوں کا پرتو اور آئینہ ہو جاتا ہے جنھوں نے ان کو وضع کیا تھا اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے اس کا دماغ منظم بھی ہو جاتا ہے۔ الغرض اسکولی زندگی کے نظم اور مطالعہ سے یہ مراد ہے کہ بچوں میں یہ قوت و صلاحیت چھوٹے پیمانے پر پیدا ہو کہ وہ جلیل القدر شعرا کے ہم جلیس، ماہرین فن کے ہمسر، حکما اور فلاسفہ کے ہم رتبہ ہو سکیں۔ ان میں وہ وقت نظر پیدا ہو کہ فطرت اور کائنات کا مطالعہ ایک سائنسداں کی عینک سے کریں اور ایسے شہری ہوں کہ ان کے پیش نظر عظیم انسان شہریوں کی مدنی زندگی کا نصب العین ہو۔ اس قسم کی تادیب و تربیت مستحکم ہوتی ہے نہ کہ پادر ہوا اور اس کی قیمت ہمہ گیر ہے کیونکہ جو سرگرمیاں اس کی تشکیل کرتی ہیں وہ متمدن زندگی کی بنیادی سرگرمیاں ہیں۔

ابھی تک مدرسہ کے نظام میں مذہبی تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ اس مختصر مضمون میں شرح و بسط سے لکھنا ممکن نہیں۔ کچھ تو یوں کہ مذہب کی اصطلاح بہت ہی پیچیدہ اور بے پایاں مظاہر پر مشتمل ہے اور کچھ یوں کہ لوگوں کا اندازہ مذہب کے متعلق اس قدر گوناگوں ہے کہ بعض حالتوں میں بالکل متضاد ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں بہت سے لوگ متناقض معتقدات کے پیرو ہیں جو اخلاقیات کی تعلیم بغیر مذہب کے جائز اور لازم خیال کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک مذہب ایک روحانی مرض ہے یا یوں سمجھئے کہ تہذیب کے عہد طفولیت کا فریب محض ہے جس کو موجودہ زندگی میں ناپید ہو جانا چاہئے۔ جو لوگ انتہائی نقطہ نظر کے علمبردار ہیں وہ نصاب سے مذہبی تعلیم کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں وہ قوموں کی زندگی میں کسی اہم اور مستحکم قیمت والے عامل کی نمائندگی نہیں کرتی۔ باوجود اس کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ انتہا پسند بھی ایمان رکھتے ہیں جن کے پیش نظر متعین نصب العین کی اعلیٰ قیمت ہوتی ہے۔ یہ معترف ہیں کہ وہ نصب العین بجا طور پر خدمت کا مطالبہ کرتے ہیں اور اصلاح باطن پر کچھ اثر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا ایمان یقیناً مذہبی کہلائے گا کیونکہ وہ تمام صحیح اور سچے مذاہب کا لب لباب ہے تو یہ شبہ کہ آیا نصاب تعلیم علم

اصول مذہبی تعلیم پر منطبق ہوتا ہے رفع ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مذہب اس وسیع مفہوم میں انسانی جماعتوں کی بقا اور ترقی کا ایک بنیادی عامل ہے اور اس لئے ...... اُس مذہبی تعلیم کو لازماً اسکولی معاشرہ کا ایک عامل ہونا چاہئے لیکن یہاں پر مذہبی تعلیم (بہت عام مفہوم میں) اور مخصوص معتقدات کے مابین رشتہ کا سوال باقی رہتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر کوئی اتفاق بآسانی نہیں ہو سکتا۔ غالباً دماغی ترقی کے عام خط و خال کے متعلق سب لوگ متفق ہوں گے یعنی مذہب اعتقادی عناصر (جن کی فطرت اس منظم نظریہ کی مائل ہے جو مذہبی عبادت کے مقاصد اور سرچشموں سے متعلق ہے) ان پر عنفوان شباب سے پہلے کم زور دینا چاہئے لیکن اگر یہ رائے تسلیم بھی کرلی جائے تو اس کی تطبیق مباحثے کا دروازہ کھلا رکھتی ہے۔

اسکولی حکومت اسکولی نظم حکومت کے متعلق اسی قسم کی کچھ نظری مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسکولی معاشرہ کا دارومدار اس مصنوعی مجبوری پر ہے جس کی نوعیت اُس بڑی سوسائٹی کے دبانے والے اثرات سے مختلف ہوتی ہے جن سے ایک شہری ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسکولی حکومت کا حاصل بزرگوں کے منتخب مقاصد کی روشنی میں بچوں کی زندگی کا انضباط ہے۔ تاہم چونکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ بچے اور بچیاں بہ حیثیت مرد اور عورت کے بڑی سوسائٹی کی عمومی زندگی میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں زندگی کے بنیادی خط و خال اسکولی معاشرہ میں موجود ہوں۔ جہاں جہاں جمہوری عقائد کا دور دورہ ہے وہاں اس اصول کو کام میں لانا غیر یقینی ہے۔ موجودہ دور میں انگلستان، امریکہ، جرمنی اور دیگر ممالک میں اسکولی نظام حکومت کو مکمل جمہوری بنیاد پر چلانے کے تجربات کئے گئے ہیں جن کی رو سے بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ اپنی چھوٹی سی ریاست میں بحیثیت قانون ساز اور حاکم عدل کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کے تجربات بچوں کی نشوونما کی روایات سے متناقض ہیں اس لئے ان کی عملی کامیابی میں بہت مشکلات ہوتی ہیں۔ ایسے ماحول میں یہ تجربات کامیابی حاصل کرتے ہیں جہاں قصوروار طلبا کو بداخلاقی سے زیادہ ارباب بست و کشاد کی نظمی اور بدعملی سے نجات دلانے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں اسکولی حکومت کی باگ ڈور اسکولی معاشرہ کے بالغ ممبروں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ انگلستان میں خاصکر موجودہ اسکولوں اور گزشتہ صدی کے اسکولوں کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک نمایاں عام ترقی اسی جانب میں ہوئی ہے جس کو زیادہ دلیر عملیں بہت آگے

بڑھا سکتے ہیں۔ اساتذہ کا استبدادی رویہ جو ایک زمانہ میں ان کا طرۂ امتیاز تھا محسوس طور پر معتدل ہوتا جاتا ہے۔ ا ر
حاکم مطلق کی طرح اپنی مرضی کا اثر ڈال کر کام نہیں کرتے بلکہ ان کی حیثیت ایک نظریہ' فطری مربی کی ہے جس
رکھنے میں ہر شخص دلچسپی لیتا ہے۔ اب اسکولوں میں یہ خیال عام طور پر پھیل رہا ہے کہ اسکول کی حکومت کا بوجھ ا
طلبا کے کاندھوں پر رکھا جائے جو اسکولی افادے کو سمجھ سکتے اور اس کی ذمہ داریوں کو برداشت کر سکے
کیونکہ اس طریقے سے طلبا کی مرضی کے مطابق کام ہوگا۔ خود اختیاری اور ذمہ داری کا احساس ہوگا اور نیز
سے اخلاق کی نشو و نما بھی ہو سکے گی۔

سزا سزا کا قدیم نظریہ بھی اسکولی حکومت کے نظریہ کی طرح بدلتا ہوگا کیونکہ سزا حکومت کا ایک آلہ ہے۔ یہ
نہ ہوگا کہ کسی زمانہ میں سزا اسکولی حکومت کا ایک اہم آلہ تھا لیکن آج کل کوئی معلم اس کا استعمال اس تشدد سے
کرتا جیسا کہ پہلے معقولیت اور درستی کے خیال سے کرتا تھا۔ اس کی وجہ موجودہ مذہب انسانیت نہیں ہے
موجودہ تعلیمی نظریہ کی روشنی میں استاد بے چینی اور پریشانی سے مجبور ہو کر یہ محسوس کرتا ہے کہ سزا کی ضرورت
بات کی علامت ہے کہ طلبا کی حقیقی ضروریات اور اسکولی زندگی کے حالات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ا
ہم آہنگی نہ پائے جانے کا ذمہ دار خود استاد ہی ہے۔ اسی لئے وہ اصلاح شر کے لئے سزا کی طرف رجوع کر
سے زیادہ ان حالات کی درستی کی سعی کرتا ہے۔ ایسی پالیسی عام اصول کے مطابق ہے جس کی وجہ سے ا
کا کام صحت بخش اور قیمتی قسم کی قطعی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی اہم ہے کہ دماغی تادیب
پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب صحیح کام کو صحیح طریقہ سے انجام دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اسکول میں
نمودار ہو جائے گی چاہے وہ کتنا ہی سائنٹفک طریقہ سے چلایا جائے کیونکہ معلم کا فرض نہ صرف طلبا کے
کہنے کے انسانی رجحان کا جانچنا ہے بلکہ والدین کے غیر دانشمندانہ سلوک کا معلوم کرنا ہے جو
نے بچوں کی ابتدائی زندگی میں ان کے ساتھ کیا۔ غلط کاری اور اس کے متعلق سزا کے انسداد کی جتنی بھی
کی جائے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ باوجود اس کے بچوں کے ساتھ حکیمانہ برتاؤ، کورانہ استبدادی ضابطے سے
اصلاح کا حامل ہو سکتا ہے۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی بی۔

تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟

ہندوستان میں موثر تعلیم کے نتائج کا ریکارڈ شاذونادر ہی کسی مدرسہ میں ملے گا۔ ابھی ہم اس اسٹیج پر نہیں پہونچے ہیں۔ ہماری تنخواہوں کی کمی اور ہماری سستی اس قسم کے تجربوں میں مانع ہے۔ ہم میں سے اکثر معلمی کے کام کو کوئی اچھا درجہ نہیں دیتے اور ابتدائی جماعتوں میں پڑھانے والے اکثر اُستاد فخر کے ساتھ اپنا کام نہیں کرتے ان میں اور اُن کی تنخواہ میں ایک کشمکش سی رہتی ہے جس کا بالآخر نتیجہ مایوسی یا تنخواہ بڑھانے کے وسائل کا تلاش کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں صورتوں میں تجربہ کی یادداشت محفوظ ہونا اور اسے ملک کے افادہ کے لئے پیش کرنا امر محال رہا ہے۔ ہمارے قابل مفکرین نے بھی جو کم و بیش کسی تجربہ کو دیکھتے رہے ہیں باہر کی کتابوں کے ترجموں سے آگے قدم نہیں بڑھایا ہے۔ یہ سب سے بڑا قومی نقصان ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ ذاتی بے اعتمادی ہے۔ ہم یا ہمارے ساتھی جو کچھ تجربہ کرتے ہیں اس کے درست ہونے میں انھیں ہمیشہ شک ہوتا ہے۔ ہمیں دوسرے ملکوں کا کیا ہوا تجربہ بالکل صحیح اور بالکل اصولوں کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ بے اعتمادی کی وجہ سے ہم اپنا کیا ہوا تجربہ خواہ وہ کتنا ہی اصولوں کے مطابق کیوں نہ ہو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کے اعتراض اور اپنی کم مائگی کا خیال ہر وقت دامنگیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اچھی سے اچھی چیز بطور یادداشت کے محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے لوگوں کے سامنے نہیں آتی۔

بےشمار تعلیمی مسائل ہیں جن پر تجربہ کیا جا سکتا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے کیا نتائج ہوتے ہیں یہاں کے حالات کے مطابق کس قسم کے رد و بدل کی ضرورت ہے۔ مثلاً طلبا میں اچھی عادتیں کیسے پیدا کی جا سکتی ہیں؟ اس کے لئے کیا کیا عملی وسائل اختیار کئے گئے؟ طلبا مختلف مضامین میں کیوں کمزور رہ جاتے ہیں؟ کیا کیا صورتیں ہوتی ہیں؟ تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟ کون کون سے مواقع پر طلبا نے موثر طریقہ پر سیکھا؟ حاضر بہتر بنانے کے لئے گاؤں یا شہر میں کون کون ذرائع اختیار کئے گئے؟ کون کون سی صورتیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں؟ چھوٹے بچوں کو کوئی حرفہ سکھانے کے دوران میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں؟ ان پر کس طرح قابو پایا

جاتا ہے؟ ایسے اور اسی قسم کے دوسرے مسائل میں جو تجربہ کرنے کے بعد لوگوں کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری امداد ہوگی خواہ اس میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں۔ اس خیال سے کہ کوئی تجربہ پیش ہی نہ کرنا چاہئے کہ یہ تجربہ اور اس کے نتائج سو فی صدی صحیح اور درست ہوں گے۔ تعلیم میں کوئی بات بالکل آخری نہیں ہوتی کہ اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یا اس کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں تجربوں کو دل سے کرنا چاہئے اور بغیر کسی قسم کے ذہنی اور خیالی اضافہ کے اس کے نتائج لوگوں کے سامنے پیش کر دینا چاہئے۔ اس مضمون میں میں اسی چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا تجربہ "تعلیم کب موثر ہوتی ہے" کے متعلق چند باتیں اور اس کے نتائج پیش کرتا ہوں۔

جامعہ ملیہ کے قرول باغ کے مدرسہ میں جسے تعلیمی مرکز بھی کہتے ہیں بچوں کے کام کے ریکارڈ رکھنے کی برابر کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ایک ریکارڈ روم ہے جہاں بچوں کی بنائی ہوئی ڈرائنگ، بچوں کی لکھائی کے نمونے، بچوں کے مضامین، بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں، بچوں کی لکھی ہوئی نظمیں اور بچوں کے قلمی رسالے وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ ان رسالوں میں بچوں کی کسی مسئلہ کے متعلق جو مدرسہ یا ان کی اپنی ذات سے متعلق ہوتی ہے۔ آزاد رائے کی یادداشت بھی محفوظ رکھی جاتی ہے۔ ادھر جب سے ہم نے حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینا شروع کی ہے۔ بچوں کے بنائے ہوئے کاغذ ابری اور کارڈ بورڈ کے نمونے بھی یہاں رکھے جاتے ہیں۔ اس تمام کام میں ہم بچوں کی طبیعتوں کے رجحان کا اندازہ کرتے رہتے ہیں اور معلوم کرتے رہتے ہیں کہ بچے کہاں موثر طریقہ پر سیکھتے ہیں۔ کہاں ان کی توجہ سب سے زیادہ ہوتی ہے؟ کہاں وہ بے توجہی کی وجہ سے نقصان کر بیٹھتے ہیں؟ کام کتنے عرصہ دلچسپ رہتا ہے اور کب سے اس کی دلچسپی کم ہونے لگتی ہے؟ ایک موٹی سی بات اس تمام کام میں یہ سمجھ میں آئی ہے کہ تعلیم اس وقت تک موثر نہیں ہوتی جب تک وہ طالب علم کا اپنا مقصد نہیں ہو جاتی خواہ وہ کسی قسم کی تعلیم ہو۔ ہم استاد اسی بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کام، تکمیل اور کسی بات کے بتلانے اور سکھانے کو طالب علم کا مقصد بنا دیں۔ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ اس بات کو ہم اپنی ضرورت سے سیکھ رہے ہیں۔ بغیر سیکھے ہماری ضرورت نہیں پوری ہوگی۔ اگر آپ تعلیم اور کام کو طلبا کے لئے با مقصد بنا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ تعلیم خود بخود موثر ہوتی چلی جائے گی۔ آپ کو طریقۂ تعلیم سے بھی کم مدد لینی پڑے گی۔ طالب علم اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے

جو بات سیکھنا چاہے گا اس کے لئے وہ خود طریقہ تعلیم معلوم کرے گا اور آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ سیکھنے کے تمام درجے طریقہ تعلیم کے متعلق طے کر رہا ہوگا۔

تعلیمی مرکز میں جہاں باغبانی، کارڈ بورڈ، ابری بنانا اور کاغذ بنانا سکھلایا جاتا ہے اور اس کام کی دلچسپی کو تعلیم دینے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے وہاں لین دین اور حسابی مشق کے لئے بچوں کے بینک، بچوں کی دوکان اور شعبہ مصنوعات کی اشیاء فروخت کرنے سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ میں نے جن مواقع کا اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر ان چیزوں اور مقاصد سے متعلق ہیں۔ ہم نے زیر بحث بات اس وقت پیش کی جب طلبا نے اس کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی جب وہ آمادہ نظر آئے جب ہم نے یہ اندازہ کر لیا کہ یہ بات ان کا مقصد ہو چکی ہے۔

۱۔ بچوں کے بینک کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے جن بچوں کی رقمیں بینک میں جمع ہیں ان کو اس موقع پر ان کی رقم پر منافع ملے گا۔ بینک کے تین سو ممبر ہیں ۲½ فی صدی سالانہ کے حساب سے منافع دیا جائے گا۔ ابتدائی ششم کے طلبا جو بینک کا کام کرتے ہیں ہر طالب علم کا منافع اس کی رقم پر لگانا چاہتے ہیں۔ استاد ان کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے منافع یا سود پھیلانے کا طریقہ بتلاتا ہے بچے اس کو سیکھتے ہیں اور تمام ممبران کا منافع پھیلاتے ہیں۔ منافع کے رجسٹر میں درج کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو طلبا نے شوق سے سیکھا انہیں اس کی ضرورت تھی۔

۲۔ گل دیوار کے کئی پودوں کو باغبانی میں دیمک نے خراب کر دیا۔ موتیا کے کئی پودے بھی دیمک کی نذر ہو چکے ہیں، طلبا چاہتے ہیں کہ کسی طرح دیمک کا خاتمہ ہو جائے تاکہ باقی پودے بچ جائیں۔ کتابوں اور رسالوں سے دیمک کو تباہ کرنے کے کئی نسخے انہوں نے معلوم کئے، اپنی کاپیوں میں لکھے۔ ان نسخوں میں سے دو کا استعمال کر کے دیمک کا خاتمہ کر دیا۔ یہ بات بہت موثر طریقہ پر ان کو معلوم ہو گئی، دیمک کا حال اپنے شوق سے پڑھا۔

۳۔ نیا سال شروع ہوا ہے۔ بچوں کی دوکان میں بچوں کی ضروریات کی تمام چیزیں خریدی جا چکی ہیں۔ ابتدائی پنجم کے طلبا جو بچوں کی دوکان کا کام کرتے ہیں، یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کس چیز پر دوکان کو کتنا فی صدی منافع لینا چاہئے، وہ عملی طور پر فی صدی نکالنا جاننا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کی ضرورت ہے۔ وہ سو فی صدی ہر کیلئے

تیار ہیں جو کچھ ان کو بتلایا گیا انھوں نے سو فی صدی موثر طریقہ پر سیکھ لیا ہے۔

(۴) ابتدائی ششم کے طلبا ردی کا غذ بنا رہے ہیں۔ کچھ لگدی کچل رہے ہیں، کچھ کاغذ اٹھا رہے ہیں کچھ چکنا کر رہے ہیں کچھ چوکور بنا رہے ہیں استاد اس دوران میں ان کو یہ بتلاتا ہے کہ سب سے پہلے ہاتھ سے کاغذ کن ملکوں میں بنتا تھا اور اس کو سیاحوں نے کس طرح دوسرے ملکوں میں پہونچایا! سیاحوں کی کہانیوں سے کچھ سیاحوں کے حالات بتلائے گئے۔

(۵) پانچویں جماعت کے طلبا چپہ پہلو والی کشتی بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے بنانے کا طریقہ انھیں نہیں معلوم ہے۔ وہ استاد سے پوچھتے ہیں۔ استاد چپہ پہل کشتی بنوانے سے پیشتر طلبا کو چپہ پہل شکل بنانا سکھلاتا ہے۔ طلبا اسے خوشی سے سیکھتے ہیں۔

(۶) ابتدائی اول کے طلبا ابری بنانے کے دوران میں لئی ایک دوسرے کے لگا دیتے ہیں دری میں پونچھ دیتے ہیں یا ہاتھ نہیں دھوتے یا دھوتے ہیں تو کرتے یا شیروانی کے دامن میں ہاتھ پونچھ لیتے ہیں استاد سب کو جمع کر کے صاف رہنے کے متعلق بتلاتا ہے رفتہ رفتہ اس کی عادت پیدا کراتا ہے طلبا اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں صاف رہنا سیکھتے ہیں۔

(۷) لئی پکانے کے لئے ابتدائی پنجم کے طلبا انگیٹھی میں کوئلہ جلانا چاہتے ہیں۔ کوئلہ، کاغذ اور ماچس منگائی جاتی ہے۔ استاد لئی پکانے کے دوران میں ماچس کے متعلق تھوڑی سی واقفیت دیتا ہے۔ لئی پکنے کے بعد کمرۂ جماعت میں ماچس پر ایک سبق ان کی کتاب سے پڑھاتا ہے۔ سبق کا مطالعہ پوری دلچسپی سے ہوتا ہے۔ اسی موقع پر پہلی جماعت کا ایک استاد لئی پکنے کے دوران میں بچوں کو بتلاتا ہے کہ بہت پہلے جب ماچس وغیرہ کا رواج نہیں ہوا تھا لوگ آگ کس طرح جلاتے تھے اور اس طرح بچوں کو ابتدائی انسان کی کہانی سناتا ہے۔ جستہ جستہ تصویروں سے مدد لیتا ہے۔

(۸) ابتدائی اول اور دوم کے بچے لئی اور پانی کی ابری بناتے ہیں۔ یہ دو طرح کی ابریاں ہیں ایک لئی اور رنگ سے بنائی جاتی ہے، دوسری پانی پر روغنی رنگ چھڑک کر، اور فروخت کرتے ہیں۔ ایک پیسہ کا ایک فل اسکیپ تختہ فروخت کرتے ہیں۔ وہ روزانہ گنتا، پیسوں سے آنے بنانا اور آنوں سے روپے بنانا سیکھتے ہیں

اور اس کی مشق کرتے ہیں۔ روزانہ اپنی آمدنی کا حساب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ بامقصد طریقہ پر اس کی مشق کرتے ہیں کیونکہ انھیں اس کی ضرورت ہے۔

(۹) آج کل ٹیوب کے رنگ سے ابری نہیں بنوائی جاتی۔ بچے مصر ہیں کہ ٹیوب کے رنگوں سے ابری بنائی جائے اس لئے کہ ٹیوب کے رنگ سے بچے بہت اچھی ابری بنا چکے ہیں۔ استاد بچوں کو بتلاتا ہے کہ یہ رنگ جرمنی اور انگلستان سے آتے تھے۔ پہلے ایک ٹیوب ۲۰ کا ملتا تھا اب اول تو ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا ہے تو بہت پرانا جس سے ابری اچھی نہیں بنتی اور ایک ٹیوب ۴۰ کا ملتا ہے۔ استاد نقشہ کا استعمال کرتا ہے اور دنیا کے نقشہ پر جرمنی اور انگلستان دکھلاتا ہے اور بتلاتا ہے کہ مال کس راستہ سے ہندوستان آتا تھا۔ ابتدائی ششم میں اس موقعہ پر موجودہ جنگ کی وجوہات پر ایک مختصر معلومات دی جاتی ہے۔

میں نے چند بامقصد مواقع کا تذکرہ کیا ہے جہاں تعلیم موثر طریقے پر ہوئی ہے۔ اس پر اور اضافہ کیا جاسکتا ہے اور جماعت میں طلبا کے کام کا ریکارڈ رکھنے سے اس سے اچھے مواقع کی یادداشت ترتیب دی جاسکتی ہے۔ بغیر یادداشت کے اچھے سے اچھے مواقع نظرانداز ہوسکتے ہیں اس لئے موثر تعلیم کے نتائج کا اندازہ کرنے کے لئے یادداشتوں کا ہونا ضروری ہے جو بہت باضابطہ طریقہ پر رکھی جائیں۔

سید احمد علی صاحب

بھید

(ترجمہ کینڈڈا، مصنفہ برنارڈ شا)

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوسرا ایکٹ

(اسی دن شام کو۔ وہی کمرہ صاؤں کی کرسی میز پر دوبارہ رکھدی گئی ہے۔ مارچ بینکس تنہا بیٹھا ہوا ہے وقت کاٹنے کے لئے وہ ٹائپ رائٹر چھونے لگتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سنتا ہے اور چپکے سے کھڑکی کے پاس کھسک جاتا ہے اور کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے کچھ کر ہی نہیں رہا تھا مس گارنٹ ہاتھ میں ایک نوٹ بک لئے ہوئے (جس میں وہ مارل کے ارشادات شارٹ ہینڈ میں لکھا کرتی ہے) اندر داخل ہوتی ہے اور آکر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتی ہے تاکہ کچھ عبارت ٹائپ کرے۔ کام شروع کر دیتی ہے اور اس قدر مشغول ہوتی ہے کہ بوہین کا خیال بھی نہیں کرتی لیکن جب دوسری سطر ٹائپ کرتی ہے تو ایکدم رک جاتی ہے اور مشین دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے)

پ۔ اچھا مارچ بینکس تم نے میرے ٹائپ رائٹر کو خراب کر دیا ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ تم اس طرح اس طرف دیکھ رہے ہو جیسے تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔

ی م۔ (دب کر) مجھے بہت افسوس ہے مس گارنٹ! میں صرف اس سے ٹائپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا (شکایت کرتے ہوئے) لیکن ٹائپ ہی نہیں ہوا۔

پ۔ تم نے اس کی روشنائی والے پرزے کو بدلا ہوگا۔

ی م۔ (یقین دلاتے ہوئے) ۔ نہیں میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے بالکل نہیں بدلا۔ میں نے صرف ایک چھوٹا

پیتہ گھمایا تھا۔ وہ کھلک سا ہوا

پ۔ اچھا اب میں سمجھ گئی (وہ فصلی بھی ٹھیک کر دیتی ہے اور باتیں بھی کرتی جاتی ہے) میرے خیال میں تم اسے آسان قسم کی مشین کا باجا سمجھے کہ ذرا ہینڈل گھمایا اور اس نے ایک عشقیہ خط تمہارے لئے لکھ دیا کیوں نا؟

ی م۔ (سنجیدگی سے) میرے خیال میں اس مشین سے بھی عشقیہ خطوط لکھے جا سکتے ہیں۔ مشین سب برابر ہیں۔ کیوں نا؟

پ۔ (کچھ ناگوار خاطر ہو کر گویا اس قسم کی باتیں اگر تفریحاً ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ اس قسم کی باتیں کرنا اس کے دستور العمل کے خلاف ہے) مجھے کیا معلوم۔ تم مجھ سے آخر یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟

ی م۔ میں معافی چاہتا ہوں میرا خیال تھا کہ ہر سمجھدار آدمی خصوصاً وہ لوگ جو دن بھر کاروبار میں لگے رہتے ہیں یا محرری قسم کا پیشہ کرتے ہیں ضرور مشغلۂ محبت رکھتے ہوں گے تاکہ ان کا دماغ خراب نہ ہو جائے۔

پ۔ (غصہ سے کھڑے ہو کر) مسٹر ہارچ جینکس! (وہ اس کی طرف نہایت سختی سے دیکھتی ہے اور نہایت شان کے ساتھ بک کیس کی طرف چلی جاتی ہے)

ی م (اس کے پاس نہایت عاجزی سے جاتے ہوئے) مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں۔ شاید مجھے نہ چاہیئے تھا کہ آپ کے معاملات دل کی طرف اشارہ کرتا۔

پ۔ (الماری میں ایک نیلی کتاب رکھتے ہوئے اور اس کی طرف نہایت تیزی سے مخاطب ہوتے ہوئے) میرے کوئی دلی معاملات نہیں ہیں۔ تم آخر اس قسم کی مجھ سے باتیں کرنے کی جرأت کیسے کر رہے ہو؟ (کتاب کو اپنی بغل میں دبا لیتی ہے اور مشین کی طرف اکڑتی ہوئی جا رہی ہے۔ یوجین کے دل میں درد سا پیدا ہوتا ہے اور وہ نہایت ہمدردانہ طریقہ پر مخاطب ہوتا ہے)

ی م۔ اچھا تو میں سمجھ گیا۔ تم کو بھی میری طرح لبی جیسا دامنگیر ہے۔ جیسے معلوم ہوتی ہے

پ۔ ہرگز نہیں، میں قطعی شرم نہیں کرتی اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

ی م۔ (پیچھے سے رازدارانہ طور پر) تم محبت کرتی ہو اور یہی تو وجہ ہے کہ دنیا میں اس قدر کم معاملات دل ہوتے ہیں ہم سب محبت کے بھوکے اِدھر اُدھر گھوما کرتے ہیں محبت ہماری فطرت کی اولین ضرورت ہے۔ ہمارے

دلوں کی اولین خواہش۔ لیکن ہم اپنا شوق اپنی زبان سے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ہم سب کو حیا دامنگیر رہتی ہے (بڑے خلوص سے) مس گارنٹ جلا تم ہی بتاؤ کہ اس خواہ مخواہ کی جھجک، اس ڈر، اس شرم سے نجات پانے کے لئے کیا کیا دل نہ چاہتا ہوگا۔

پ۔ (اپنی ہتک محسوس کرتے ہوئے) میں بچ گئی۔ (

ی م۔ (خندہ کرتے ہوئے) (اونہہ) یہ خواہ مخواہ کی باتیں میرے سامنے رہنے دو، یہ سب تصنع بناوٹ ہوتی ہے میں ان سے مرعوب نہیں ہوتا آخر ان باتوں سے فائدہ ہی کیا۔ تم اپنی اصلی شخصیت مجھ پر ظاہر کرنے سے کیوں ڈرتی ہو؟ میں بھی بالکل تمہاری طرح ہوں۔

پ۔ میری طرح یہ آخر بات کیا ہے؟ یہ تم مجھے خوش کر رہے ہو یا اپنے کو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کس کو؟ (وہ پھر ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہونا چاہتی ہے)

ی م۔ (اسے جھجک سے روکتے ہوئے) (ہش! میری سنو! میں ہر جگہ محبت کی تلاش میں گھومتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ دوسروں کے سینوں میں بھی یہی چیز طوفانی شدت سے موجزن ہے لیکن جب میں کسی سے اس کی درخواست کرنا چاہتا ہوں تو یہی شرم یہی حیا میرا گلا پکڑ لیتی ہے اور میں گونگا کھڑا رہ جاتا ہوں بلکہ گونگے سے بھی بدتر۔ بے معنی باتیں اور احمقانہ جھوٹ بکنے لگتا ہوں اور پھر طرہ یہ کہ میں دیکھتا ہوں وہی محبت جس کے لئے میں بیتاب تھا جس کا میں بھکاری تھا کتے بلیوں اور پرندوں کو دی جاتی ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ آتے ہیں اور اس کے طالب ہوتے ہیں، مانگ سکتے ہیں اور مانگ لیتے ہیں۔ (خاموشی سے سرگوشی کرتے ہوئے) محبت ہر جگہ طلب کرنا چاہئے۔ یہ بالکل ایک جن کی طرح ہے جب تک تم خود اس سے نہ بولو یہ نہیں بولتی لیکن (پھر اپنے اصلی لہجہ میں لیکن مایوسی کے ساتھ) دنیا میں محبت ہر جگہ اظہار کیلئے بے قرار و مضطرب رہتی ہے لیکن اظہار کی جرأت نہیں کرتی اس لئے کہ وہی شرم دامنگیر ہو جاتی ہے حیا مانع آتی ہے بس یہی دنیا کا ایک المناک پہلو ہے (نہایت گہری سانس لیتا ہے اور ملاقاتیوں والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے)

پ۔ (نہایت متعجب ہو کر لیکن ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے، اور اجنبی نوجوانوں کے سامنے اپنے عفت و عصمت کے احساس کی نمود کرتے ہوئے) لیکن خراب قسم کے لوگ تو اس شرم پر غالب آجاتے ہیں۔ کیوں: ؟

می م۔ (جھٹ پٹ اُٹھ بیٹھتے ہوئے اور نہایت شدت سے کہتے ہوئے) خراب لوگ وہ لوگ ہیں جن میں محبت کا جذبہ نہیں ہوتا اسی لئے ان کو شرم بھی نہیں ہوتی۔ ان کو محبت طلب کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کو اس کی ضرورت نہیں۔ اور اپنی محبت جتانے کی ان میں طاقت ہوتی ہے اس لئے کہ اُن کے پاس ہوتی ہی نہیں (وہ اپنی جگہ پر پھر مضمحل ہو جاتا ہے اور حسرت سے کہتا ہے) لیکن ہم۔ ہم لوگ جو محبت والے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری محبت دوسروں کی محبت سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکال سکتے (نہایت دب کر) سمجھیں آپ!

پ۔ اچھا سنو! اگر تم نے اس قسم کی باتیں مجھ سے کرنا بند نہ کیں تو میں کمرے کے باہر قطعی چلی جاؤں گی مسٹر مارچ بینکس! میں سچ مچ چلی جاؤں گی یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔

(وہ پھر اپنے ٹائپ رائٹر پر چلی جاتی ہے۔ اپنی نیلی کتاب کھولتی ہے اور اس سے ایک صفحہ نقل کرنے کا ارادہ کرتی ہے)۔

می م۔ (ناامیدی سے) ہاں یہی باتیں کبھی اچھی باتیں نہیں ہوتیں (وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کمرہ میں کھویا ہوا سا ٹہلنے لگتا ہے) مس گارنٹ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اور کیا باتیں کروں؟

پ۔ (بے رخی سے) اِدھر اُدھر کی باتیں کرو۔ موسم کی باتیں کرو۔

می م۔ فرض کرو اگر ایک بچہ قریب ہی بھوک کے مارے چلا رہا ہوتا تو کیا تم اس سے بس ادھر اُدھر کی باتیں کروگی؟

پ۔ نہیں

می م۔ بس اسی طرح میں اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں کر سکتا۔ جب میرا دل اپنی بھوک کی وجہ سے تڑپ رہا ہے

پ۔ اچھا! تو پھر چپ رہو۔

می م۔ ہاں بس یہی تو ہوتا ہی ہے۔ ہم سب اپنی اپنی زبانیں بند رکھتے ہیں کیا اس سے دل کی دھڑکن بھی خاموش ہو سکتی ہے؟ نہیں دل برابر رو کے جاتا ہے۔ سے نا! ضرور اور قطعی یہی ہوتا ہوگا۔ اگر تمہارے پاس واقعی دل ہے۔

پ۔ (یکدم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے) کوئی فائدہ ہی نہیں کہ میں کام کرنے کی کوشش

کروں جبکہ تم اس قسم کی باتیں کئے چلے جا رہے ہو (میز سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھتی ہے احساسات مشتعل ہیں) تمہیں اس سے کیا مطلب کہ میرا دل روتا ہے کہ نہیں پھر بھی میرا ارادہ ہوتا ہے کہ تم کو بتا دوں۔

ی م۔ نہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی سے جانتا ہوں

پ۔ لیکن دیکھو، اگر تم نے ذرا بھی کہیں زبان کھولی تو میں فوراً انکار کر دوں گی۔

ی م۔ (ہمدردی سے) ہاں، یہ بھی جانتا ہوں۔ اچھا تو تمہاری ہمت نہیں پڑتی کہ اس سے کہہ سکتیں!

پ۔ (اچھل پڑتے ہوئے) اس سے! کس سے؟

ی م۔ وہ جو کوئی ہو۔ میرا مطلب یہ کہ وہ شخص جس سے تم محبت کرتی ہو۔ وہ کوئی ہو۔ مسٹر ل شاید۔

پ۔ (حقارت سے) مسٹر ل!! اخوب وہ بڑا اچھا آدمی ہی ہے کہ میں پر اپنا دل کھو بیٹھوں؟ اس سے زیادہ تو میں تمہیں پسند کر سکتی ہوں۔

ی م۔ (جھجک پڑتے ہوئے) نہیں، نہیں میں نہیں مجھے بہت افسوس ہے لیکن تمہیں اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہئے میں ——

پ۔ (زچ ہو کر آتشدان کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے، اس کی طرف پیٹھ کر کے) تمہارے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ شخص تم نہیں ہو بلکہ دراصل کوئی خاص شخص نہیں ہے۔

ی م۔ میں جانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تم اس سے محبت کرو گی جو تم سے اظہار ——

پ۔ (مڑتے ہوئے نہایت خفگی سے) مجھ سے اظہار — نہیں ہرگز نہیں۔ تم نے مجھے آخر سمجھا کیا ہے؟

ی م۔ (ناامید ہو کر) اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم سچ سچ جواب کبھی نہ دو گی۔ وہی جھوٹی باتیں کرتی ہو جو ہر شخص کہنے لگتا ہے (وہ صوفے کی طرف جاتا ہے اور انتہائی ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے)

پ۔ (چڑ کر گویا وہ اسے عزیب طبقہ کا سمجھ کر باتیں کرنا نہیں چاہتا) اگر تم ہمیشہ نئی اور نرالی باتیں چاہتے ہو تو بہتر یہ ہے کہ تم خود اپنے سے تنہائی میں جا کر باتیں کر لیا کرو۔

ی م۔ ہاں، یہی تو مجھ کرنا ہوتا ہی ہے۔ ہر شاعر یہی کرتا ہے۔ وہ اپنے سے بلند آواز میں باتیں کیا کرتے ہیں اور دنیا ان کی باتیں سن لیتی ہے پھر بھی یہ سخت تنہائی کی باتیں ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی دوسروں کی باتیں سننے کو بھی جی چاہتا ہے۔

پ۔ اچھا رکو اسٹر مارلی آتے ہوں گے۔ وہ تم سے باتیں کریں گے دماغ لرز جاتا ہے نہیں تمہارے گھبرانے اور منہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے وہ تم سے بہتر باتیں کر سکتے ہیں (تیز ہو کر) باتیں کرتے کرتے تمہارا بھیجا۔ دماغ درست کر دیں گے (انتہائی غصے سے اپنی جگہ جانے کے لئے مڑتی ہے لیکن یوجین ایکدم چونک پڑتا ہے بالکل بدل جاتا ہے (اکھڑا ہوا ہوتا ہے) اور اس کو روک لیتا ہے

ی م۔ خاہ! اب میں سمجھا!!

پ۔ (سرخ ہوتے ہوئے) کیا سمجھے؟

ی م۔ تمہارا راز کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ سچ بتانا کیا واقعی اور حقیقتاً یہ ممکن ہے ایک عورت کے لئے کہ اس سے محبت کر سکے؟

پ۔ (گویا اب بات حد سے گذر گئی) خوب!

ی م۔ (جوش سے) نہیں نہیں، سچ مجھے بتلاؤ تو ذرا۔ میں جاننا چاہتا ہوں میں قطعی جاننا چاہتا ہوں میری سمجھ میں یہ بات بالکل آتی ہی نہیں جیسے تو اس میں کچھ نظر نہیں آتا سوائے الفاظ کے متبرک خیالوں کے اور وہ بات جسے لوگ الوہیت سے تعبیر کرتے ہیں لیکن تم ان باتوں سے تو محبت کر نہیں سکتیں؟

پ۔ (تجاہل عارفانہ سے اس کی بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے) میری تو بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟

ی م۔ (زور سے) تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم قطعی میری بات سمجھ رہی ہو۔

پ۔ اچھا!

ی م۔ تم قطعی سمجھ رہی ہو اور قطعی میرا مطلب تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے (جواب لینے پر بضد ہوتے ہوئے) کیا واقعی یہ ممکن ہے کہ ایک عورت اس سے محبت کرے؟

پ۔ (اس کی طرف آنکھیں چار کر کے) ہاں! (وہ اپنے منہ کو اپنے ہاتھوں سے بند کر لیتا ہے) ہائیں یہ تمہیں کیا ہو گیا! (وہ اپنے ہاتھوں کو ہٹا لیتا ہے۔ پراز رائن اس کی اس حالت کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے اور جتنا دور ہو سکتا ہے ہٹ جاتی ہے لیکن اس کی طرف برابر دیکھے جاتی ہے۔ یوجین اس کی طرف سے نگاہ ہٹا کر اٹھتا ہے اور بچوں والی

کرسی پر جا بیٹھتا ہے نہایت ہی ناامیدی کے ساتھ وہ باہر چلی جانا چاہتی ہے لیکن جیسے دروازہ کے پاس پہونچتی ہے، دروازہ کھلتا ہے اور برگیس اندر داخل ہوتا ہے اور وہ ایک دم رک جاتی ہے، خدا کا شکر ہے۔ آخر کوئی آ تو گیا (اسے گویا اطمینان ہو جاتا ہے اور میز پر اپنی جگہ آ بیٹھتی ہے۔ ٹائپ رائٹر میں ایک نیا کاغذ لگا دیتی ہے برگیس یوجین کے پاس چلا جاتا ہے)

ب۔ (معنی خیز انداز میں ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے) خوب! تو گیا اسی طرح آپ تنہا چھوڑ دیئے جاتے ہیں (مسٹر پارچ بینکس میں آپ سے باتیں کرنے کے لئے آ گیا ہوں (یوجین اس کی طرف وحشت سے دیکھتا ہے لیکن وہ اسے نظر انداز کرتا، جیسے کھانے والے کمرے میں کسی دوسرے سے باتیں کر رہا ہے اور کینڈی اور کسی لڑکی کو کشیدہ کاری سکھلا رہی ہے (ہمدردی جتاتے ہوئے) یہاں آپ کی اکیلے اکیلے طبیعت گھبرا گئی ہوگی کہ سوائے ٹائپسٹ کے اور کوئی باتیں کرنے والا نہ تھا (وہ آرام کرسی کو اپنی طرف گھسیٹتا ہے اور اس پر بیٹھ جاتا ہے)

پ۔ (نہایت ہی برافروختہ ہو کر) انھیں اب اطمینان ہو جائیگا کیونکہ اب انھیں آنجناب سے شریفانہ گفتگو کرنیکا شرف حاصل ہو گیا ہے یہ بھی کیا کم ہے (اتنا کہکر وہ زور شور سے ٹائپ کرنے لگتی ہے)

ب۔ (اس کی جسارت پر متعجب ہو کر) جوان عورت میں تجھ سے باتیں نہیں کر رہا تھا میرا جہاں تک خیال ہے۔

پ۔ مسٹر پارچ بینکس آپ نے اس قسم کا بھی خراب اخلاق کہیں دیکھا ہے!

ب۔ (شاندار سنجیدگی سے) یوجین ایک شریف آدمی ہے اور اپنی پوزیشن سے بخوبی واقف ہے اور یہ وہ خوبی ہے جو لوگوں میں کم ہوتی ہے۔

پ۔ (جھلا کر) اچھا تو گویا نہ تم شریف آدمی ہو اور نہ میں شریف عورت اگر یوجین یہاں نہ ہوتے تو میں تم سے ذرا صاف گفتگو کرتی (وہ اپنی مشین سے ٹائپ کیا ہوا خط اتنے زور سے نکالتی ہے کہ پھٹ جاتا ہے، دیکھا، یہ خط آخر تمہاری وجہ سے خراب ہو گیا اب مجھے دوبارہ پھر اسے ٹائپ کرنا پڑے گا۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں اپنے کو ضبط نہیں کر پا رہی ہوں۔ کورسٹ، احمق، گدھا۔

ب۔ (اٹھ کر غصے ہو کر غصے سے ہانپتے ہوئے) خوب! میں کورسٹ احمق اور گدھا ہوں تو بہ خوب! بہت گہری سانسیں لیتے ہوئے، اچھی بات چھوکری بہت اچھی بات ہے۔ ذرا رک جاؤ تمہارا مالک آئے پھر میں تمہیں بتلاؤں گا

پھر دیکھنا۔ پھر بتلاؤں گا۔

پ۔ (محسوس کرکے کہ وہ کچھ زیادہ کہہ گئی) میں ——

ب۔ (اس کا کلام قطع کرتے ہوئے) نہیں۔ بس اب جو کچھ تمہیں کہنا تھا کہہ چکیں۔ بس اب تمہیں مجھ سے بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بتلا دوں گا کہ میں کون ہوں (اپ نائب رائٹر میں دوسرا کاغذ چڑھاتی ہے اور حقارت سے کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیتی ہے) مسٹر روبین آپ بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوجئے گا۔ وہ اس قابل ہے ہی نہیں (نہایت شان سے پھر بیٹھ جاتا ہے)

ی م۔ (بہت پریشان ہو کر اور سہم کر) میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہم اپنا موضوعِ کلام بدل دیں میرا۔ میرا خیال یہ ہے کہ مس گارنٹ کا مطلب آپ کی طرف ایسا نہ تھا۔

پ۔ (غلطی یقین کے ساتھ) میں نے وہی کہا جو میرا مطلب تھا۔

ب۔ ایسی عورتوں کی باتیں سننا میری شان کے خلاف ہے۔

(ایک برقی گھنٹی دو دفعہ بجتی ہے)

پ۔ (اپنے کاغذات و نوٹ بک اکٹھا کرتے ہوئے) یہ میرے لئے ہے (وہ جلدی سے باہر چلی جاتی ہے)

ب۔ (اس کی طرف منہ کرکے کہتے ہوئے) خیر جاؤ۔ ہم لوگ تم کو جانے کی اجازت دے رہے ہیں (اس بات سے مسرور ہو کر کہ آخری جملہ انہیں کا رہا اور پھر ذرا اور باثر جانے کے لئے آپ پ کی طرف برابر دیکھتے رہتے ہیں۔ جب وہ بالکل اوجھل ہو جاتی ہے تب اپنی جگہ پر یوبین کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اس سے رازدارانہ لہجوں میں بات چیت کرنے لگتے ہیں) مسٹر روبین اب ہم اس وقت بالکل تنہا ہیں۔ میں ایک بات آپ سے دوستانہ مشورہ کے طور پر کہتا ہوں جو اور کسی سے نہ کہتا۔ اچھا پہلے یہ بتلائیے آپ سے اور میرے داماد جیمس سے کتنے عرصہ سے ملاقات ہے؟

ی م۔ مجھے یاد نہیں تاریخیں مجھے یاد ہی نہیں رہتیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہی ایک دو ایک مہینے ہوئے ہونگے

ب۔ آپ کو اس میں کوئی عجیب بات نظر آئی؟

ی م۔ نہیں مجھے تو نہیں نظر آئی۔

پ۔ (مسکراتے ہوئے) اور نہ آپ کو نظر آئے گی اور یہی مشکل ہے۔ خیر تو سنئے جیمس پاگل ہے۔

ی م۔ پاگل!

ب۔ بالکل پاگل! ایسا پاگل جیسا اپریل میں خرگوش پاگل ہو جاتا ہے۔ ذرا آپ غور کیجئے گا آپ کو فوراً پتہ چل جائے گا۔

ی م۔ دیکھی تو ہے، لیکن غالباً اس کے خیالات کی وجہ سے وہ ایسا—

ب۔ (اس کے گھٹنے کو ہلکے سے چھو کر دباتے ہوئے تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ رہے) بس بس مسٹر پارچ بینکس انہیں خیالات سے میرا مطلب تھا۔ اور میری بات یاد رکھیئے گا کہ خیالات جب تک محض خیالات رہیں اس وقت تک تو کوئی حرج نہیں لیکن جب ان پر لوگ عمل کرنے لگیں تو معاملات بہت اہم ہو جاتے ہیں لیکن ان باتوں کو درمیان میں لانے کا ارادہ میرا نہ تھا (ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تاکہ یقین ہو جائے کوئی اور تو نہیں ہے پھر اس کے بعد پارچ بینکس کے کان کی طرف جھکتا ہے) آپ کو معلوم ہے اس نے آج سویرے مجھ سے کیا کہا؟

ی م۔ کیا!

ب۔ کہنے لگا، اور یقین مانیے کہ میں اتنا ہی سچ کہہ رہا ہوں جیسے یہ بات کہ میں اور آپ یہاں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ میں ایک بیوقوف آدمی ہوں اور تم ایک بدمعاش۔ میں اور ایک بدمعاش! ذرا دیکھئے تو، اور پھر مجھ سے اس بات پر ہاتھ ملایا گویا اس میں میری تعریف زیادہ ہے کیا آپ ان باتوں کو ہوش و حواس کی باتیں کہہ سکتے ہیں؟

م۔ (باہر سے پکارتے ہوئے اور دروازہ کھولتے ہوئے) اُن سب کے نام اور پتے لکھ لینا مس گارنٹ!

پ۔ (دور سے) بہت خوب مسٹر ماریل!

(ماریل اندر آ جاتا ہے۔ دفتر کے کاغذات ہاتھ میں ہیں)

ب۔ (پاہین سے الگ۔ دیکھو وہ آگیا ہے ذرا نگاہ رکھئے گا اور اس بات کا خیال رکھئے گا) (یکدم اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) جیمس! مجھے افسوس ہے کہ مجھے تم سے ایک شکایت کرنی پڑ رہی ہے۔ حالانکہ میں کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کرنا چاہئے بطور ایک فرض کے۔

م۔ خیریت کیا بات ہے!

ب۔ مسٹر م اس کی شہادت بھی دے سکتے ہیں (نہایت سنجیدگی سے) تمہاری وہ جوان سی چھوکری اپنے آپ کو اتنا بھول گئی کہ مجھے ایک کوسٹ، احمق اور گدھا کہنے لگی۔

م۔ (نہایت شدید مسرت سے) اچھا! خوب یہ پیازی نے کہا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرا زیادہ صاف گو اور بیباک ہے۔ وہ کسی بات کو دل میں روک ہی نہیں سکتی۔ بیچاری! اہا!

ب۔ (غصہ سے کانپتے ہوئے) اور کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس قسم کے لوگوں کی باتوں کو برداشت کروں گا!

م۔ اونہہ! لاحول ولا قوۃ! تم اس کا بالکل کچھ خیال ہی نہ کرو۔ بالکل سنو ہی نہیں (وہ میز کی طرف چلا جاتا ہے اور کاغذات کو دراز میں رکھ دیتا ہے)

ب۔ ہاں میں نے خیال تو واقعی نہیں کیا۔ میں ان معمولی باتوں سے بہت بلند ہوں لیکن یہ اس کی کچھ ٹھیک حرکت نہیں ہے۔ تم ہی بتلاؤ کہ بھلا یہ بھی کونسی حرکت ہے۔ کہاں تک درست ہے!

م۔ درستی اور نادرستی کا سوال تو خیر پادریوں کے لئے ہے عوام کے لئے نہیں لیکن کیا اس بات سے تمہیں تکلیف پہونچی ہے! میرا تو خیال نہیں ہے کہ تمہیں کوئی اذیت پہونچی ہوگی۔ اس لئے اب اس کا خیال ہی چھوڑ دو (وہ اس مضمون کو بس یہیں پر ختم کر دیتا ہے اور اپنے کھلے پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہے)

ب۔ (م سے الگ) میں نے آپ سے کہا نہ تھا! بالکل اور قطعی پاگل (وہ میز کے پاس جاتا ہے اور بھوکے آدمیوں کی طرح ایک طرح کے گرسنہ لہجہ میں پوچھتا ہے) کھانے میں کتنی دیر ہے جیمس!

م۔ ابھی دو گھنٹہ تک تو تیار ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔

ب۔ (صبر کے لہجہ میں) اچھا تو پھر مجھے جب تک کوئی اچھی سی کتاب دیدو۔ میں وہاں آتشدان کے قریب پڑھوں گا۔ ساتھی بھی عمدہ ہے۔

م۔ کس طرح کی کتاب چاہئے کوئی واقعی عمدہ کتاب!

ب۔ (ایک دم شدت سے انکار کرکے اٹھتے ہوئے) ارے نہیں۔ بس یونہی کوئی دلچسپ کتاب۔ بس وقت کاٹنے کے لئے (ارل میز پر سے ایک تصویردار اخبار اٹھاتا ہے اور اسے دیدیتا ہے وہ اسے بہت نیازمندی سے

قبول کر لیتا ہے (شکریہ جمیس: (جمیس ان کے قریب اپنی بڑی کرسی پر چلا جاتا ہے اور وہاں نہایت اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے اور پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

م۔ (دیکھتا بھی جا رہا ہے) آئیندہ تم لوگوں سے باتیں کرنے کے لئے بس اب آتی ہی ہوگی۔ پڑھانے سے تو اسے چھٹی مل گئی ہے لیکن وہ ابھی لیمپوں میں تیل بھر رہی ہے۔

ی م۔ (نہایت ہی وحشت زدہ ہو کر چونک پڑتے ہوئے) لیکن اس سے تو اس کے ہاتھ میلے ہو جائیں گے۔ ماریل! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا یہ نہایت شرمناک بات ہے میں جاتا ہوں اور خود بھر دوں گا۔ (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

م۔ بہتر یہ ہے کہ تم نہ جاؤ (ی م ایک دم رک جاتا ہے) کیونکہ تم سے بجائے اس کے وہ میرے بوٹ صاف کرانے لگے گی تاکہ میں اپنے صبح کے اس کام سے بچ جاؤں۔

ب۔ (بہت ناپسندیدگی سے) جمیس کیا اب تم نوکر نہیں رکھتے؟

م۔ ہاں ہے تو لیکن وہ غلام نہیں ہے۔ پھر بھی گھر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے پاس تین چار نوکر موجود ہوں یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ پراز ی اور میں ناشتہ کے بعد اپنے کام کی باتیں بھی کرتے جاتے ہیں اور کپڑے بھی دھوتے جاتے ہیں جب دو آدمی ہوتے ہیں تو کپڑے دھونے میں کوئی دقت معلوم نہیں ہوتی۔

ی م۔ (بے چین ہو کر) تو اس سے کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ ہر عورت مس گارنٹ کی طرح گھٹیا ہو جائے۔

ب۔ (دروے کر) ہاں بس، یہ ایک بات کہی مسٹر ی م۔ گھٹیا بالکل مناسب لفظ ہے۔ گھٹیا وہ واقعی ہے۔

م۔ (خاموشی اور سنجیدگی سے) مارچ بینکس!

ی م۔ کہئے!

م۔ تمہارے والد کے پاس کتنے نوکر ہیں؟

ی م۔ (جھنجلا کر) اونہہ مجھے نہیں معلوم (صوفے کی طرف بڑھ جاتا ہے گویا چاہتا ہے کہ ماریل کے سوالات سے جتنا دور ہو جائے اتنا اچھا ہے اور نہایت رنج والم کی حالت میں جا کر بیٹھ جاتا ہے تیل ہی کا خیال رہ رہ کر آتا ہے)

م۔ (بہت سنجیدگی سے) اس قدر کہ تمہیں معلوم نہیں (اور زیادہ بڑھاتے ہوئے) جب کوئی ایسا کروہ کام کرنا ہوتا ہو تو تم بس گھنٹی بجا دیتے ہو اور وہ کام دوسرے کے سر ڈال دیتے ہو کیوں نا!

ی م۔ اونہہ، بیکار مجھے پریشان نہ کرو۔ تم تو گھنٹی بھی نہیں بجاتے بلکہ تمہاری بیوی کی خوبصورت انگلیاں وہاں تیل میں بھیگتی رہتی ہیں اور تم خود یہاں نہایت اطمینان سے کرسی پہ بیٹھے ہوئے لکچر دیتے رہتے ہو۔ لکچر ہی لکچر۔ شیطان کی آنت لکچر۔ الفاظ، الفاظ، الفاظ!

ب۔ (اس جواب سے بے انتہا مسرور ہوتے ہوئے) ہا ہا یہ بات کہی، بہت عمدہ (خوشی سے چہکتے ہوئے) کہو جیمس! اب تم کیسے پھنسے!

(کینڈڈا اندر آ جاتی ہے آگے پیش بند خوب صاف لگا ہوا ہے۔ پہننے والا لیمپ خوب صاف کیا ہوا ہے بتی کٹی ہوئی لیمپ تیل سے پر ہو میز پر بارپل کے نزدیک وہ اسے رکھ دیتی ہے تاکہ اسے جلائے)

ک۔ (اپنی انگلیوں کی پوروں اپنی ناک صاف کرتے ہوئے) او جیمس! اگر تم رکو تو میں تمہیں تمام لیمپ سپرد کر دوں

ی م۔ میں یہاں صرف اسی شرط سے رک سکتا ہوں کہ تمام بھدے کام تم میرے سپرد کر دو۔

ک۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے، شاباش! لیکن پہلے میں دیکھ تو لوں کہ تم کیسے کام کرتے ہو (ماریل کی طرف رخ کرکے) جیمس! تم نے گھر کا انتظام میری غیر موجودگی میں کچھ اچھا نہیں رکھا۔

م۔ کیوں، ڈیر کیا میں نے نہیں کیا، کیا بات نہیں ہوئی؟

ک۔ (بچ کی پریشانی سے) میرے ذاتی پسندیدہ برش سے جوتے صاف کرنے کا کام لیا گیا ہے۔ (ی م کے منہ سے ایک سخت آہ نکلتی ہے۔ برگیس گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے کنڈیڈا صوفے کی طرف دوڑ جاتی ہے) کیا بات ہے۔ کیا تمہاری طبیعت اس وقت ناساز ہے۔ کیا تم کچھ علیل ہو؟

ی م۔ نہیں، کچھ بیمار نہیں، صرف دہشت، دہشت، دہشت! (وہ اپنا سر اپنے ہاتھوں پہ رکھ لیتا ہے)

ب۔ (مضطرب ہو کر) کیا کوئی دورہ ہوا مسٹر ی م۔ یہ بہت برا ہے آپ کی سی عمر یا کسی طرح اس سے ضرور نجات حاصل کیجیے۔

ک۔ (اطمینان دلانے کے لیے) دفعہ پاپا! آپ کی بھی کیا باتیں ہیں، یہ محض شاعرانہ دورہ ہے کیوں نا جیمس!

لاسے سلاتے ہوئے)

ب۔ (شرمندہ ہوکر آئیں: شاعرانہ دورہ! اچھا: میں معافی چاہتا ہوں مسٹر یوجین (اپنا سر پیرا تشدان کی طرف کرلیتا ہے اور ابھی جلد بازی پر متاسف ہے)

ک۔ کیا بات ہوئی یوجین! میرا برش! (وہ کانپ جاتا ہے) او نہ تو اس میں کیا بات ہے (اس کے قریب بیٹھ جاتی ہے) کیا تم سے پسند نہ کروگے کہ تم ایک نہایت اچھا سا برش بہت خوبصورت پیش کر جس کی پشت ہاتھی دانت کی ہو اور جس میں سیپ جڑی ہو۔

ی م۔ (آہستگی اور ترنم سے لیکن افسوسناک لہجہ میں) نہیں برش نہیں بلکہ ایک کشتی۔ ایک چھوٹی سی کشتی جس میں ہم تم دونوں بیٹھ کر اس دنیا سے الگ کوسوں دور چلے جائیں۔ ایک ایسی جگہ جہاں شفاف سنگ مرمر کی چٹانیں ہوں جن کو باران رحمت سے غسل دیا جاتا ہو اور جنھیں نیر درخشاں سکھاتا ہو۔ جہاں کے مخملیں سبزہ زاروں کی صفائی نسیم سحری کرتی ہو۔ یا پھر ایک ایسا تخت رواں ہو جس پہ ہم تم دونوں بیٹھ کر آسمان کی طرف اُڑ جائیں جہاں کے تارے ہمارے لیمپ ہوں گے اور جن کو روزانہ مٹی کے تیل سے بھرنے کی ضرورت نہ ہوگی (ترشی سے) اور جہاں کچھ کرنا نہ ہوگا سوائے اس کے کہ کاہل، خود غرض اور بیکار بنے بیٹھے رہو۔

ک۔ او نہ جیمس! تم نے اس کی شاعری کو کیوں تباہ کردیا۔

ی م۔ (آتش بجاں) ہاں، کاہل خود غرض اور بیکار! یعنی خوبصورت آزاد اور خوش۔ کیا ہر شخص یہ باتیں اپنے دل و جان سے نہیں چاہتا اس عورت کے ساتھ جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ میری معراج تخیل تو یہی ہے تمہاری کیا ہے؟ اور تمہارے جیسے ان تمام لوگوں کی جو ان بھدے بدصورت مکانوں کی قطاروں میں رہتے ہیں! لکچر، وعظ اور برش! تمہارا معراج تخیل تو بس یہی ہے کہ تم وعظ دیا کرو اور تمہاری بیوی جھاڑو دیا کرے!

ک۔ (متانت سے) یوجین! وہ بھی اپنے جوتے خود صاف کرتا ہے اور اس الزام کے بدلے کل تم کو انھیں صاف کرنا پڑے گا۔

ی م۔ او نہ! جوتوں کی باتیں نہ کرو۔ تمہارے مرمریں پیر پہاڑوں پر بھی خوبصورت معلوم ہوں گے۔

ک۔ لیکن میرے پیرا سیکنی روڈ پر بغیر جوتوں کے خوبصورت نہ معلوم ہوں گے۔

ب۔ (وہین کے خلاف باتیں سن کر) ارے کینڈی یہ کیا خلاف تہذیب باتیں کر رہی ہو۔ مسٹر وہین اس قسم کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں تم پھر انھیں پریشان کر رہی ہو مجھے ڈر ہے کہ پھر انھیں دہشت کا دورہ پڑ جائے میرا مطلب ہے شاعرانہ دورہ!

(ماریل خاموش ہے. بظاہر وہ اپنے خطوں میں مشغول ہے لیکن دراصل وہ اس ادھیڑبن میں ہے کہ اس کے مضبوط سے مضبوط اور پختہ سے پختہ جملے اس چھوکرے کے سامنے بیکار جا رہے ہیں چنانچہ ایسے شخص سے خوفزدہ ہونے کے خیال سے جس کو وہ اپنا چوزا سمجھا تھا تکلیف ہونے لگتی ہے. مس گارنٹ ایک تار لیکر اندر آتی ہے)

پ۔ (ماریل کو تار حوالہ کرتے ہوئے) جوابی ہے. باہر ڈاکیہ جواب کے لئے کھڑا ہے (اپنی مشین پر جا کر بیٹھ جاتی ہے کسے) مسز ماریل (میریا) باورچی خانہ میں آپ کا انتظار کر رہی ہے (ک، اٹھ کھڑی ہوتی ہے) پیاز آگئے ہیں

ی م۔ (لرزتے ہوئے) پیاز!

ک۔ ہاں پیاز! اور وہ بھی کچھ اچھے قسم کے ہسپانوی پیاز نہیں معمولی چھوٹے قسم کے امید ہے کہ تم ان کے چھیلنے میں مجھے مدد دو گے اچھا ادھر آؤ۔

(وہ اس کی کلائی پکڑتی ہے اور دوڑاتی ہوئی لے جاتی ہے. برگیس متوحش اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور آتشدان کے پاس مبہوت کھڑا رہ جاتا ہے ان دونوں کی طرف تکتے ہوئے)

ب۔ کینڈی کو نہ چاہئے تھا کہ ایک نواب زادے کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرے۔ یہ بہت زیادتی ہے۔ جیمس دیکھو تو کیا تم نے اس سے پیشتر اس طرح کی تعجب انگیز بات دیکھی ہے!

م۔ (تار لکھنے میں مصروف ہے) مجھے نہیں معلوم

ب۔ (دردمندی سے) اس کی باتیں بڑی پیاری ہیں. مجھ کو شاعری تو ہمیشہ سے پسند رہی. کینڈی بھی مجھ ہی کو پہچانتی ہے جب کوئی اتنی ہوگی (ہاتھ کو دو میں فٹ اونچا کرتے ہوئے) تو مجھ سے کہانیاں کہلوایا کرتی تھی۔

م۔ (مشغول) اچھا خوب (تار پر جواب لگاتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)

پ۔ لیکن کیا تم وہ کہانیاں خود اپنے دماغ سے سوچ کر نکالتے تھے ؟

(برگمیں اسے جواب دینا حقیر بات سمجھتے ہوئے نہایت متکبرانہ حقارت کا رویہ اختیار کر لیتا ہے)

پ۔ (آہستگی سے) میرا خیال ہے تم ایسا کر ہی نہیں سکے۔ خیر بر سبیل تذکرہ میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کر دوں۔ آپ یاجین کی اس قدر پرستش کر رہے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ وہ پاگل ہے

ب۔ پاگل ! کیا وہ بھی !!

پ۔ بالکل پاگل ! بالکل مارچ کے مست خرگوش کی طرح۔ میں بتلاتی ہوں ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ تمہارے آنے سے قبل اس نے مجھے بے انتہا ڈرا دیا تھا۔ کیا تم نے ان تمام عجیب باتوں کا خیال نہیں کیا جو وہ بکتا رہتا ہے۔

ب۔ اچھا تو شاعرانہ دورے کا یہی مطلب ہے۔ درا صل یقین مانناکہ اکثر ایک دو دفعہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ کچھ پاگل سا ہے (وہ دروازہ تک ٹہلتا، سوچتا ہوا جاتا ہے۔ بہ آواز بلند) درا صل یہ اچھا سا پاگل خانہ ہے جہاں سوائے تمہارے کسی کی کوئی خبر لینے والا بھی نہیں ہے

پ۔ (جب وہ اس کے پاس سے گذرتا ہے) ہاں، اگر خدا نخواستہ آپ پر کسی قسم کا حادثہ ہو گیا تو کس قدر باعث افسوس بات ہو گی۔

ب۔ (بڑھتے ہوئے) خیر و مجھ پر، میرے اوپر آپ کسی قسم کے جملے نہ کسیئے۔ ذرا میں باغیچہ میں سگار پینے جا رہا ہوں اپنے مالک سے کہدینا۔

پ۔ (چڑاتے ہوئے) آخاہ !

(لیکن قبل اس کے کہ برگمیں کوئی جواب دے، مارل واپس آ جاتا ہے)

ب۔ (کمزور لہجہ میں) مجھیں، میں ذرا باغ میں سگار پینے جا رہا ہوں۔

م۔ (تیزی سے) ہاں، ہاں ضرور ! (ایک تھکے ہوئے شیر کی طرح برگمیں باہر چلا جاتا ہے۔ مارل میز پر کھڑا ہوتا ہے اور اپنے اخبارات کو الٹتے پلٹتے پراز رنج سے کچھ تفریح کے لہجہ میں اور کچھ یونہی مخاطب ہوتا ہے) اس پراز ی تم نے آخر میرے خسر کے نام کیوں لکھے !

پ۔ (چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ تیزی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ کچھ ذرہ کچھ افسوس کا اظہار ہیں!) (رو پڑی)

م۔ (ہمدردانہ مسرت سے اس کی طرف رخ کرکے میز پر جھکتے ہوئے اور تسکین دیتے ہوئے) اسے ہوگا، ہوگا جانے بھی دو، میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔ پیاسی! وہ واقعی کھوسٹ، گدھا تو ہے ہی کیوں نا!

(رونے کی ایک ہچکی آئی اور وہ دروازے کی طرف بھاگی، زور سے دروازہ بند کیا اور باہر غائب ہو گئی) مارل نے اپنا سر ہلایا گویا افسوس کیا اور بادل ناخواستہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا جیسے بہت تھکا ہوا ہو اور ذمہ داریوں میں گھرا ہوا ہو۔ کینڈڈا اندر آتی ہے۔ اس نے گھر کا سب کام کاج ختم کر دیا ہے۔ پیش بند اب اتر گیا ہے ارل کی تھکی ہوئی حالت کو فوراً محسوس کرتی ہے اور نہایت خاموشی سے آکر ملاقاتی والی کرسی کے نزدیک کھڑی ہو جاتی ہے اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگتی ہے منہ سے کچھ نہیں بولتی)

م۔ (اوپر نظر اٹھاتے ہوئے لیکن قلم اب بھی انگلیوں میں ہے گویا لکھنے کے لئے اب بھی تیار رہے) کیا ہے! یوجین کہاں ہے؟

ک۔ نل پر اپنے ہاتھ دھو رہا ہے وہ بڑا اچھا باورچی ہو سکتا ہے لیکن ابھی میریا سے ڈرتا ہے۔

م۔ (مختصراً) اچھا! ہاں، بیشک (پھر لکھنا شروع کر دیتا ہے)

ک۔ (اس کے قریب جاتے ہوئے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر آہستہ سے رکھ کر اسے روکتے ہوئے) بس اب ادھر آؤ ڈیر، ذرا میں تمہیں دیکھوں تو (وہ اپنا قلم چھوڑ دیتا ہے اور خود کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ اسے اٹھاتی ہے اور میز سے کچھ اُدھر لے جاتی ہے برابر تنقیدی نظر سے اس کی طرف دیکھے جاتی ہے) ذرا اپنا چہرہ روشنی کی طرف تو کرو۔ (وہ اسے کھڑکی کے رخ کھڑا کر دیتی ہے) اوہ! میرا پیارا آج کچھ ٹھیک نہیں۔ اس نے آج حد سے زیادہ کام کر لیا ہے۔

م۔ نہیں تو وہی حسب معمول روزانہ کے اتنا۔

ک۔ نہیں اس کا چہرہ آج زرد ہے مرجھایا ہوا۔ تھکا ہوا۔ بوڑھوں کا سا۔ (ارل کی اداسی اور گہری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے جملوں کو اور بھی تیز کر دیتی ہے) ادھر آنا (اس کو آرام کرسی کی طرف کھینچتے ہوئے) بس اب آج کا کام تم بہت کر چکے۔ بس اب ختم کرو۔ بقیہ پراز ی ختم کر دے گی۔ اب ذرا مجھ سے باتیں کرو۔

م۔ لیکن ـــــ

ک۔ نہیں (منہ کرتے ہوئے) میری طبیعت باتیں کرنے کو چاہتی ہے (وہ اسے بٹھا دیتی ہے اور خود بھی قالین پر پیچھے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی ہے) ہاں بس اب (اس کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے) تم اچھے لگنے لگے ہو۔ یہ آخر میں کہتی ہوں کہ تم ہر روز رات کو وعظ دلکچر دینے کیوں چلے جاتے ہو؟ مجھے مشکل سے ایک ہفتہ میں ایک شام مل پاتی ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ بالکل ٹھیک ہے اور بہت نیک کام لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا یعنی وہ لوگ جن سے تم یہ سب باتیں کرتے ہو ذرا بھی تو تمہاری باتوں کو خیال میں نہیں لاتے تمہاری بات وہ مان لیتے ہیں لیکن ان کے ماننے سے کیا فائدہ جب وہ اس پر عمل ہی نہیں کرتے بلکہ ادھر تمہاری سنتے ہیں اور مان لیتے ہیں اور ادھر تھوڑی ہی دیر بعد جہاں تمہاری پیٹھ پھری بالکل اس کے خلاف کرنے لگتے ہیں۔ تم اپنے سینٹ ڈومینک ہی کے لوگوں کو دیکھو آخر وہ مذہب کی باتیں کیوں ہر اتوار کو سننے آتے ہیں؟ محض اسی لئے کہ ہفتہ کے چھ دنوں میں وہ روپیہ اور کاروبار میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ ہفتہ میں ایک دن چاہتے ہیں کہ یہ سب باتیں بھول جائیں اور ایک روز کم سے کم آرام کرلیں۔ تو بس سمجھے وہ اسی آرام کے لئے آتے ہیں تاکہ تر و تازہ ہو کر پھر اور دھڑلے سے روپیہ پیدا کریں۔ گویا اس طرح روکنے کی بجائے تم انہیں اور سگ دنیا بناتے ہو۔

م۔ (پر زور سنجیدگی سے) کینڈڈا تم جانتی ہو کہ اکثر میں ان کو اس امر پر زور دار فہمائش بھی تو کر دیا کرتا ہوں لیکن اگر وہ محض تفریح ہی کے لئے آتے تو اور بھی جگہیں ان کے لئے کھلی تھیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور پُرلطف! آخر کوئی بات تو ہو گی کہ وہ سینٹ ڈومینک ہی کو اتوار کے دن دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔

ک۔ نہیں، خراب جگہیں اس دن کھلی نہیں ہوتیں اور اگر کھلی بھی ہوتیں تو بھی وہ نہیں چاہتے کہ انہیں کوئی ان مقامات پر دیکھے۔ اس کے علاوہ جیمس پیارے تم وعظ اس عمدہ طریقہ سے دیتے ہو کہ وہ ان کے لئے اتنی ہی تفریح کا باعث ہوتا ہے جتنا کوئی کھیل تماشا۔ اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ عورتیں تمہارا وعظ سننے اس قدر جوق جوق کیوں آتی ہیں؟

م۔ (گھبرا کر) کینڈڈا!

ک۔ ہاں مجھے معلوم ہے، سیدھے سادے پیارے موریل تم سمجھتے ہو کہ یہ سب تمہاری سوشلزم اور مذہب کی وجہ سے ہے اگر ایسا ہوتا تو بجائے تمہیں بار بار دیکھنے آنے کے وہ اس پر عمل کرتیں جو تم ایک دفعہ کہہ دیتے حقیقت یہ ہے کہ ان سب کو پراسی والی شکایت ہے۔

م۔ پراسی والی شکایت! کیا مطلب ہے تمہارا کینڈڈا!

ک۔ ہاں، پراسی اور ان تمام سکریٹریوں کو جنھیں تم ملازم رکھ چکے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ پراسی اتنا سب کام ہم لوگوں کا کر دیتی ہے آخر کس لئے! ٹائپ کرتی ہے۔ چیزیں صاف کرتی ہے اور تمام ادنی کام کر دیتی ہے محض چھ شلنگ فی ہفتہ پر۔ حالانکہ شہر میں وہ اس سے زیادہ پاتی تھی جبیں قصہ اصل میں یہ ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا کام کر دیتی ہے۔ اسی طرح لکچر سننے والی تمام عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں۔ اور تم کو اپنے وعظ سے محبت ہے کیونکہ تم اسے نہایت خوبصورتی سے ادا کرتے ہو میرے سیدھے سادے پیارے موریل تم سمجھتے ہو کہ یہ سب ان کا یہ اشتیاق تمہارے نظریہ ربانی بادشاہت کی وجہ سے ہے۔ ہاں تو بھی تھوڑی دیر کے لئے اسی میں یقین کرنے لگتی ہیں سمجھے میرے نادان۔

م۔ کینڈڈا کیا خوفناک باتیں کر رہی ہو! کس قدر روح فرسا! مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟ یا یہ تو نہیں ہے کہ شاید تم کو حسد ہوتا ہو۔

ک۔ (عجیب طرح سوچتے ہوئے) ہاں مجھ کو واقعی بعض اوقات تھوڑا سا حسد ہوتا ہے۔

م۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) پراسی سے؟

ک۔ (ہنستے ہوئے) ارے نہیں، نہیں نہیں! اسی خاص شخص سے نہیں بلکہ کسی اور شخص کی طرف سے حسد ہوتا ہے جس سے کہ اتنی محبت نہیں کی جاتی جتنی کہ اس سے کی جانا چاہئے۔

م۔ میرے متعلق؟

ک۔ تمہارے متعلق: نہیں، تم تو بلکہ محبت اور پرستش سے خراب کر دئے گئے ہو۔ تمہیں تو محبت اتنی ملتی ہے جتنی تمہارے لئے مفید نہیں۔ میرا مطلب یوجین سے ہے۔

م۔ (چونک کر) یوجین!

ک۔ یہ ناانصافی معلوم ہوتی ہے کہ سب محبت صرف تمہاری طرف چلی جائے اور اسے کچھ نہ ملے۔ حالانکہ اسے تم سے زیادہ محبت کی ضرورت ہے (ماریل کے بدن میں باوجود ضبط کے بھی ایک کپکپاہٹ سی دوڑ جاتی ہے) کیا بات ہے؟ کیا میری باتوں سے تم کچھ پریشان ہو رہے ہو؟

م۔ (جلدی سے) نہیں بالکل نہیں۔ (اس کی طرف تکلیف دہ جوش سے دیکھتے ہوئے) تم جانتی ہو کہ مجھے تم پر بالکل اعتماد ہے کینڈڈا۔

ک۔ اللہ رے غرور! کیا تم کو اپنی کششوں پر اس قدر ناز ہے؟

م۔ کینڈڈا تم مجھ کو سخت تکلیف دے رہی ہو۔ میں نے اپنی کششوں کا کبھی خیال نہیں کیا۔ مجھے ہمیشہ تمہاری نیکی، محبت اور عفت و عصمت کا خیال البتہ رہا ہے اور اسی میں مجھے اعتماد رہا ہے اور رہتا ہے۔

ک۔ اوہ مجھ سے یہ کیا فضول کی باتیں کرتے ہو۔ تم بس پادری ہی ہو۔ پورے پادری۔

م۔ (اس کی طرف سے منہ پھیر کر دلی تکلیف سے) یہی یوجین بھی کہتا ہے۔

ک۔ (نہایت اشتیاق سے موریل کی طرف جھکتے ہوئے، اس کے گھٹنوں پر دونوں بازو رکھ کر) یوجین ہمیشہ صحیح بات کہتا ہے۔ وہ نہایت عجیب و غریب لڑکا ہے جتنے عرصہ میں باہر رہی میرا اشتیاق اس کی طرف بہت بڑھتا ہی گیا۔ تمہیں معلوم ہے جیمس، حالانکہ وہ خود نہیں جانتا لیکن وہ مجھ پر عاشق ہو جانے کے لئے بری طرح تیار ہے؟

م۔ (سنجیدگی سے) اچھا! لیکن اسے خود نہیں معلوم کیا واقعی؟

ک۔ بالکل نہیں! (وہ اپنا ہاتھ اس کے گھٹنوں پر سے ہٹا لیتی ہے اور انھیں اپنی گود میں رکھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے) لیکن ایک زمانہ آئے گا کہ اسے معلوم ہو جائے گا یعنی جب وہ بڑا ہو جائے گا اور تمہاری طرح تجربہ کار ہو اور تب اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں ضرور یہ جانتی ہوں گی۔ میں کہتی ہوں کہ تب وہ میرے متعلق کیا خیال کرے گا؟

م۔ کوئی خاص بات نہیں۔ وہ تمہیں برا ہرگز نہ خیال کرے گا۔

ک۔ (شک سے) یہ دوسری بات پر منحصر ہے۔

م۔ (گھبرا کر) کیا انحصار؟

ک۔ (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) ہاں، ہاں! اس بات کا انحصار تو اس بات پر ہوگا کہ اس پر کیا گذرتی ہے (وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے) اس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اس بات کو کیسے جانتا ہے کہ دراصل عشق کیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُس عورت پر منحصر ہے جو اُس کو عشق سکھائے۔

م۔ (بالکل نہ سمجھتے ہوئے) ہاں، نہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

ک۔ (سمجھاتے ہوئے) اگر اس نے عشق کسی اچھی عورت سے سیکھا تب تو ٹھیک ہے۔ پھر وہ مجھے معاف کردے گا

م۔ معاف؟

ک۔ لیکن اگر فرض کرو کہ اس نے عشق کسی خراب قسم کی عورت سے سیکھا جس طرح عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں خصوصاً شاعر قسم کے لوگ جو ہر عورت کو فرشتہ سمجھتے ہیں۔ فرض کرو اگر محبت کی قدر اسے اُس وقت معلوم ہوئی جب وہ اسے برباد کر چکا ہو اور اپنی ناواقفیت کی بنا پر خود کو تباہ کر لیا ہو تب بھی کیا وہ مجھے معاف کردے گا؟ تمہارا کیا خیال ہے؟

م۔ معاف! ارے بھئی کس بات پر تمہیں معاف کردے گا؟

ک۔ (محسوس کرتے ہوئے کہ وہ کس قدر بیوقوف ہے اور کچھ ناامید ہو کر پھر بھی نہایت ہمدردانہ لہجہ میں) ارے کیا تم نہیں سمجھے؟ (وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا ہے۔ وہ اس کی طرف پھر مڑ جاتی ہے اور نہایت ہی محبت سے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے) میرا مطلب یہ ہے کہ کیا مجھے وہ اس بات پر معاف کردے گا کہ میں نے خود اسے کیوں نہیں سکھایا اور اپنی نیکی، عفت و عصمت اور پاکی کی وجہ سے جیسا کہ تم کہتے ہو خراب قسم کی عورتوں پر اسے چھوڑ دیا۔ جیسے تم میری اچھائی اور پاکدامنی کی باتیں کرتے ہو کس قدر ناسمجھی کی بات ہے۔ میں ان دونوں چیزوں کو بخوشی یوجین کو دیدیتی اگر کوئی بات مانع نہ ہوتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں کسی غریب محتاج فقیر کو جو سردی سے مر رہا ہوتا اپنا دوشالہ دیدیتی جیسے تم اپنے لئے میری محبت پر یقین رکھو کیونکہ اگر یہ اعتبار تمہارا میری طرف سے جاتا رہا تو پھر ان خطبات اور دعظوں میں قطعی مجھے دلچسپی نہ رہے گی بعض لفظی گورکھ دھندے جن سے تم ہر روز خود کو نیز دوسروں کو دھوکا دیا کرتے ہو (اتنا کہکر وہ اسٹو کو چومتی ہے)

م۔ اُس کے الفاظ!

ک۔ (اٹھتے ہوئے رک کر) کس کے الفاظ؟

م۔ یوجین کے!

ک۔ (خوش ہوکر) وہ ہمیشہ یہی بات کہتا ہے۔ وہ تم کو، مجھ کو اور پراسی سب کو خوب اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے لیکن پیارے تم کچھ نہیں سمجھتے (ہلنے لگتی ہے اور دلدہی کے لئے اس کا منہ چوم لیتی ہے، وہ منہ ہٹا لیتا ہے گویا جیسے کوئی چیز بھونک دی گئی ہو اور اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

م۔ آخر، یہ تم نے پیار کس طرح کر لیا۔ اُف کینڈڈا (کمینے سے) بہتر یہ تھا کہ تم میرے دل میں پگھلتا ہوا لوہا ڈال دیتیں بجائے اس طرح پیار کرنے کے۔

ک۔ (متعجب ہوکر) پیارے میرے۔ کیا بات کیا ہوئی؟

م۔ (مجنونانہ ہٹاتے ہوئے) مجھے نہ چھوؤ، مجھ سے الگ رہو۔

ک۔ جیمس!!!

(اتنے میں یوجین اور برگیس اندر داخل ہوتے ہیں لیکن دروازہ کے قریب ہی رک جاتے ہیں ہکا بکا)

ی م۔ کیا کوئی بات ہوگئی؟

م۔ (ایک دم سفید لیکن طبیعت پر فولادی قابو رکھتے ہوئے) نہیں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ آج صبح یا تو تمہاری باتیں سب صحیح تھیں یا کینڈڈا پاگل ہوگئی ہے۔

ب۔ (بہت ہی زور سے) کیا! کینڈڈی بھی پاگل!! ارے، ارے ارے (وہ گذرتا ہوا، بڑبڑاتا، آتشدان کے پاس چلا جاتا ہے اور اپنے پائپ کی راکھ آتشدان کے سیخوں پر جھاڑنے لگتا ہے)

(مارل تنگ آکر اپنی میز پر بیٹھ جاتا ہے آگے کو جھک کر تاکہ اپنے چہرے کو چھپالے۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیتا ہے تاکہ مستحکم رہیں)

ک۔ (بیس سے مطمئن ہوکر اور ہنستے ہوئے) تم کو محض میری بات کا صدمہ ہوا ہے کیوں نا؟ تم سب غیر رسمی لوگ بھی کس قدر رسمی ہوتے ہو (نہایت خوشی سے کرسی کے ہتھے پر بیٹھ جاتی ہے)

ب ۔ کینڈی! ذرا سنبھل کر باتیں کر۔ آخر مسٹر وہین تیری نسبت کیا خیال کریں گے۔

ے ۔ جیمس نے مجھے ہمیشہ اپنے متعلق خود غور وفکر کرنا سکھایا ہے اور یہ بھی کہ کبھی اس بات سے نہ ڈروں کہ دوسرے میری نسبت کیا خیال کرتے ہیں۔ اور یہ اس وقت تک تو ٹھیک رہتا ہے جب تک میں بالکل اس کے خیالات کے مطابق سوچتی رہوں لیکن دیکھو میں نے ذرا ہی مختلف سوچا تھا کہ صورت دیکھ لو۔ ذرا دیکھو تو حالت! (وہ جیمس کی طرف بڑی خوش طبعی سے اشارہ کرتی ہے)

(یوہین دیکھتا ہے اور دفعتاً اپنے ہاتھ سے اپنا دل تھام لیتا ہے گویا ایک دم ٹیس اٹھی ہو۔ وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس صورت سے جیسے کوئی المیہ سین دیکھ رہا ہو)

ب ۔ (آتشدان کے پاس سے) جیمس آج تم قدرے سست نظر آرہے ہو۔ رونق کے سے چست نہیں۔

م ۔ (ایک ہلکے قہقہہ کی کوشش کرتے ہوئے حالانکہ وہ قہقہہ رونے کی ہچکی معلوم ہوتا ہے) نہیں تو میرا خیال تو ایسا نہیں۔ خیر مجھے بہت افسوس ہے کہ مجھے اس کا احساس نہ ہوا کہ آپ صاحبان کو تکلیف دے رہا ہوں (خود کو سنبھالتے ہوئے) خیر خیر۔ خیر۔ خیر۔ خیر! (نہایت مضبوط ارادے کے ساتھ بظاہر خوش ہو کر وہ اپنے کاغذات لیکر پھر بیٹھ جاتے ہیں)

ک ۔ (صوفے کے پاس جاتے ہوئے اور یوہین کے پاس بیٹھتے ہوئے۔ اب بھی اسی مذاق اور تمسخر کی حالت میں) یوہین کیوں تم اس قدر افسردہ کیوں ہو۔ کیا پیاز چھیلنے سے آنسو نکل آئے؟

ی م ۔ (چپکے سے) یہ تمہارا ظلم ہے اور ظلم سے مجھے نفرت ہے۔ میں یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ ایک شخص دوسرے کو اتنی تکلیف دے۔

ک ۔ (اس پر طنز سے دست شفقت پھیرتے ہوئے) بیچارے! کیا میں نے واقعی ظلم کیا؟ کہ ان چھوٹے سرخ پیازوں کو تم سے ترشوایا؟

ی م ۔ (سنجیدگی سے) اونہہ! یہ بات نہیں۔ یہ نہیں میرا مطلب اپنی ذات سے نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے اُسے بے انتہا تکلیف دی ہے۔ اس کے درد اور اس کی تکلیف کو میں خود اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہاری خطا نہیں یہ ایک بات تھی جو آخر کبھی نہ کبھی تو ضرور ہو کر رہتی لیکن اس کا مذاق نہ اڑانا چاہیئے۔ خدا اس کو یوں ہلکا بنا کر ہنسی میں اڑانا چاہتے ہیں کانپ جاتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ تم اس کو یہا

اور ماں قدر اذیت دیتی ہو اور اس پر ہنستی ہو۔

ک۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) میں اور جیس کو اذیت پہونچاؤں! کیا فضول کی باتیں کرتے ہو یوجین۔ تم کس قدر مبالغہ سے کام لے رہے ہو بیوقوف (وہ اٹھتی ہے اور میز کی طرف جاتی ہے کچھ متفکر اور قدرے پریشان ہو کر) بس اب زیادہ کام نہ کرو پیارے ذرا آؤ اور ہم لوگوں سے باتیں کرو۔

م۔ (محبت سے لیکن تلخ لہجہ میں) نہیں نہیں میں بات چیت کر ہی نہیں سکتا۔ میں تو صرف وعظ دے سکتا ہوں۔

ک۔ (اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے) اچھا خیر آؤ وعظ ہی دو

ب۔ (شدت سے انکار کرتے ہوئے) نہیں کینڈی، ہٹاؤ بھی وعظ وغیرہ۔

(لیکسی ل گھبرایا ہوا اندر آتا ہے صورت سے معلوم ہوتا ہے کسی اہم کام کے لئے آیا ہے)

ل۔ (کینڈا سے جلدی ہاتھ ملاتے ہوئے) مزاج تو اچھا ہے مسز ماریل آپ کی واپسی سے بے حد مسرت ہوئی۔

ک۔ شکریہ لیکسی۔ یوجین کو تم جانتے ہوگے؟

ل۔ ہاں! ہاں! کہیا مزاج ہے آپ کا مسٹر یوجین؟

ی م۔ بالکل اچھا ہوں شکریہ۔

ل۔ (ماریل سے) میں ابھی سینٹ میتھیو انجمن (گیلڈ) سے چلا آرہا ہوں۔ وہ لوگ آپ کے تار کی وجہ سے نہایت ششش و پنج میں ہیں۔

ک۔ جیمس! تم نے آخر کاہے کے متعلق تار دیا؟

ل۔ (کینڈا سے) آج آپ کا ان لوگوں کے وہاں وعظ تھا اور چنانچہ انھوں نے میر اسٹریٹ میں ایک بڑا سا ہال لے رکھا تھا۔ اشتہار وغیرہ میں بیحد روپیہ خرچ کیا تھا لیکن عین وقت پر آپ کا تار پہونچا کہ آپ نہ آسکینگے ان لوگوں پر تو گویا بجلی ہی گر پڑی۔ سب کیا کرایا بس خاک میں ملا جا رہا ہے۔

ک۔ (تعجب و پریشان ہو کر) جیمس کو کچھ ہو گیا ہے کیا؟ لکچر کا وعدہ — اور توڑ دیا!

ب۔ میرے خیال میں تو اس کی زندگی میں یہ پہلا ایسا واقعہ ہے۔ بلکہ میں اس پر شرط لگا سکتا ہوں کیوں نا کینڈی؟

ل۔ (ماریل سے) ان لوگوں نے آپ کو ایک جوابی تار دیا تھا کہ کیا آپ اپنا ارادہ بدل نہیں سکتے کیا آپ کو وہ تار ملا تھا؟

م۔ (اپنے جین کو ضبط کرتے ہوئے) ہاں، ہاں مجھے مل گیا تھا۔

ل۔ وہ جوابی تھا۔

م۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے۔ میں نے اس کا جواب دے دیا کہ میں نہیں آسکتا۔

ک۔ لیکن کیوں جیمس ! کیوں۔ آخر یہ کس لئے ؟

م۔ (قریب قریب غضب ناک ہو کر) اس لئے کہ میں نہیں چاہتا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ میں بھی آخر آدمی ہوں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا میں کوئی بولنے والی مشین ہوں جو ہر شام کو ان کی تفریح کے لئے چلا دی جایا کرے یعنی آخر کیا میں ایک شام بھی اپنی بیوی، اپنے دوستوں کے ساتھ نہ گذاروں۔ آخر مطلب کیا ہے ؟

(سب کو اس تقریر سے تعجب ہوتا ہے لیکن یوجین پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھا ہے)

ک۔ جیمس تم کو ہرگز اس بات کا اتنا خیال نہ کرنا چاہئے جو میں نے کہی تھی اور دیکھو اگر تم آج نہ جاؤگے تو کل تمہارا ضمیر اس پر ملامت کرے گا۔

ل۔ (سما ہوا لیکن بات اہم ہے) ہاں صاحب، یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ آپ پر بیجا اور نا زیبا بار ڈالدیتے ہیں لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیچارے ہر جگہ تا نیچ چکے ہیں اور ان بیچاروں کو دوسرا واعظ دستیاب نہیں ہو رہا ہے سوائے لا اوری کلیسا کے صدر کے۔

م۔ (جلدی سے) ہاں وہ تو بہت عمدہ آدمی ہیں بس اس سے بڑھ کر انھیں کیا چاہئے ؟

ل۔ لیکن وہ تو ہمیشہ سوشلزم اور عیسائیت کو جدا رکھنے پر اصرار کرتے ہیں اور اس طرح جو کچھ اب تک ہم لوگوں نے کیا ہے وہ سب خاک میں مل جائے گا۔ یہ تو خیر آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں (اپنے شانے ہلاتا ہے اور آتشدان پر برگیس کے پاس چلا جاتا ہے)

ک۔ (مناتے ہوئے) جاؤ ضرور، جیمس ضرور، ہم سب بھی چلیں گے۔

ب۔ (بڑبڑاتے ہوئے) دیکھو کینڈی ! میں کہتا ہوں کہ ہم لوگوں کو تو یہیں گھر میں آگ کے قریب نہایت اطمینان سے ٹھہرنا چاہئے۔ اس کو بس دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

ک۔ نہیں وہاں جلسے میں بھی آپ کو اسی قدر آرام ملے گا جتنا کہ یہاں ہم سب لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھیں گے

اور گویا بڑے آدمی ہو جائیں گے۔

ی م۔ (سہم کر) نہیں نہیں بھئی ہم لوگ پلیٹ فارم پر نہیں جائیں گے۔ وہاں سب کی نظریں ہماری طرف اٹھیں گی میں وہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ میں پیچھے کے کمرے میں بیٹھوں گا۔

ک۔ ذرہ متفقہ وہ سب لوگ ہمیں کی طرف دیکھنے میں اس قدر مشغول ہوں گے کہ کوئی تمہاری طرف خیال بھی نہ کرے گا۔

م۔ پراسی والی شکایت ٹھیک ہوں کینڈڈا؟

ک۔ (بشاش ہوکر) ہاں پراسی والی شکایت!

ب۔ (پریشان ہوکر) پراسی والی شکایت! ہمیں کیا مطلب ہے تمہارا؟

م۔ (اس کی طرف کچھ خیال نہ کرتے ہوئے اٹھتا ہے دروازہ تک جاتا ہے اسے کھولتا ہے اور تحکمانہ لہجہ میں پکارتا ہے مس گارنٹ!

پ۔ (دور سے) جی! مسٹر ماریل حاضر ہوئی۔

(سب لوگ انتظار کرتے ہیں سوائے برگیس کے جو نہایت آہستہ سے لیکسی کی طرف مخاطب ہوتا ہے)

ب۔ ادھر سنو! مسٹر ل۔ پراسی والی شکایت کیا چیز ہے؟ آخر وہ کیا بیماری ہے؟

ل۔ (رازدارانہ طور سے) حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے لیکن آج صبح اس نے مجھ سے اس عجیب و غریب طرز سے گفتگو کی تھی کہ میرا خیال ہے اُس کے دماغ میں کچھ فتور کبھی کبھی آجاتا ہے۔

ب۔ (گھبرا کر) خوب! پھر تو یہ مرض متعدی معلوم ہوتا ہے ایک گھر میں چار چار!

پ۔ (دروازہ پر آتے ہوئے) کیا بات ہے مسٹر ماریل؟

م۔ انجمن سینٹ میتھو کو تار دیدو کہ میں آرہا ہوں۔

پ۔ (تعجب سے) مگر وہ لوگ تو آپ کا خود انتظار کر رہے ہوں گے۔

م۔ (تحکمانہ) جو کچھ کہتا ہوں وہ کرو۔

(پ از رہائی سہم کر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتی ہے اور تعمیل حکم کرتی ہے۔ ماریل اب بے حد متفکر اور پرجوش ہے۔ برگیس کے پاس جاتا ہے۔ کینڈڈا اس کی حرکات کو بہت تعجب اور بے چینی سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے)

م۔ برگیس تم آنا نہیں چاہتے؟

ب۔ نہیں جمیں اس طرح نہ کہو۔ بات یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ آج اتوار تو ہے نہیں کہ فرصت کامل ہو۔

م۔ مجھے بہت افسوس ہے خیال تھا کہ تم اگر چلوگے تو میں وہاں کے صدر سے تمہاری ملاقات کرا سکوں گا۔ وہ ضلع کونسل ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی ہے اور ٹھیکے کے معاملات میں بہت کچھ اثر رکھتا ہے (برگیس ایکدم چونک پڑتا ہے) کیا میں چلوگے نہیں؟

ب۔ (جوش سے) ہاں، ہاں ضرور چلوں گا جمیں تم وعظ بھی خوب دیتے ہو۔ واقعی تمہارا وعظ ہمیشہ عمدہ ہوتا ہے۔

م۔ (پرادزی کی طرف گھومتے ہوئے) مس گارنٹ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں پر کچھ نوٹس لکھ لو۔ اگر تمہیں کوئی اور کام نہ ہو تو چلو (وہ سر ہلاتی ہے اور ڈر کی وجہ سے بول نہیں سکتی) لیکسی تم تو آ ہی رہے ہو جہاں تک میرا خیال ہے؛

ک۔ جمیس ہم سب لوگ چل رہے ہیں۔

م۔ نہیں، تمہارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یوجین کی تم کو یہیں رہنا چاہئے اور اس کی خاطر و مدارات کرنا چاہئے۔ گھر واپس آنے کی کچھ تو خوشیاں منا لو (یوجین کی سانس نہیں سماتی۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

ک۔ لیکن جمیں.......

م۔ (حکمیہ) میں اصرار کرتا ہوں نہ تو تم آنا چاہتی ہو نہ وہ، (کینڈڈا کچھ کہنا چاہتی ہے) نہیں اپنی فکر نہ کرو، وہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تمہاری خالی کرسیوں پر بیٹھ جائیں گے اور چونکہ وہ لوگ ابھی تک میرے خیالات سے ناواقف ہوں گے لہذا ان کا بیٹھنا زیادہ مفید ہوگا۔

ک۔ (پریشان ہو کر) کیا یوجین تم چلنا نہیں چاہتے ؟

م۔ میں یوجین کے سامنے وہاں بول نہیں سکتا۔ وہ میرے وعظوں پر اس قدر معترض ہوتا ہے (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) اور وہ یہ جانتا بھی ہے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں۔ آج صبح یہ اس نے مجھ سے کہا بھی تھا تو کینڈڈا آج میں اس کو تمہاری حفاظت میں چھوڑ کر دکھا دوں گا کہ میں اس سے کس قدر ڈرتا ہوں۔

ی م۔ (خود سے خوشی اور جذبے سے) یہ واقعی عالی ہمتی ہے، بہت خوبصورت۔

ک۔ (پریشان اور تشویشناک ہو کر) لیکن۔ لیکن۔ جمیس کیا کوئی بات ہو گئی؟ (بہت بے چین ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا ـــ

م۔ (اُس کو محبت سے اپنے بازوں میں لیتے ہوئے اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے) اچھا! پیاری میں تو سمجھتا تھا کہ میں ہی کچھ نہیں سمجھ پاتا ہوں۔ (پردہ) (باقی آئندہ)

مترجم : نشیم

دہر آشوب

ابتریِ عالم و ز میں گیر نظر آتی ہے خواب ابلیس کی تعبیر نظر آتی ہے
عافیت بستۂ زنجیر نظر آتی ہے زندگی موت کی تفسیر نظر آتی ہے

امن کے جسم پہ ہے جنگ کا خونیں قالب روح اقوام پہ ہیں مرگ و تباہی غالب
خاک اور خون میں لتھڑی ہوئی ارضِ مغرب نعش عریاں پئے تشہیر نظر آتی ہے

طرب آموز تھا آغازِ جمال پیرس درد انگیز ہے تصویر مآل پیرس
نازک اندام و سیہ چشم غزال پیرس خوں میں ڈوبا ہوا نخچیر نظر آتی ہے

لٹ گئی رونق و تمکینِ شبستان نظر مٹ گئی زینت و آرائشِ ایوان نظر
لعبت چین کہ تھی حاصل ارمان نظر زخمی و خستہ و دلگیر نظر آتی ہے

موجۂ نیل پھر آمادۂ طغیانی ہے چین پر در پھرا بوالہول کی پیشانی ہے
مصر پھر منتظر ہادیِ عمرانی ہے روح فرعون عناں گیر نظر آتی ہے

دل جاپان نظر روس ہے از آلودہ در لعنت پہ جبینیں ہیں نیاز آلودہ
ترکی و روم و فلسطین و حجاز آلودہ آتش جنگ جہاں گیر نظر آتی ہے

فتنہ در سر ہیں شریر اور ہوا آج، مگر حشر در بر ہیں قدر اور قضا آج مگر

قہر پرور ہیں بشر اور خدا آج گر — صور پھنک جانے میں تاخیر نظر آتی ہے

للہ الحمد کہ نزدیک ہے وہ روز سعید — عشرہ بن جائے گی جب ہر ستم ایجاد کی عید
حق کو مژدہ ہو کہ بالائے سر شمر و یزید — تیغ مظلومی شبیر نظر آتی ہے

انقلاب آیا ہے یوں چاند کی ہر منزل پر — چھا گیا ہے شفقی رنگ فلک کے دل پر
اک نئے دور کے آئینۂ مستقبل پر — دیکھ وہ سرخئ تحریر نظر آتی ہے

جان باقی ہے سکت ہو نئی تہذیب میں بھی — شرر صدق ہے خاکستر تکذیب میں بھی
یعنی اس سلسلۂ غارت و تخریب میں بھی — اک نئے عہد کی تعمیر نظر آتی ہے

شرح صدر حرم و دیر ہوا چاہتی ہے — فاش تزویر شر و خیر ہوا چاہتی ہے
عقل آزاد و سبک سیر ہوا چاہتی ہے — پائے اوہام میں زنجیر نظر آتی ہے

ہے بدلنے ہی کو نظم و نسق چرخ کبود — باغ بن جانے کو بیتاب ہے نار نمرود
خنکئ قلب براہیم ہے سرگرم شہود — آگ میں برف کی تاثیر نظر آتی ہے

پھر نم آگیں ہیں شرر شعلے ہیں شبنم آلود — پھر دل آہن و خارا میں ہے نرمی کی نمود
شاعر شرق کو بخشا گیا لحن داؤد — سنگ میں موم کی تاثیر نظر آتی ہے

حق ہوا چاہتا ہے پردۂ باطل سے عیاں — کفر کے دل میں ہے تابندہ شرار ایماں
ہو مبارک کہ ضمیر شب ظلمت [illegible] — صبح نوروز کی تنویر نظر آتی ہے

(سروش عسکری طباطبائی بی اے لکھنوی)

نوائے سحر

تیری فرقت سے جو غمگین کبھی ہو جاتا ہوں
طفل ناداں کی طرح سوچ میں کھو جاتا ہوں
رات بھر دیکھتا رہتا ہوں ستاروں کی راہ
صبحدم تھک کے تری یاد میں سو جاتا ہوں

بانگ فطرت کا ترنم ہے جنوں ساز ابھی
ضو فشاں ہے مرے دل میں شرر راز ابھی
زندہ ہے خاک کی آغوش میں احساس کی آگ
گونجتی ہے تری شب میں مری آواز ابھی

ظلمت دہر سے بیتاب نوا ہوتا ہوں
کشت ہستی میں تری دانہ غم بوتا ہوں
درد دل سے، تری درگاہ میں ہنگام سحر
اکثر اک طفلک تنہا کی طرح روتا ہوں

فکر محبوس، ابھی طالب پرواز نہیں
اس کا ہنگامہ تکبیر شرر ساز نہیں
خلوتوں میں غم امروز سناتا ہوں تجھے
کہ ترے دہر میں میرا کوئی ہمراز نہیں

شیشۂ عمر مئے تند سے لبریز نہ کر
دہر میں یوں مری فطرت کو جنوں خیز نہ کر
فکر ہستی کے لئے فرصت یک لحظہ تو دے
موج دم سے یہ دبی آگ ابھی تیز نہ کر

یہ جہاں تنگ ہے کتنا دل پر شور کو آہ!
سخت مشکل ہے شب و روز میں فطرت سے نباہ
اک ننھی سی خطا پہ تو خفا ہے ایزد ابھی
کروٹیں لیتا ہے دل میں مرے اک حشر نگاہ

فضل حسین صاحب کیفؔ

مۓ کہنہ

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

طبل و عَلم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

کھلی ہے خانۂ صیاد میں ہماری آنکھ
قفس کو جانتے ہیں آشیاں نہیں معلوم

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

آئینہ دیکھنے کا گذرتا نہیں خیال
اپنی خبر نہیں انھیں میری خبر کہاں

یہ کھلا آتش عناصر سے دلِ دیوانہ کو
چار دیواریں اکٹھی ہو کے زنداں ہو گئیں

آباد میرا خانۂ ویراں ہے ان دنوں
سیلاب مجھ غریب کا مہماں ہے ان دنوں

کعبہ و دیر میں وہ خانہ برانداز کہاں
گردشِ کافر و دیندار لئے پھرتی ہے

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
مجھ کو غربت وطن سے بہتر ہے

صورت شمع ہوں ہرچند فروغِ محفل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

کعبے سے دیر، دیر سے کعبہ کو جا چکے
کیا کیا نہ اس دوراہے پہ ہم پھیر کھا چکے

زیرِ زمیں بھی چین کی صورت نہیں نصیب
آسودگانِ خاک کی مٹی خراب ہے

میری تعظیم نے مجلس سے نکالا مجھ کو
اُٹھتے اُٹھتے نہ رہی بیٹھنے کی جا باقی

بلبل ہی کو بہار کے جانے کا غم نہیں
ہر برگ ہاتھ ملتا ہے گلزار کے لئے

بت خانہ کھود ڈالیئے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مقام ہے

طریقِ عشق میں آتش قدم مجھ سا نہ گذرے گا
گریباں میں کبھی ہے جب لگی ہو آگ داماں میں

وہ گریباں آگ میں رکھ دیجئے
موسمِ گل میں ہوں جو بے چاک کے

(آتش لکھنوی مرحوم)

غزل

پھر اپنا آشنا کیوں اے دلِ ناداں نہیں ہوتا
کہ آئے دن یہ رنگِ گردشِ دوراں نہیں ہوتا

ریاضِ دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں دربغل ہر غنچۂ خنداں نہیں ہوتا

سراپا نار ہونا نور کا آساں نہیں ہوتا
فرشتوں میں جو اعلیٰ تر نہیں شیطاں نہیں ہوتا

ابھی تک حسن بک جاتا ہے بازارِ محبت میں
مگر ہر بکنے والا یوسفِ کنعاں نہیں ہوتا

کسی کے حسن سے ناداں کبھی انکار بھی کر لے
کوئی بے کفر کے شائستۂ ایماں نہیں ہوتا

کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہے
در و دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا

تجھے پا کر بھی اہلِ شوق تجھ کو پا نہیں سکتے
یہ عقدہ حل بھی ہو کر عقدۂ آساں نہیں ہوتا

نظر سے گدگدائے جا، ستم سے دل دکھائے جا
میں یوں خنداں نہیں ہوتا میں یوں گریاں نہیں ہوتا

فنا اپنی بقا اپنی ہے جس کو عشق کہتے ہیں
وہ مرگ و زیست کا شرمندۂ احساں نہیں ہوتا

ہر اک شے کے پسِ منظر ہو جیسے نور کا عالم
کہاں نظارۂ شمعِ تہِ داماں نہیں ہوتا

فضائل لاکھ ہوں لیکن محبت ہی نہیں جن میں
فرشتہ ہو خدا ہو کچھ بھی ہو انساں نہیں ہوتا

یہ دنیا سربسر گویا پرستاں بنتی جاتی ہے
کہ ان آنکھوں کا عالم، عالمِ امکاں نہیں ہوتا

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ خوش ہونا محبت میں
کبھی مشکل نہیں ہوتا، کبھی آساں نہیں ہوتا

مزاجِ حسن کی مجبوریوں کو کیا کہے کوئی
ترے وعدوں میں یوں تو جھوٹ کا امکاں نہیں ہوتا

اٹھے ہی جاتی ہیں موجیں تبسم ہائے پنہاں کی
گلستاں در گلستاں کب رخِ جاناں نہیں ہوتا

فراقؔ اک سے بڑھ کر چارہ سازِ درد ہیں لیکن
یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

(فراقؔ صاحب گورکھپوری)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

منتخب داغ : منتخبہ احسن مارہروی مرحوم مطبع انوار احمدی الہ آباد قیمت حصہ اول و دوم ۱۲ روپے صفحات ۲۲۴، ۷۷ کاغذ کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

داغ کے دو ایک انتخابات نکل چکے ہیں لیکن ایک مفصل انتخاب کی ضرورت پھر بھی باقی تھی۔ اس انتخاب میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ان کے ایک محبوب اور مشہور شاگرد کا کیا ہوا ہے حصہ اول میں داغ کی غزلوں کے ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جو فارسی عطف و اضافت سے خالی ہیں حصہ دوم میں یہ قید اٹھادی گئی ہے اور ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جن میں فارسی عطف و اضافت موجود ہے۔ اس کے علاوہ پہلے حصے میں ہر قسم کے اشعار لئے گئے تھے۔ دوسرے حصہ میں صرف بہتر اشعار کا انتخاب دیا گیا ہے۔ گویا پہلا حصہ ہندوستانی اردو کا نمونہ ہے دوسرا حصہ خالص اردو کا۔ ابتدا میں ۱۲ صفحوں کا احسن صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے جس میں داغ کی شاعری پر تبصرہ ہے نیز ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے جو اس وجہ سے اور بھی مستند ہیں کہ احسن صاحب کے اپنے دیکھے ہوئے ہیں۔ داغ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے احسن مرحوم نے ایک پارے میں ان کی خصوصیات کو اس طرح بند کر دیا ہے "داغ نہ صوفی تھے نہ مفتی صرف ایک شاعر تھے اور شاعر بھی غزل کے اور غزل بھی ایسی جس میں شوخی۔ شرارت۔ چلبلا پن طعن تشنیع۔ رشک بدگمانی۔ چھیڑ چھاڑ۔ لاگ ڈانٹ چھین جھپٹ کے سوا کچھ نہیں .... داغ نے سیدھی سادی باتوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلے ہیں کہ بڑے بڑے کھلاڑیوں کو نیچا دیکھنا پڑا ہے۔

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھکانا ... سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

مقدمہ سے پہلے احسن مارہروی مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کا مختصر انتخاب بھی دس بارہ صفحات میں دے دیا گیا ہے۔

غرضکہ یہ انتخاب بہمہ وجوہ مکمل ہے اور کیا باعتبار معنی اور کیا باعتبار بندش شاید ہی کوئی اچھا شعر باقی رہ گیا ہو جو اس انتخاب میں نہ آگیا ہو۔

پھریری:۔ از عظیم بیگ صاحب چغتائی ملنے کا پتہ کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳۔ قیمت عمر۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔

یہ چغتائی صاحب کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں نکلتے رہے ہیں اور ان خوبیوں اور خامیوں کے حامل ہیں جو چغتائی صاحب کی خصوصیات رہی ہیں۔ چغتائی صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افسانے کسی نہ کسی واقعہ پر ضرور مبنی ہوتے ہیں۔ زیبِ داستان کے لئے افسانہ نگار البتہ ان میں تغیر و تبدل ترمیم و تنسیخ کر لیتا ہے۔ یہ خصوصیت جہاں اتنی خوبیاں رکھتی ہے وہاں اس میں یہ خامی بھی ہے کہ اکثر افسانے افسانہ نگار کی کم توجہی کے باعث محض واقعات کی ایک ڈائری ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چغتائی صاحب کے بعض افسانوں میں یہ کھردری واقعیت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

بعض افسانوں کی طرز نگارش میں رشید صدیقی اور پطرس کا رنگ پایا جاتا ہے "ہارا پرنس" والے افسانے میں انگریزی طرز معاشرت کی بہت دلچسپ تصویر کھینچی ہے بقیہ افسانے زیادہ تر چغتائی صاحب کے پر شرارت پلاٹوں سے مزین ہیں۔ دلچسپ چیز ہے۔

گرام سدھار:۔ مصنفہ پنڈت اوم پرکاش ترکھا۔ قیمت ۲ر ملنے کا پتہ۔ سکرٹری شری گاندھی آشرم شاہدرہ لاہور۔

یہ ایک چھوٹی تقطیع پر ۱۲۰ صفحہ کی کتاب ہے جس میں دیہی اصلاحات کے سلسلہ میں گاؤں والوں کی طرز زندگی اور معاشی حالات کا تامتر جائزہ لے کر ان کی فلاح و بہبود کی خاطر عملی اور فائدہ مند تدابیر نہایت خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ زراعت و گھریلو صنعت کی ترقی اور بڑھتی ہوئی بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے نیز صحت عام اور تعلیم عام کی طرف حکومت کو اس کے فرائض بتلا کر متوجہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی قوم کو اپنے جائز و ضروری مطالبات گورنمنٹ سے منوانے کی پرزور ترغیب دی گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر کام کی بات گاؤں والوں کو اپنے اوپر آپ بھروسہ کرنے اور اپنی ضروریات خود پورا کرنے کی ہے۔ یہ [illegible]

ہے جو زمانہ قدیم میں ہندی تمدن کا خاص الخاص طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس مسلک کو اختیار کرنے سے اُن تمام بدیسی چیزوں سے چھٹکارا ہو جاتا ہے جن سے آج کل ہندوستان کے بازار بھرے پڑے ہیں اور جو روزمرہ کی ضروریات میں بھی دوسروں کا محتاج کئے ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں اس مفید کتاب کے اضافہ کرنے پر اُس کے لائق و مخلص مصنف قابل مبارکباد ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے اچھا سبق حاصل کریں گے۔ دراصل اس کتاب کو بجائے گرام سدھار کے قوم سدھار کہنا زیادہ موزوں ہے۔

منگل پربھات :- مترجمہ پنڈت اوم پرکاش ترکھا۔ قیمت ۱ر- ملنے کا پتہ: اسکرٹری شری گاندھی سیوا آشرم شاہدرہ لاہور۔

یہ کتاب مہاتما گاندھی کے اُن چند ہندی خطوط کے مجموعہ کا ترجمہ ہے جو ہر ہفتہ منگل منگل انھوں نے اپنے قائم کردہ سابرمتی آشرم کے رہنے والوں کو لکھے تھے۔ ان سے مہاتما گاندھی کے مذہبی اعتقادات، پاکیزہ خیالات اور فلسفۂ اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے جس طرح یہ اُن کے معتقدین کے لئے پیام تعلیم اور رہنمائے ہدایت ہیں اُسی طرح عام پبلک کے لئے بھی معلومات مذہبی و بلند خیالی میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ اس کتاب میں حق اور حق پر چار کا اظہار کیا گیا ہے اور معیار انسانیت بلند کرنے کے لئے جن اوصاف حمیدہ اور اخلاق عالیہ کی ضرورت ہے ان کو مختصراً بیان کیا گیا ہے چنانچہ حق پرستی بے خوفی۔ عدم ایذا دہی۔ تزکیہ نفس کے لئے ریاضت، مذہبی رواداری اور انسانوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ ان خطوط میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات سے اردو داں حضرات کو واقف کرنے کے لئے مترجم کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔ جا بجا بعض ٹھیٹھ ہندی الفاظ کی تشریح بھی جنھیں طبع ثانی کے وقت ملحوظ رکھا جائے تو مناسب ہے۔ (م۔ح)

جغرافیہ دنیا (جدید ایڈیشن) :- مؤلفہ سید شرف الدین قادری۔ ایم اے ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ ملنے کا پتہ سید عبدالقادر ۔۔۔ کتب فروش چار مینار حیدرآباد دکن ۔۔۔

[illegible]

شرف الدین صاحب نے یہ جغرافیہ پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کیلئے ترتیب دی ہے۔ شروع میں طبیعی جغرافیہ بھی ہے اس کے بعد ہر ملک کی جغرافیہ مختصراً بیان کی ہے مختلف تصویریں اور ضروری نقشے بھی دئے گئے ہیں۔ نقشوں میں موجودہ جنگ سے قبل جو حدود تھیں وہی برقرار رکھی گئی ہیں۔ مشہور ہندوستانی ریاستوں کی جغرافیہ بھی بیان کی گئی ہے۔ طالب علموں کیلئے بہت مفید کتاب ہے اور یوپی کے اسکولوں میں جو اردو جغرافیہ رائج ہے اس سے یہ بہتر ہے۔

رسالہ ہندوستانی ادب:۔ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن۔ زیر ادارت غلام محمد خاں صاحب ایم اے عثمانیہ، چندہ سالانہ للعہ رفی پرچہ ۶ر کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۶۴۔

جون ۱۹۴۲ء سے یہ ماہوار رسالہ غلام محمد خاں صاحب نے نکالنا شروع کیا ہے۔ ہر قسم کے ادبی مختصر مضامین کے علاوہ دنیائے سائنس، معلومات، دلچسپیاں اور فلمی معلومات بھی دی گئی ہیں۔ رسالہ کی ترتیب اچھی ہے ہر قسم کے مذاق کا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے مضامین مختصر ہو گئے ہیں۔ تنوع اور اختصار اور دلچسپی کو مدنظر رکھنا ہے تو بہتر یہ ہوگا اگر غلام محمد خاں صاحب تمام ہندوستانی رسالوں یا کم از کم تمام اردو کے رسالوں کے بہترین مضامین کا اختصار دیدیا کریں یہ اردو کے لئے ایک نئی چیز ہوگی۔ دلچسپ بھی، انوکھی بھی اور آسان بھی۔ ورنہ ایسے رسالے تو بہت سے نکلتے رہیں گے۔

رسالہ پیام اسلام:۔ مدیر محمد احمد خاں صاحب ذاکر۔ ملنے کا پتہ دار القرآن۔ جالندھر۔ صفحات ۴۸۔ چندہ سالانہ تے ر۔ طلبہ سے عہ فی پرچہ ۴ر

دراصل یہ رسالہ مدرسۃ البنات کی طالبات کے لئے نکالا گیا ہے لیکن عام عربی پڑھنے والے طالب علموں اور عربی زبان سیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس میں عربی اسباق کے علاوہ قرآن اور حدیث اور تفسیر کے بھی عام فہم اقتباسات ہیں۔ طالب علموں کے لئے بہت مفید چیز ہے۔

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں اُن کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی اُنھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیار کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعثِ مضرت ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی نکھالص چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں

مختصر تاریخ ادب اُردوُ

مصنفہ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم۔اے لکچرار شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی

اُردو زبان میں تاریخ ادب پر ایسی کوئی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے۔کوئی کتاب میر، داغ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہوجاتی ہے اور کوئی چند قدم آگے بڑھی بھی ہے تو وہ موجودہ دور کے نثر نگاروں کا تو ذکر ہی کیا، شعراء کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی اور شاید ایسی اس وقت کی کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلے میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔

اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تاریخ لکھی گئی ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر لکھتے وقت اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو۔

اگر آپ کو اپنی زبان سے محبت ہے اور آپ اُردو کے قدیم و جدید شعراء و نثر نگاروں کے حالاتِ زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ ان کی شاعری اور نثر نگاری پر صحیح تنقید کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمایئے۔

کتابت، طباعت کے لئے انڈین پریس کا نام ہی ضمانت ہے حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت صرف عہ

ملنے کا پتہ

منیجر (بک ڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

ماورا

ہمارے اکثر قارئین کو جو جدید اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اُردو کے نوجوان شاعر ن۔م راشد صاحب کی نظموں کا پہلا مجموعہ "ماورا" اگست ۱۹۴۱ء میں مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعے میں چالیس کے قریب نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کا "تعارف" اُردو کے مشہور افسانہ نگار پروفیسر کرشن چندر ایم اے نے تحریر کیا ہے اور دیباچے میں راشد صاحب نے خود اپنے قلم سے آزاد شاعری اور اپنے طرزِ سخن سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اس مجموعے کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہوگی اور

مکتبہ اُردو، لاہور کے پتے سے دستیاب ہوسکے گی

رسالہ ہندوستانی

رسالہ ہندوستانی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے حکومت صوبجات متحدہ کی سرپرستی میں گیارہ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ ہے، جو اکیڈمی کا آرگن ہے۔ اس میں قدیم و جدید علوم و فنون کے اہم موضوعات پر، ماہرین فن اور کہنہ مشق اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں اس استناد کی وجہ سے یہ رسالہ، رسالہ نہیں ہے! بلکہ حوالے کی ایک کتاب ہے! ہر کتب خانے میں اس کی جلدوں کا موجود رہنا نہایت ضروری ہے رسالے نے ۱۰، ۱۱ سال کے عرصے میں علم و ادب کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں، اُن کی وجہ سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہو گیا ہے کہ اب وہ اردو زبان کے دو تین سب سے ممتاز رسالوں میں سے ایک ہے! جناب کی علم دوستی سے اُمید ہے کہ اس کے معاونین میں شامل ہو کر علم و ادب کی خدمت کا اس کو موقع عطا فرمائیں گے۔ اسی سلسلے میں اُس کی توسیع اشاعت کی طرف بھی جناب کو توجہ دلاتا ہوں۔ جو حضرات اس کی خریداری منظور فرمائیں گے؛ یا جو پانچ خریدار بہم پہنچائیں گے؛ اُن کی خدمت میں اکیڈمی کی بعض مطبوعات رعایتی قیمت پر پیش کی جائیں گی۔ اِن مطبوعات کی تفصیل، دفتر سے معلوم ہو سکے گی۔ رسالے کا سالانہ چندہ للعہ ہے۔ براہ کرم اس سلسلے کی خط و کتابت کے لیے ذیل کے پتے سے یاد فرمایا جائے۔

دفتر رسالہ ہندوستانی، ہندوستانی اکیڈمی صوبجات متحدہ، (الہ آباد)

ہندوستانی اور اسلامی سیاسیات

سے باخبر رہنے کے لئے "نوائے وقت" لاہور کا مطالعہ کیجئے۔ اپنی آزاد پالیسی اور سنجیدہ و متین تنقید کی وجہ سے اس اخبار کو شمالی ہندوستان کی اردو صحافت میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس اخبار کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر پرچے میں علامہ اقبالؒ کے پیغام و کلام کی تشریح پر ایک بلند پایہ مضمون ضرور شائع ہوتا ہے۔ مسٹر محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولوی عبدالحق اور سر عبدالقادر نے نوائے وقت کو وقت کی ایک اہم ضرورت بتاتے ہوئے اس کی کامیابی کی دعا کی ہے۔ خواجہ غلام السیدین۔ میاں بشیر احمد پروفیسر حمید احمد خاں۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ مسٹر ایم۔اے رحمن (آئی۔سی۔ایس) شیخ انوار الحق (آئی، سی، ایس) مسٹر ہادی حسن (آئی۔سی۔ایس) سابق مدیر ہزار داستان۔ پروفیسر سید عالم ڈاکٹر محمد باقر۔ مسٹر محمد شفیع اس اخبار کے قلمی معاونوں میں شامل ہیں۔

اخبار نوائے وقت محکمہائے تعلیم پنجاب و سندھ کا منظور کردہ ہے۔

چندہ سالانہ ۸/ نمونے کے لئے پانچ پیسے (۱/) کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں مفت نہیں بھیجا جائے گا۔

ملنے کا پتہ

منیجر اخبار نوائے وقت لاہور

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعے اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اُسے منتقل کیا جائے۔ یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبدارانہ اور بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا ممالک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ رسالے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر شخص کو پڑھنا چاہیے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی و دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب و سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چارمینار حیدرآباد دکن سے دریافت کیجیے

چندہ سالانہ صہ فی پرچہ عہ

رسائل تعلیم و ترقی

مکتبہ جامعہ نے ادارہ تعلیم و ترقی کی طرف سے جولائی میں حسب ذیل رسالے شائع کئے ہیں ان کو شامل کرکے کل رسائل کی تعداد ۵۲ ہو جاتی ہے

۱۔ قصہ حاتم طائی اول ار
۲۔ " " " دوم ار
۳۔ " " " سوم ار
۴۔ " منصور موہنا ار
۵۔ " فردوس بریں ار
۶۔ " لیلےٰ مجنوں ار
۷۔ شکنتلا ار
۸۔ تانگے والا ار
۹۔ بہشتی ار
۱۰۔ صوبے کی حکومت ار
۱۱۔ حکومت ہند ار
۱۲۔ جمہوریت ار
۱۳۔ دوہے ار
۱۴۔ دلچسپ شعر ار
۱۵۔ مرثیے ار
۱۶۔ مسدس حالی ار
۱۷۔ حالی کی نظمیں ار
۱۸۔ گنتی ار
۱۹۔ بڑی گنتی ار
۲۰۔ پہاڑے پیمانے ار
۲۱۔ اجرت کا حساب ار
۲۲۔ تنخواہ کا حساب ار
۲۳۔ چاند تارے ار
۲۴۔ نزلہ زکام ار

مکتبہ جامعہ، دہلی


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت
حاصل کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک فنٹن دہلی گیٹ ، دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم ؛ اے

جلد ۳۵ نمبر ۳ | بابتہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ ۸ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

اقبال

(گذشتہ سے پیوستہ)

آٹھواں منظر

وادیٔ ظلمت

(آدھی رات۔ شاعرِ مستقبل کی روح ایک جنگل میں بیٹھی ہوئی تصور کے گلستاں کھلا رہی ہے۔ آدھی رات اس سے کہتی ہے)

آدھی رات۔ اک مشعلِ جاں ہو مری فطرت کی سیاہی
اے نجمِ درخشاں تری ثابت ہے گواہی
اٹھ اے نگہِ شوخ کے خاموش پرستار
لٹتی ہے یہاں دولتِ آشفتہ نگاہی
ہے دستِ درازی کے لئے دامنِ عالم
ہے سایہ فگن فرق پہ منشائے الٰہی
میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی

روحِ شاعر۔ مرے فروغِ تخیل کا فیض ہے عالم
یہ کائنات مری چشمِ دلنواز میں ہے
تو دیکھتی نہیں تخلیقِ جاوداں کا حرم
مرے مدینہ میں ہے اور مکے حجاز میں ہے
مرے رسول ہیں یہ دلبرانِ حسن و جمال
پیامِ عشق مری وحیِ جاں نواز میں ہے
کھلے ہیں میرے لئے جبرئیل کے بازو
ہجومِ حور و ملک میری بزمِ ناز میں ہے
اگر میں چاہوں تو پیدا کرو جہاں اپنا
دکھاؤں چشمِ تماشا کو آسماں اپنا

آدھی رات۔ اگر ہے دعویٔ تخلیق تجھ کو اے شاعر
تو اپنا کوئی زمیں آسماں بنا کے دکھا
مری نگاہ پہ چلتے نہیں فقط دعوے
ہر ایک منظرِ تخلیق جگمگا کے دکھا

روحِ شاعر۔ خشک تھی یہ سرزمیں فیضانِ قدرت کے مگر
دیکھ اس وادی میں اک بہتا ہوا چشمہ ملا

(ایک شفاف چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے)

چشمہ۔ ہر زن انسانی ہے ہر حسن تماشا ہے — بہتا ہوا دنیا میں دریائے تمنا ہے
جاری رہے عالم میں اک انجمن آرائی — تخلیق مسلسل ہی فطرت کا تقاضا ہے

روح شاعر۔ تیرے پہلو سے نکالا میں نے اک چھوٹا سا باغ — دیکھ اس پر ناچتے ہیں کتنے پھولوں کے ایاغ

(پھولوں کا ایک شاداب باغ چشمے کے کنارے اُگتا ہے اور لہلہاتا ہے)

باغ۔ لے گئی باغ میں طوفان محبت کو بہار — ڈالی ڈالی مرے محبوب کا افسانہ ہے
ہر طرف بادۂ مستی کے چھلکتے ہیں جام — پھر بھی اک چیز سے خالی مرا پیمانہ ہے

روح شاعر۔ اچھا تو اپنی چھاؤں میں اک طائر حزیں — اپنی صدائے درد سے ہے نغمہ بار دیکھ

(شاخ پر ایک پپیہا "پی کہاں، پی کہاں" کی آواز دیتا ہے)

روح شاعر محو ہو کر گاتی ہے:-

تو کیستی و من کیم، از صحبت ما چیست — بر شاخ گل ایں طائرک نغمہ سرا چیست

مقصود نوا چیست؟
مطلوب صبا چیست؟
ایں کہنہ سرا چیست؟

شاید کہ چمن رزم حیات ہمہ جوئی است — بزمے است کہ شیرازہ او ذوق جدائی است

دم؛ گرم نوائی است
جاں؛ چہرہ کشائی است
ایں راز خدائی است

پپیہا کی آواز۔ برخیز و دل از صحبت دیرینہ بہ پرداز — با لالہ خورشید جہاں تاب نظر باز

با اہل نظر ساز
چوں من بہ فلک تاز
داری سر پرواز؟

دیکھا کر پھیلا اڑ جاتا ہے۔ روح شاعر پیچھے کو آسمان کی طرف اڑتا ہوا دیکھتی ہے۔ اس کی نظر جھلملاتے ہوئے تاروں پر پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا ستارہ سرطان کے سامنے گذر گیا۔ روح شاعر کی نظر ستارۂ سرطان پر جم جاتی ہے اور بیتاب ہو کر جواب دیتی ہے)

روح شاعر- خالی سر پرواز نہیں قوت جاں بھی — یہ وسعت افلاک بھی یہ کون و مکاں بھی
اڑتے ہوئے میں شعلۂ انجم کو ہوا دوں — بجھتے ہوئے سیاروں کی آنکھوں کو جگا دوں
پیچھے مرے آثار ہے یہ گنبد دوار — آگے مرے چلتا رہے ہر ثابت و سیار
ہر عظمت گرداں کے تگ و تاز سے نکلوں — طوفان سے نکلوں کبھی آواز سے نکلوں
ہو جائیں تجلی کی بہت تیز ہوائیں — دیکھیں جو مجھے اہل فلک رقص میں آئیں!

(شاعر کی روح آسمان کی طرف اڑتی ہے۔ ستارہ سرطان خود بھی قریب آتا ہے۔ اس کے اطراف چکر لگانے والا محور نور صاف نظر آنے لگتا ہے۔ سرطان اس طرح دعوت دیتا ہے)

آ، اے نظر افروز تجلی پہ کھڑا ہو — اس مرکز انوار کا آئینہ نما ہو
پی آنکھ سے یہ بادۂ پیمانۂ افلاک — چل پاؤں سے بالائے طربخانۂ افلاک
انجم کی نگاہوں سے اڑا ذوق تماشا — دیکھ آنکھ سے آئینہ ایوان تجلے
کس شان سے ہوتی ہے یہاں گردش انجم — سن غور سے سیاروں کے نغموں کا تلاطم
آنکھوں کے مقابل ہے یہاں چرخ کی رفعت — نزدیک نگاہوں کے ہے کونین کی وسعت
جو دور تھا نزدیک ہے، جو سرد تھا روشن — دامن سے لگا ہے ترے افلاک کا دامن!

(روح شاعر سرطان کے محور نور پر کھڑی ہوئی رقص کرتی ہے اور وجد میں آکر گاتی ہے)

روح شاعر- میں تعمیر و تخلیق کی ناخدا ہوں — بڑی خودنما ہوں، بڑی خودنما ہوں
بہت حیرت افزا ہیں گو یہ نظارے — بہت دلربا ہیں یہ سب ماہ پارے
مگر مجھ کو ہوتی نہیں اس سے تسکیں — سلامت رہے روح کا فخر و تمکیں
اضافہ کروں خودنمائی میں شاید — ابھی کچھ کمی ہے خدائی میں شاید!

ایسا لگتا ہے جیسے مرطان کا محور زور تیز گردش کرنے لگتا ہے اور اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ روح شاعر اس پر سے تنکے کی طرح اڑ جاتی ہے اور ایک وسعت بے کنار کی طرف بہتی چلی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے سیاہی کے شعلے، گردش کی ہوائیں، رقص کی آوازیں شور کرتی ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے روح شاعر کاروان در کاروان ستاروں کو تیزی سے گذرتا ہوا دیکھتی ہے۔ انجم کا یہ سرود سنائی دیتا ہے)

جلوہ گہ شہود را بت کدۂ نمود را
رزم نبود و بود را کش مکش وجود را
عالم دیر و زود را می نگریم و می رویم
خواجہ ز سروری گذشت بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت دور سکندری گذشت
شیوۂ بتگری گذشت می نگریم و می رویم

روح شاعر اب ایک ایسی ظلمت بے جہت میں آ جاتی ہے جہاں اسے خود اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ اس ظلمت میں وہ زور کے ساتھ ایک سرخ رنگ کے دریا میں ڈالدی جاتی ہے جس کی موجیں قیامت خیز جزر و مد کے ساتھ اٹھ رہی ہیں۔ سوائے دریا کی سرخ موجوں اور ان کی آتشیں دنداں نمائی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ دریائے آتشیں کہتا ہے)

دریائے آتشیں

آدمی آغوش میں تخلیق کے اے نا خدا تجھ پہ شاید ہنس رہی ہے ظلمت دنداں نما
ناز تھا اے بے خبر اپنے تصور پر تجھے صبر کرنا ہے یہاں اپنے تحیر پر تجھے
التہاب شعلۂ تمکین قلب جاں ہوں میں امتحان کفر ہوں آئینۂ ایماں ہوں میں
میری موجوں میں اجل سے بھی زیادہ انتقام میرے پانی میں جنوں سے بھی زیادہ اشتعال
کم نظر کی رہنما ہے شعلہ آشامی مری بے بصر کا راستہ ہے آتش افشانی مری

(روح شاعر دریائے آتشیں میں غوطے کھاتی ہے۔ ظلمت سے ایک آواز آتی ہے)

یہ موج می تپید آدم بہ جستجوئے وجود ہنوز تا بہ کمر در میانۂ عدم است

روحِ شاعر۔ نے فروغِ چشم و دل بجھنے چراغ قلب جاں — الاماں اے ظلمت دریائے آتش الاماں
جور آشنا کس لئے اولادِ آدم ہوں نہ میں — شور آشنا کس لئے افسانۂ غم ہوں نہ میں؟
ڈوبتی جاتی ہے میری کشتیِ عقل و خرد — المدد اے شاعرِ حسن خدائی المدد!

(روحِ شاعر کے سامنے ایک مہیب شکل و صورت کی مچھلی جس کا چہرہ دیو نما ہے ظلمت سے دو سرخ آنکھیں چمکاتی ہوئی ابھرتی ہے اور اسے پشت پر بٹھا کر کھینچ لے جاتی ہے۔ دوسری آواز آتی ہے)

بے زورِ سیل کشتیِ آدم نمی رود — ہر دل ہزار عربدہ دارد بہ ناخدائے
از من حکایت سفرِ زندگی مپرس — در ساختم بہ درد و گذشتم غزل سرائے

(روحِ شاعر پکارتی ہے)

اے ظلمت حیات مرے دل پہ رحم کر — اک وادیِ فنا میں مجھے اس طرح نہ کھینچ
تیسری آواز۔ بیش نگر کہ زندگی راہ بہ عالمے برد — از سر آنچہ بود و رفت درگذر انتہا طلب
روحِ شاعر۔ فنا کی طرف مجھ کو لے جا رہی ہے — مری انتہا مجھ کو دکھلا رہی ہے
چوتھی آواز۔ بہ آں تاب و تابے کہ فطرت بہ بخشد — درخشم چو برقے بہ ابر سیاہے

(روحِ شاعر تڑپ کر مچھلی کی پشت پر سے کود جاتی ہے۔ کودتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا کا پانی تھم گیا اور شاعر کو تھوڑی دیر کے لئے سکون کی ایک چٹان سی مل گئی۔ اس وقت روحِ اقبال کی یہ صدا آنے لگی)

انجم بہ گریباں ریخت ایں دیدۂ تر ما را [1] — بیروں ز سپہر انداخت ایں ذوقِ نظر ما را
شام و سحرِ عالم از گردشِ ما خیزد — دانی کہ نمی سازد ایں شام و سحر ما را
شایانِ جنونِ ما پہنائے دو گیتی نیست — ایں راہ گذر ما را، آں راہ گذر ما را

(تھوڑی دیر بعد موجوں کی رفتار ویسی ہی شروع ہوتی ہے۔ روحِ شاعر ان سے بچ نہیں سکتی تھوڑی دور جا کر موجیں منجمد ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ روحِ شاعر بھی مدہوش ہو جاتی ہے۔ عالمِ سکوت یوں گویا ہوتا ہے)

عالمِ سکوت۔ یہ سکوتِ منجمد ہے یا اجل کا دام ہے — نا آشنا سائے خدائی کا یہی انعام ہے
اے خیالِ مضطرب تیری تگ و دو کیا ہوئی — اے نگاہِ بے محابا تیری وہ رد کیا ہوئی؟

---

[1] زبورِ عجم صفحہ

کیا ہوا وہ زندگی کا ذوق و شوق بے حجاب   کیا ہوئی وہ گرم روہیم صدائے انقلاب؟
کیا ہوئی غافل وہ شوخی تیری چشم ناز کی   کیا ہوئی ناداں وہ لرزش گرمی آواز کی؟
تیرے سینے میں جو برپا تھا وہ طوفاں کیا ہوا   کوہ و صحرا کیا ہوئے، صحن گلستاں کیا ہوا؟
تھم گئی آشفتگیٔ عقل و عرفاں کس لئے   ہو گیا بے حس و حرکت قلب لرزاں کس لئے!

(روحِ شاعر منجمد دریا میں بے حس پڑی ہوئی ہے۔ مدتوں پڑی رہنے کے بعد اس کے کانوں میں ایک آواز آنے لگتی ہے یہ ایک قوی ہیکل کشتی بان کی آواز ہے جو ایک عجیب و غریب کشتی میں بیٹھا ہوا ہے)

اٹھ[1] غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز   کاشانۂ مارفت بتاراج خزاں خیز
از نالۂ مرغ چمن، از بانگ اذاں خیز   از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

ناموس ازل را تو امینی تو امینی   دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی   صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

(کشتی بان روحِ شاعر کو کشتی میں بٹھا کرلے چلتا ہے اور گاتا ہے)

سفینہ دو جہاں کا ہے، یہ دریا لامکاں کا ہے   یہ موجیں زندگی کی ہیں، یہ طوفاں آسماں کا ہے
ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ   چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ
نظر ہے بادباں اپنی، تصور ہے ہوا اپنی   ہے آغوش خدائی میں بقا اپنی فنا اپنی
ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ   چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ
دل درد آشنا ساتھی تو پائے ازل ہمسر   ہر اک موجِ رواں کے ہاتھ میں عرفاں کا ساغر
ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ   چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

---

[1] زبورِ عجم ص ۱۱۱

یہاں ہے صبر پیمائی، یہاں ہے حوصلہ کاہی　　مگر اس امتحاں سے ڈر نہ اے طوفان کے راہی
ملے گر نا خدا کوئی تو پھر آساں ہے رستہ　　چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

(روح شاعر کو ہوش آتا ہے لیکن پوری طرح نہیں۔ اس کے کانوں میں یہ شیریں نغمہ گونجتا ہے)

بینی جہاں را، خود را نہ بینی　　تا چند ناداں غافل نشینی
نور قدیمی شب را برافروز　　دست کلیمے در آستینی
بیروں قدم نہ از دور آفاق　　تو پیش ازینی تو بیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید　　مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند　　آدم بمیرد از بے یقینی

(روح شاعر جاگ اٹھتی اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ یکایک ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بہت بڑا پرندہ جس کے پروں کی ہوا سے وادیٔ ظلمت کے کنکر پتھر اڑ جاتے ہیں۔ اسے اپنے پنجوں میں اٹھائے ہوئے پرواز کرتا ہے۔ یہاں بھی ظلمت کامل ہے۔ روح شاعر اپنے آپ کو معلق محسوس کرکے کانپنے لگتی ہے۔ کوہ پیکر پرندہ کہتا ہے)

کوہ پیکر پرندہ ظلمت کی روح ہستی فانی پہ چھا گئی　　ٹھنڈی ہوا چراغ محبت بجھا گئی
بے باکیٔ خیال قیامت اٹھا گئی　　احساس نور ظلمت ہستی مٹا گئی
اڑتا ہے کوئی راہگذر جانتا نہیں
رہبر ہے ساتھ اور اسے پہچانتا نہیں
میرے پروں میں موت کا ہے زلزلہ نہاں　　میری ہوا سے بجھنے لگی شمع لامکاں
میری نظر میں جذب ہوا رنگ آسماں　　میری صدا میں ڈوب گیا شور الاماں
بے جہت ظلمتوں میں اڑا جا رہا ہوں میں
کہسار میں عدم کے چلا جا رہا ہوں میں

(کسی گوشے سے آواز آتی ہے)

---

۱. [illegible]

آتش[1] از نالۂ مرغان حرم گیر و بسوز　　آشیانے کہ نہادی بہ نہال دگراں
در جہان بال و پر خویش گشودن آموز　　کہ پریدن نہ تواں با پر و بال دگراں

(یہ آواز سنتے ہی روح شاعر تڑپتی ہے اور پرندے کے پنجرے سے چھوٹ جاتی ہے اور بلندی کا ایک صبر آزما خلا طے کرتی ہوئی کئی گھنٹوں کے بعد ایک جگہ اتر آتی ہے۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہے اور افتاں و خیزاں چلتی ہوئی ہر چیز کو چھونے لگتی ہے۔ اس وقت آواز آتی ہے۔)

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر　　کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست

(روح شاعر تیزی کے ساتھ چلنے لگتی ہے۔ بہت دور سرخ روشنی کی ایک ہلکی سی دھار اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ اس کی وجہ سے خود فراموشی دور ہوتی اور احساس جاگنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح شاعر اوپر چڑھ رہی ہے۔ پہاڑ صدا دیتا ہے)

پہاڑ۔ اندیشہ کر کسی کے مقام حجاب کا　　پھر جائزہ لے اپنے خیال خراب کا
جلوہ فروش کون ہے قصر خیال میں　　کس کا فروغ ہے نگہ پائمال میں؟
ذوق انا کی منزل فسکر و عمل ہے کیا　　بیکاروں کی بزم میں دست اجل ہے کیا!
مدہوشی نگاہ میں کس کا جمال ہے!　　ارمان کے حصار میں کس کا خیال ہے!
کس کی صدا سے تیز ہیں اعمال کے قدم　　کھلتے ہیں کس کے سامنے جذبات کے علم؟
منصف ہے کوئی درد کے محشر بپا تو ہیں　　چلتی ہے روح عقل و خرد رہنما تو ہیں؟

(یہ سن کر روح شاعر پر ایک لرزہ طاری ہوتا ہے، لیکن وہ سنبھل کر پہاڑ سے کہتی ہے)

روح شاعر۔ طے کرے گی ظلمتوں میں بھی انھیں میری حیات　　سامنے تو چاہے جتنی سیڑھیاں پیدا کرے
یاد آتا ہے مجھے خضر محبت کا پیام　　سینۂ مضطر میں جو برق رواں پیدا کرے
ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ　　پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار　　اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر　　رات کے تاروں میں اپنا رازداں پیدا کرے

[1] پیام مشرق ص ۲۱۹

(روح شاعر پہاڑ پر چڑھ جاتی ہے۔ اسے ایک غار سے آواز آتی ہے)

ہست ایں میکدہ و دعوت علم است اینجا | قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا
حرف آں راز کہ بیگانۂ صوت است ہنوز | از لب جام چکیدہ است و کلام است اینجا
ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم | علم جاں را بہ میدیم و عمل ساختہ ایم

(روح شاعر یہ آواز سن کر سوچنے لگتی ہے اور کہتی ہے)

روح شاعر: ہر ذرہ حیات ہے اک روح ارتقا | اس خود روِ ازل کا کوئی رہنما بھی ہے
حیرت کا آئینہ ہے بیابان کائنات | ظلمت کی وادیوں میں کوئی راستا بھی ہے
موت و حیات کھیل ہیں طوفان وقت کے | یاں ابتدا ہے اور کوئی انتہا بھی ہے
امید پر قیام وجود و عدم ہے کیا | سامان زندگی میں علاج قضا بھی ہے؟
اک پردۂ نظر میں ازل اور ابد کے راز | کیا عالم شہود کوئی دیکھتا بھی ہے؟
فرد بشر نے پائی ہے تہذیب زندگی | دنیا میں امتیاز ثواب و خطا بھی ہے؟
بیگانگی کی آگ میں جھونکے ہوئے غریب | میں پوچھتا ہوں دہر میں اپنا خدا بھی ہے؟

(روح شاعر پہاڑ کی چوٹی کے قریب ہے۔ جو آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ وہ سے پیغام آتا ہے)

"از خلش کرشمۂ کار نمی شود تمام | عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب"

(اب شاعر کو اوپر سے کچھ اُجالا قریب آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت اسے ایک نہایت تنگ سرنگ سے گذرنا پڑتا ہے۔ جہاں ہاتھ پھیلانے کی جگہ بھی نہیں ملتی اور نہ سر اٹھا کر چلنے کی۔ اسے سر جھکائے ہوئے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے گذرنا پڑتا ہے۔ اسے سرنگ سے آخری گوشے پر پھر روشنی دکھائی دیتی ہے جو بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ روح شاعر تیزی سے دروازے پر پہونچتی ہے سامنے سے دو حسین پیکر روح شاعر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے اور گذرتے ہیں۔ ان کے تاجوں پر "عمل" اور "خودی" لکھا ہوا ہے۔ دونوں گاتے ہیں)

پیکر عمل[1]: چو خورشید سحر پیدا نگاہے می تواں کردن | ہمیں خاک سیہ را جلوہ گاہے می تواں کردن

---

[1] پیام مشرق صفحہ ۱۳۔ زبور عجم صفحہ ۱

نہ ایں عالم حجاب او سزد نہ آں عالم حجاب او را
اگر تاب نظر داری نگاہے میتواں کردن

پیکر خودی ہم ہیچیست بپیامست شنیدی و شنیدی
در خاک تو یک جلوہ عام است ندیدی

دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز

واسوختۂ یک شرر از داغ جگر گیر
یک چند بہ خود پیچ و نیستاں ہمہ در گیر

چوں شعلہ بہ خاشاک دویدن دگر آموز

(روح شاعر ظلمت سے نکل کر ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ ان کی روشنی میں اس کے دل پر یقین کا کچھ القا ہونے لگتا ہے)

نواں منظر

طوفان تجلی

(مس اور خودی کے پیکر تھوڑی دور چل کے شفق کے ایک حجرو کے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اب روح شاعر ذروں سے زیادہ لطیف نور کے دھوئیں میں اپنے آپ کو محصور دیکھتی ہے۔ آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وقت سامنے سے ایک عجیب قسم کا دیو ہیکل جانور نمودار ہوتا ہے جس کا آدھا جسم گوشت کا اور آدھا سخت دھات کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے روشنی کی ایسی تیز دھاریں دوڑتی ہیں کہ شبنمی نور میں ان کی چمک صاف نظر آتی ہے۔ وہ اژدہے کی طرح چار پاؤں سے رینگتا ہے۔ جب وہ سامنے آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوہ البرز سامنے آ گیا۔ اس کی چال میں مایوسی ہے اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ روح شاعر کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور انسانی لب و لہجہ میں کہتا ہے)

جانور۔ خاکدان آب و گل میں عقل کا زنداں ہوں میں
ظلمت و گم گشتگی کا آہنی ساماں ہوں میں

پیکر سنگیں میں میرے جذب نور رونا رہے
میری چشم دور بیں اک روزن دیوار ہے

سرحد افلاک کا عزم سفر تھا رہ گیا
اتنا وزنی ہو کے بھی جنبشوں میں بہ گیا

تھا حریف روح و دل اور دشمن ہوش و حواس
کر دیا اسرار نے اس بزم میں تھا روز پاس

ملاء زیر جسم

نور کے بادل میں کوئی رہنما ملتا نہیں — جھانکتا ہوں دیکھتا ہوں راستہ ملتا نہیں
سانس رک جاتی ہے جب اپنا بڑھاتا ہوں قدم — منہ جھلس دیتی ہے میرا گرمیٔ لوح و قلم
آہ اتنی منزلیں طے کر کے بھی ناکام ہوں — آہ اپنی روشنی کی ظلمت انجام ہوں

(یہ کہکر عقل کا دیو پیکر رینگتا ہوا گذر جاتا ہے۔ ایک ایوان کے ریشمی پردوں سے چند ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی زور سے ذکر و شغل کر رہا ہو۔ یہ روح اقبال کا ذکر و شغل ہے)

پہلی آواز۔ عشق[1] ناپید و خرد می گزدش صورت مار — عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

دوسری آواز۔ میری[2] متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور — میری متاع حیات ایک دل ناصبور
معجزہ اہل فکر فلسفۂ پیچ پیچ — معجزہ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا — تو ہے ابھی ہوش میں میرے جنوں کا قصور
فیض نظر کے لئے ضبط سخن چاہئے — حرف پریشاں نہ کہہ اہل نظر کے حضور

تیسری آواز۔ یہ[3] ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام — وہ جس کی شان میں آیا ہے علّم الاسما
مقام ذکر کمالات رومی و عطار — مقام فکر مقالات بو علی سینا
مقام فکر ہے پیمایش زمان و مکاں — مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

(روح شاعر میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک جست میں شفق کے پردوں سے گذر جاتی ہے۔ تھوڑی دور تیز روشنیوں میں چلنے کے بعد اس کے سامنے ایک نور کی چادر سی بچھی ہوئی آتی ہے۔ چادر پھاند کر [illegible] راستہ نظر نہیں آتا۔ روح شاعر دیکھتی ہے کہ پانی میں سے ایک سرخ رنگ کی کشتی ہے اس کے نیچے [illegible] ایک زمردیں تختہ بچھا ہوا ہے اور اس سے دل کی شکل کا ایک ایک [illegible] [illegible] کی چادر سرخ ہو جاتی ہے [illegible] آتی ہے)

[1] [2] [3] ضرب کلیم [illegible]

حورِ دل۔ ہے جلوہ گاہ عرش کی نگاہ میں تجلیاں　　حریم قدس عشق کی خیال میں تسلیاں
خرد کی برق تیز رو ہے زلف تابدار میں　　جنوں کے لالہ حزیں ہیں قلب لالہ فام میں
نظر اٹھا کے جب چلوں تو مستیاں نثار ہوں　　جھکا کے آنکھ جب چلوں تجلیاں نثار ہوں
قدم قدم پہ جام سے لنڈھائے شوخیاں مری　　شباب زندگی میں ہوں ہزار گرمیاں مری
ازل کی تابشوں سے ہے رخ حسین تابدار　　جبیں شوق سے گرا تجلیوں کا آبشار
قیامت آفریں یہ دل ہجوم آرزو سے ہے　　جگر میں موج آتشیں مذاق جستجو سے ہے
مری ہتھیلیوں میں ہیں فلک کے ماہ و آفتاب　　مرے خرام ناز میں ہے کہکشاں کا التہاب
مری فضائے زیست میں جنوں کا اختتام ہے　　مری حیات خوں چکاں، وصال ناتمام ہے

(اس کے پیچھے ایک روح اپنے سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے اور قدم قدم پر اپنے آگے چلنے والی کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے)

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانہ دل　　التجائے ارنی سرخیٔ افسانہ دل
اس کو اپنا نہ جنوں اور مجھے سودا نہ بنا　　دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانہ دل،

(روح شاعر سیلاب نور میں سے آگے بڑھتی ہے۔ اب اس کے سامنے ایک زرین تختہ بہتا ہوا آتا ہے جس پر ایک نازنین بیہوش پڑی ہوئی ہے۔ ہاتھ پانی کو چیرتے ہیں۔ اس کا لباس آئینوں اور تاروں سے بنا ہوا ہے۔ جگہ جگہ سبز شعاعیں تیر کی طرح نکلتی ہیں۔ اس کے پیچھے ایک ایک بیتاب پیکر بال پریشان ہاتھ پیر مارتے ہوئے تختہ کو تھامنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تختہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے

بیتاب پیکر پکارتا ہے)

بیتاب پیکر: گرمیٔ قلب و نظر جذب سے اب کام لے　　اے مری دیوانگی اس کو ذرا تھام لے
ٹھوکریں کھاتی ہے گو میرے لئے کائنات　　ہل نہیں سکتا کبھی عشق کا پائے ثبات
رقص میں لاتی ہے جب وقت کی گردش مجھے　　ملتی ہے کونین میں قلب کی لرزش مجھے
شیشۂ عقل و خرد، ساغر چشم و نظر　　آئینہ زندگی پردۂ شام و سحر
منزل امن و سکوں محفل علم و عمل　　مستی کون و مکاں بزم ابد تا ازل

لذت ایمان و دل، دولت شوقِ وصال ـــ بتکدۂ خوش نگاہ میکدۂ لازوال
سب مری وحشت کے قید سب مرے ساز میں ـــ سب مری ٹھوکر میں ہیں سب مری ٹھوکر میں ہیں
گرمیٔ طلب و نظر، جذب سے اب کام لے ـــ اے مری دیوانگی اس کو ذرا تھام لے

(تختۂ ناز زمیں کو لئے بہتا ہوا چلا جا رہا ہے اور کہتا ہے)

نگاہِ شوق کو سیلابِ ناز لے کے چلا ـــ صدائے عشق کو طوفانِ ساز لے کے چلا
رواں ہے حسنِ نظر نور کے سفینے پر ـــ عروسِ ناز کو اک بے نیاز لے کے چلا
نظر عروس ہے اور عقل و دل خرابِ نظر ـــ جو جستجو میں ہوا سرفراز لے کے چلا
جنوں کی دست درازی سے بچ گیا شاید ـــ حسین جلوے کو آئینہ ساز لے کے چلا

(روحِ شاعر محوِ نظارہ ہو جاتی ہے۔ اوپر سے دو فرشتے چاند تارے اوڑھے ہوئے گزرتے ہیں، ایک

فرشتہ گاتا ہے)

فرشتہ: کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش ـــ اک جہاں اور بھی ہے جس کا نہ فردا ہے نہ دوش
دوسرا فرشتہ: عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام ـــ یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ ـــ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

(روح شاعریاں سے گزر کر ایسے مقام میں آتی ہے۔ جہاں رنگ و بو کا ایک طوفان برپا ہے۔ خوشبو مجسم

معلوم ہوتی ہے۔ رنگ کی دیواریں کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس طوفان سے دو خوبصورت پھول رقص

کرتے ہوئے گزرتے ہیں)

پھول۔ جو ٹھنڈی ٹھنڈی ـــ وہ ساون کے جھولے
وہ موروں کے تورلے ـــ سے گلزار پھولے
ملی ننھی کلیوں کو ـــ اک نوخش نگاہی
وہ کوئل پکاری ـــ الٰہی الٰہی
بہاروں کی مستی کلا ہوں کی دولت

مبارک سلامت مبارک سلامت

جوانی کی ٹھوکریں　　چاند اور تارے
کنواری صداؤں سے　　کوئی پکارے
وہ زریں کمر　　لڑکیاں کھلکھلائیں
وہ ہنس ہنس کے　　بھولے کی پینگیں بڑھائیں
بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت
مبارک سلامت مبارک سلامت

ہر اک بھولی صورت　　دھی زندگی کی
ہر اک پاک مورت　　کلی زندگی کی
وہ رنگیں ادائیں　　متاع جوانی
وہ بھولی صدائیں　　مئے لن ترانی
بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت
مبارک سلامت مبارک سلامت

(ان کے پیچھے ننھی سی قوس قزح ہاتھ میں لیے اور ہاتھ سر پر بلند کئے ہوئے فیشنی پریاں رنگین قبائیں پہنے ہوئے گذرتی ہیں اور گاتی ہیں)

رنگ اور بو کے دریا جاگے　　دوڑے تارے آگے آگے
بادل بادل رنگت چھائی　　جوگن بن کر قدرت آئی
آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں
آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں!

اس نگری میں بہت بیری ہو　　ڈالی ڈالی دل کی ہری ہے
اپنے آگے نور کا پردہ　　اللہ اللہ اللہ اللہ

آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں
آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

(سامنے سے حضرت جبرئیلؑ اڑتے ہیں۔ ان کے پروں کی ہوا سے بیابان سے تنکوں کی طرح دور ہوجاتے اور فضا ایک نیگلوں نور بن کر رہ جاتی ہے۔ روحِ اقبال گنگناتی ہوئی گزرتی ہے)

(سینہ کشادہ جبرئیل از بر عاشقاں گذشت
تا شررے بہ او فتد ز آتش آرزوئے تو

ہم بہ ہوائے جلوۂ پارہ کنم حجاب را
ہم بہ نگاہِ نارسا پردہ کشم ز روئے تو)

(روحِ شاعر اقبال کے پیچھے رواں ہوتی ہے۔ وہ حیرت کے ساتھ بلند اور نیگلوں فضا کی طرف دیکھتی ہے جس کی رنگینی وسعت اس کی بلندی کو پوری شان کے ساتھ ظاہر کر رہی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ کروڑہا میل اوپر گہری فضا میں فرشتوں کا رقص ہو رہا ہے۔ حلقوں کے حلقے ہاتھ میں ہاتھ ملائے اڑ رہے ہیں ان کے سامنے رنگین ستاروں کی جھلک نظر آتی ہے فضائے نیگلوں سے روحِ اقبال آواز دیتی ہے)

(بیا کہ خاوریاں نقشِ تازہ بستند
دگر مرو بطواف بتے کہ بشکستند

چہ جلوہ ایست کہ دلہا بہ لذتِ نگہے
ز خاکِ راہ مثالِ شرارہ برجستند

ز ہم بہ ذوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق
بریدہ از ہمہ عالم بہ خویش پیوستند

غلامِ ہمتِ بیدارِ آں سوارانم
ستارہ را بہ سناں سفتہ در گرہ بستند)

(روحِ شاعر چاروں طرف دیکھتی ہے اور فکر میں ڈوب جاتی ہے)

روحِ شاعر۔ یہ تماشائے نظر اور یہ تجلی کا ہجوم
نیگلوں وسعتِ افلاک میں یہ رقصِ نجوم

یہ ملائک کی سرِ چرخِ منور پرواز
حور و غلماں کی سرا پردۂ جاں سی آواز

اخضری بحر میں یہ نور کا سیلاب رواں
کشتیِ حسن میں بیٹھی ہوئی حورانِ جناں

اور اس اوجِ نظارہ پہ مرا ذوقِ سفر
ہر قدم پر دلِ بیتاب کو اک خوف و خطر

قاصدِ شوق ہے کیا محفلِ ہستی کے لئے
ساغرِ عشق ہے کیا حسن پرستی کے لئے

کیا مجھے منزلِ آخر کا پتہ ملتا ہے
کیا مجھے وادیٔ حیرت میں صدا ملتا ہے

(سامنے سے دو فرشتے گاتے ہوئے گزرتے ہیں)

ایک فرشتہ: این دل کہ مراد دی لبریز یقیں بادا
این جام جہاں بینم روشن تر ازیں بادا

دوسرا فرشتہ: جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

(یہ گا کر فرشتے نیلگوں بلندی کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ روح شاعر اب ایسے مقام پر پہونچتی ہے جہاں آگے ایک قدم آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ مقام نہایت بلند ہے اور آگے عدم کی طرح عظیم الشان خلا ہے سوائے اڑنے کے چارہ نہیں۔ روح شاعر بہت گھبراتی ہے۔ ایک آواز آتی ہے)

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ
یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی
یا فکر حکیمانہ یا جذب کلیمانہ

(روح شاعر اڑنے کے لئے کسی فرشتے کی مدد کی طالب ہوتی ہے۔ پھر آواز آتی ہے)

در دست جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

(یہ سن کر روح شاعر پر ایک وجد طاری ہوتا ہے۔ وہ بلند حوصلہ ہوتی ہے لیکن ہمراز اور ساتھی کوئی نہیں۔ وہ ایک کشمکش میں پڑ جاتی ہے اور کہتی ہے)

آہ کیا بیگانگی ہے اس طلسم عرش کی
کوئی میری دستگیری کے لئے آتا نہیں
پائے ماندن ہو نہ جائے ذوق از طوفان شوق
جذبۂ توفیق بھی یاں ناز فرماتا نہیں

(فرشتوں کا ایک جھرمٹ گاتے ہوئے گزرتا ہے)

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے ناتمام ابھی
نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگی ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

(روح شاعر دیکھتی ہے کہ پیچھے سے ملتا بدر دیکھ رہے ہیں اور اس کے ٹھہرنے رہنے کا مقام تنگ ہو رہا ہے۔ وہ چیختی ہے اور کہتی ہے)

لے خدائے مہر و مہ خاک پریشانے نگر
ذرہ در خود فرو پیچد بیابانے نگر

۱؎ بال جبریل [illegible]

حسن بے پایاں درون سینۂ خلوت گر است | آفتاب خویش را زیر گریبانے نگر
در دل آدم زدی عشق بلا انگیز را | آتش خود را بہ آغوش نیستانے نگر

(روح اقبال کی آواز آتی ہے)

دل زندہ و بیدار اگر ہے تو بتدریج | بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہیں سب کچھ | ہر لحظہ ہیں سالک کے زماں اور مکاں اور

(روح شاعر پوچھتی ہے)

اے رہبر حیات مرے بال و پر کو دیکھ | معراج رنگ و نور پہ میری نظر کو دیکھ
جی چاہتا ہے قوت پرواز کے لئے | بے چین دل ہے گرمی دمساز کے لئے
لیکن یہ عزم سوز تجلی خدا گواہ | گم کر رہی ہے ذوق نظر شوخی نگاہ
اس اوج منتہی پہ رسائی ہو کس طرح | اور آشکار راز خدائی ہو کس طرح

(روح اقبال جواب دیتی ہے)

طی شود پردہ چشم پر کاہے گاہے | دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
وادی عشق بسے دور و دراز است ولے | طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

(روح شاعر ایک آہ عارفانہ کھینچتی ہے جس سے اس میں قوت پرواز آجاتی ہے اور وہ چشم زدن میں ستاروں سے آگے فضائے نیلگوں میں پہونچ جاتی ہے۔ قریب پہونچنے کے بعد اسے ایک بلند و عظیم لوح پر شاندار حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے مقام عشق: روح اقبال ایک پردہ زنگیں سے آواز دیتی ہے)

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں | وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں | غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے | قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

(یہاں روح شاعر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چل تو رہی ہے لیکن اس کے پاؤں کسی چیز سے نہیں چھوتے پھر نظر ڈالتی ہے [illegible] [illegible] ساری فضا رنگ

ملاحظہ ہو بال جبریل [illegible]

نیلگوں ہے۔ دور دور زمردیں درختوں کی چھاؤں میں زجاجی مینار، گنبد اور محل نظر آتے ہیں۔ فضا میں جو چیز اڑتی ہے دوہری نظر آتی ہے۔ ڈالی پر درخشاں بلور کے جوڑے چہچہاتے ہیں۔ روح شاعر کا یہاں اس طرح خیر مقدم ہوتا ہے)

مینار۔
وحدت کی صدائیں دیتا ہوں — الفت کی فضائیں دیتا ہوں
نکلی ہے تب ایمانوں کی — آتی ہے صدا ارمانوں کی
ہر گام پہ زینہ نور کا ہے — ہر جلوہ برق طور کا ہے
جلتا ہے مرے سینے میں چراغ — جلتے ہوئے ہیں دل کا ایاغ
آ اور یہ شمع عشق اٹھا — آ حسن ازل کی آگ لگا

بلوریں گنبد۔
ہم یہاں چتر شادمانی ہیں — زینت فرق آسمانی ہیں
نقش رنگیں ہیں ان فضاؤں پر — خواب شیریں ہیں ان ہواؤں پر
عشق مضطر کا دل لبھاتے ہیں — روشنی نظر بڑھاتے ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی نگاہ میں کھو جا — چھاؤں میں رنگ و نور کی سو جا

طیور آسمانی۔
اڑتے ہیں گاتے ہیں — برق دل چمکاتے ہیں
قدس جہاں دکھلاتے ہیں — تکبیریں برساتے ہیں

اللہ ہو اللہ ہو

رنگ و بو پائے جا — جاں بن کر چھائے جا
اپنا دل بہلائے جا — مستی سے یہ گائے جا

اللہ ہو اللہ ہو

(روح شاعر کے سامنے ایک زرنگار تخت مرصع درخت کی چھاؤں میں نظر آتا ہے۔ پتے جب ہلتے ہیں تو ان سے بیک وقت نغمۂ رنگ رنگ اور نسیم سحری کی موجیں نکلتی ہیں۔ روح شاعر تخت پہ بیٹھ کے ستاتی ہے اور اس کا دل بے اختیار گنگنانا چاہتا ہے)

روحِ شاعر نغمہ کی چھاؤں نکہت بیدار کی ہوا   رنگوں کے قصر و بام سے آرائش فضا
تنہائی و سکوں میں سے شیریں لطافتیں   ہر جنبش نگاہ میں رنگیں نزاکتیں
دل جلوہ گاہ حسن میں مدہوش اقبال   امید کی شعاع تصور کا اختیار
ہر گام پر حیات نظر آزمائے شوق   ہر بات میں خیال ازل مبتلائے شوق
انوار کے ظروف میں رنگینیٔ خیال   الطاف کے رباب میں اک نغمۂ وصال
جذب کشش سے خون جگر کھیلتا ہوا   ہنستے ہوئے فراق کا غم جھیلتا ہوا
کون و مکاں مچلتے ہیں لیتے ہیں نام عشق   ہے کتنا دل گداز الٰہی مقام عشق

(روح شاعر یہ گنگناتے ہوئے سو جاتی ہے۔ مدتوں تک سوئے رہنے کے بعد جاگتی ہے تو عالم ہی کچھ اور ہے۔ سوائے تنہائی اور چند دور کے نغموں کے اور کچھ نہیں ہے۔ لحظہ بہ لحظہ روشنیاں تیز ہوتی جاتی ہیں۔ نور کے پردوں میں لپٹی ہوئی روح اقبال گاتی ہوئی گذرتی ہے)

مردِ[1] خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ   عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفےٰ   عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود   عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

(پھر آگے بڑھ کے)

صدقِ[2] خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق   معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا   عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب
گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد   عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب

(روح شاعر کہتی ہے)

دل مایوس کا امید بھی غم کھائے گی   اس سفر کی کوئی منزل بھی نظر آئے گی؟

(آواز آتی ہے)

[3] افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر   کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر

---

۱ بال جبریل [illegible] ۲ [illegible] ۳ پیام مشرق

(روح شاعر نظارے پہ اشتیاق ہے اور عالم محویت میں کہتی ہے)

"چند بروئے خود کشی پردۂ صبح و شام را چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را"

(اس وقت ہجوم تجلی سو گنا تیز ہو جاتی ہے۔ نور کی چادریں سیلاب در سیلاب آنے لگتی ہیں۔ روح شاعر اپنی آنکھوں کو خیرہ ہوتی ہوئی دیکھتی ہے۔ یکایک چادروں سے ایک علم لہراتا ہوا گذرتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے)

سطوت از کوہ ستانند و بہ کاہے بخشند کلہ جم بہ گدائے سر راہے بخشند

گاہ شاہی بہ جگر گوشۂ سلطاں ندہند گاہ باشد کہ بہ زندانی چاہے بخشند

(اس طوفان تجلی سے ایک بڑا فرشتہ نکل آتا ہے جس کے پروں پر سیارے ناچتے ہیں۔ وہ کہتا ہے)

مرکب عشق ہوں انوار کے پر رکھتا ہوں سطوت کون و مکاں زیر و زبر رکھتا ہوں

مرحبا تجھ کو ملا ذوق یقیں، لذت عشق دیکھ آئینۂ کونین میں اب شوکت عشق

سوز و ساز نظر و لذت دیدار رہے گا نگہ عشق کی اب چشم طلب گار رہے گا

پاک کرتا ہے شعاع نگہ حسن طلب جان آلودہ کو دھو، گود میں لے بخشش رب

گرم کر محفل دل سوز تجلی کی طرح مست ہو لذت آواز تسلی کی طرح

حوصلہ ہے تو یقیں کی نگہ پاک سے دیکھ جلوۂ عشق کو اپنے دل بےباک سے دیکھ

تیری آہ دل مضطر میں اثر آئے گا جلوہ شاید تجھے رحمت کا نظر آئے گا

(یہ کہکر فرشتہ روح شاعر کو لے اڑتا ہے۔ دونوں شفق سے بھی زیادہ رنگین بادلوں سے گذر گئے ہیں۔ پھر وہ روح کو ایک بہت بڑے ایوان میں چھوڑ دیتا ہے۔ ایک طرف ستاروں کی طرح جھاڑ اور دوسری طرف چاند کا فانوس آویزاں ہے۔ روح اقبال ایک مصلے پہ بیٹھی ہوئی گا رہی ہے)

من بندۂ آزادم عشق است امام من عشق است امام من عقل است غلام من

جاں در عدم آسودہ بے ذوق تمنا بود مستانہ نوا ہا زد در حلقۂ دام من

اے عالم رنگ و بو ایں صحبت ما تا چند مرگ است دوام تو عشق است دوام من

پیدا بہ ضمیرم او پنہاں بہ ضمیرم او ایں است مقام او دریاب مقام من

لہ پیام مشرق لہ زبور عجم ص۴۰۔

(یہاں روح جدھر نظر ڈالتی ہے۔ دیواروں میں تجلیوں کے آئینے نصب کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روح شاعر جب ان کے سامنے جاتی ہے تو ان میں اپنا عکس نظر نہیں آتا تجلی الٹ کر اس کے منہ پر ندگاتی ہے۔ روح شاعر کہتی ہے)

بر جہان دل من تا فتنش را نگرید　　کشتن و سوختن و ساختنش را نگرید

روشن از پرتو آں نور دلے نیست کہ نیست　　با ہزار آئینہ پرداختنش را نگرید

(ایوان تجلی میں اب نور کے اتنے سیلاب آنے لگتے ہیں کہ روح شاعر اپنے آپ کو اس میں بہتی ہوئی پاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں آفتاب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ ایوان کے چاروں طرف دیکھتی ہے لیکن راستہ نظر نہیں آتا۔ ایوان کہتا ہے)

عشق میں نور کا غبار　　عشق میں نور کا نثار

عشق میں نور کا حصار　　عشق میں نور کا منار

حیرت صد نگاہ ہے، حیرت صد نگاہ ہے

ظرف نہیں تو دید کیا　　گوش نہیں شنید کیا

رنج نہیں نوید کیا　　سوز نہیں امید کیا

ایک یہ جلوہ گاہ ہے، ایک یہ جلوہ گاہ ہے

سوز یقیں جگا ابھی　　درد جگر بڑھا ابھی

عشق کو جگمگا ابھی　　حسن کے گیت گا ابھی

یاں کی یہ رسم و راہ ہے یاں کی یہ رسم و راہ ہے

دیدے سے ہے بلند حسن　　عشق کی ہے کمند حسن

سوز سے ارجمند حسن　　عشق کی قید و بند حسن

مردیاں نگاہ ہے، مردیاں نگاہ ہے

(اس میں تصنیف کی روح چھپتی جاتی ہے یک یہ تجلی اور روح شاعر دونوں اس میں بہہ جاتے ہیں۔

بے انتہا مسافت طے کرنے کے بعد روحِ شاعر ایک بلند مینار سے ٹکراتی ہے جب روحِ شاعر مشعل کر مینار پر نظر ڈالتی ہے تو اس کا کلس نگاہ کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا ہے حتیٰ کہ نیلگوں رواق سے بھی گذر جاتا ہے۔ روحِ شاعر اس مینار پر چڑھ جاتی ہے نور کا طوفان نیچے ٹکراتا ہے چڑھتے ہی وہ اطراف کی فضا کو دیکھتی ہے۔ جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوقِ ازل اس کی طرف آ رہا ہے۔ یہ مقامِ امید ہے۔

(روحِ شاعر امید کی ترنگ میں معشوقِ ازل کی آمد کے تصور کر کے گاتی ہے)

ونہ تو اندر حرم گنجی نہ در بت خانہ می آئی ولیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی
قدم بے باک تر نہ در حریمِ جانِ مشتاقاں تو صاحب خانۂ آخر چرا دزدانہ می آئی

(مینار کے کلس پر جلوۂ ربانی کوندنے لگتا ہے اور روحِ شاعر یہ دیکھتی ہے کہ چاروں طرف ایک چکاچوند کرنے والا عکس دوسرے پر پڑتا ہے۔ اس طرح برق در برق جلوہ در جلوہ پیدا ہو رہا ہے۔ روحِ شاعر کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ آنکھ بند کر کے جھومنے لگتی ہے اور کہتی ہے)

از[1] چشمِ ساقی مست شرابم بے مے خرابم بے مے خرابم
شوقم فزوں تر از بے حجابی بینم نہ بینم در پیچ و تابم
از من بروں نیست منزل گہِ من من بد نصیبم راہے نیابم

(اب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مینار اور روحِ شاعر دونوں گھمائے جا رہے ہیں۔ اس چکر میں وہ عرش کے نیچے ایک ایسے ازلی میدان میں آنکھ کھولتی ہے۔ جہاں فرشِ شعاعی اور وسعتِ لا انتہا کے سوا کچھ نہیں۔ رفتہ رفتہ بہت دور نور کی ایک لکیر پر یقین اور عشق کے پیکر ستاروں کے ساتھ ساتھ گذرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روحِ شاعر یہ کہتی ہوئی بے ہوش ہو جاتی ہے)

ما راز مقامِ ما خبر کن ما ئیم کجا و تو کجائی!

پردہ

---

[1] زبورِ عجم ص۱۵۸

خطاب آخریں

شاعرِ مستقبل کی روح :-

رازِ ازل عیاں ہوا سینۂ جبرئیل سے — پوچھ لے زندگی اسے تاب و تبِ خلیل سے
دستِ کلیم کی قسم، نور کا فیض عام تھا — خنجر دست پنجۂ عشق میں بے نیام تھا
قدس کی نیک زندگی روح حبیب بن گئی — اوج پہ عشق آ گیا، ایک صلیب بن گئی!
آئینہ ساز عشق تھیں، غار حرا کی خلوتیں — لوٹ رہی تھی اک نظر حسنِ ازل کی دولتیں
چاند ستاروں کی چمک حق کا علم بنی ہوئی — کون و مکاں کی سروری نقشِ قدم بنی ہوئی
روزِ ازل سے اس کا تھا کون و مکاں میں اہتمام — صبرِ حسین پر ہوئی عشق کی زندگی تمام
عرشِ خیال پر وہی نورِ ازل عیاں ہوا — آج پیامِ حسن و عشق نغمۂ جاوداں ہوا
وقت کے آنے والے دور ذوقِ یقین سے کام لے — فکرِ عمل نہ کر سکے عرش نشیں سے کام لے
جلوۂ روح و عقل و دل آئینۂ خودی میں دیکھ — مستیٔ سوزِ جاوداں ساغرِ بے خودی میں دیکھ
حکمت و علم و فلسفہ، خار و خسِ حیات ہیں — تیری سیاستیں نہیں ظلمتِ شش جہات ہیں
عالمِ حسن و دوست میں عشق کی پر فشانیاں — دور کریں گی دہر سے روح کی ناتوانیاں
عشق کا بادۂ ازل ورثۂ جبرئیل ہے — عشق کی بزمِ آتشیں گل کدۂ خلیل ہے!

(پردہ)

محمد عبد القیوم خاں صاحب باقی

دیسی صنعتیں

سنہ ۱۹۱۸ء کی صنعتی کمیشن کا بیان ہے کہ "اس وقت جبکہ جدید صنعتی نظام کا جنم بھوم یعنی مغربی یورپ غیر متمدن قبائل سے آباد تھا، ہندوستان کے بادشاہوں کی دولت اور اس کے صناعوں کی چابکدستی کا شہرہ تھا اور اس کے بہت عرصہ بعد بھی جبکہ مغرب کے اولوالعزم تاجروں نے پہلی بار ہندوستان میں قدم رکھا۔ اس ملک کی صنعتی ترقی یورپ کی ترقی یافتہ قوموں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مگر آج وہی ہندوستان اپنی بیشتر صنعتی ضروریات کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج ہے قدیم زمانے میں ہندوستان کی صنعتوں کی شاندار ترقی اور انیسویں صدی میں ان کا افسوسناک زوال ہمیں دعوت فکر دیتا ہے اس حالات کے ذمہ دار کئی اسباب ہیں۔ نامساعد حالات بھی اہل ملک کی غفلت اور باہر والوں کی ریشہ دوانیاں بھی۔ ذیل میں ان اسباب کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی صنعتوں کے زوال کا سبب یورپ میں طریق پیدائش میں تبدیلی تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد کاروبار کے سیدھے سادے طریقوں کی جگہ پیدائش بر پیمانہ کبیر، پیچیدہ تر تقسیم عمل، اعلیٰ تنظیم اور بڑی بڑی کلوں نے لے لی۔ ذرائع نقل وحمل کی بڑھتی ہوئی سہولتوں، ذرائع معاش کی افزائش اور نوآبادیات کی دریافت نے یورپ والوں کے آگے صنعتی ترقی کا میدان پیش کیا ادھر ہندوستان میں سیاسی غلامی کے ساتھ معاشی پستی بھی پھیلی۔ حکومت اور عوام کسی نے بھی صنعتی ترقی کی کوشش نہ کی ہمارے ہاں کا کاروبار اسی پرانی ڈگر پر چلتا رہا۔ قدیم درباروں کے تباہ ہو جانے اور مضر بیرونی اثرات کی وجہ سے صنعتوں کا حال پہلے ہی خراب ہو رہا تھا اور بقول مسٹر دت "یورپ میں مشین کی بناوٹ کی ایجاد نے ہندوستانی صنعتوں کے زوال کی آخری منزل بھی پوری کرا دی"

(۲) دیسی دربار ملک کی مصنوعات کے سرپرست تھے سیاست کی کروٹ نے ان کو تباہ کر دیا۔ عوام میں افلاس پھیلا جدید حاکموں کا مذاق دوسرا تھا۔ وہ قدیم درباری مصنوعات کے قدرداں نہ تھے

ادھر عوام میں جو لوگ کچھ استطاعت رکھتے تھے اُن پر حاکموں کی تقلید اور مغربی تعلیم کا اثر مذاق کی تبدیلی میں نمودار رہا۔ غرض یہ کہ مصنوعات بے آسرے کے رہ گئیں تباہی یقینی تھی۔

(۳) برطانیہ کی غیر ہمدردانہ روش اور حکومت ہند کی غفلت بھی دیسی صنعتوں کے زوال کا بہت بڑا سبب ہے ایچ، ایچ، ولسن صاحب کی رائے ہے کہ اگر اس قدر بھاری محصول اور ممانعتی قوانین نہ ہوتے تو باوجود دخانی قوت کے پیسلی اور مانچسٹر کے کارخانے شاید ہی چل سکتے۔ برطانوی صناع نے سیاسی ناانصافی کے ہتھیار کو اپنے حریف کے نیچا دکھانے کے لئے استعمال کیا کیونکہ برابر کے مقابلہ میں وہ اس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا تھا۔ غرض یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ برطانیہ نے جان بوجھ کر ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا۔ یہاں کے صناعوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ کمپنی کی حکومت کے زمانے میں اس کے وکلاء ملک کے ہر حصہ میں پھیل گئے۔ سیاسی قوت کے اثر سے انھوں نے دیس کے بے بس صناعوں کو مجبور کیا کہ وہ کمپنی کے سوا کسی سے لین دین نہ رکھیں۔ کمپنی کے کارندے اجارے کے سامان کی من مانی قیمتیں مقرر کرکے صناعوں سے زبردستی معاہدہ کراتے کہ وہ کمپنی ہی کا کام کریں گے۔ اگر وہ وعدہ خلافی کرتے تو ان کو قید میں ڈالدیا جاتا۔ بدنصیب صناعوں نے تنگ آکر زراعت کی طرف رجوع کیا مگر ان کی قسمت سے ان کو وہاں بھی پناہ نہ ملی۔

باوجود اس قدر جور و زبردستی کے بھی ہندوستان کی مصنوعات انگلستان کے بازاروں میں بکتی رہیں آخر کار انگلستان میں ہندوستان کی مصنوعات کی درآمد پر بھاری محاصل عائد کئے گئے۔ کئی ایک صنعتوں کی درآمد انگلستان میں بالکل ہی بند کردی گئی۔ ذیل میں چند محاصل کی کیفیت واضح کی جاتی ہے۔ جو کہ "نمونہ مشتے از خروارے" ہے۔

اشیاء	برطانوی مال پر ہندوستان کا محصول	ہندوستانی مال پر انگلستان کا محصول
روئی کی مصنوعات	۲½ فی صد	۱۰ فی صد
اونی مال	۲ فی صد	۳۰ فی صد
کچا لوہا	×	۵ شلنگ فی ٹن

(۴) انگلستان نے اٹھارویں صدی میں ہندوستانی تجارت کی بدولت ترقی کی تھی اور اب جب

اس کی صنعتی حالت مستحکم ہوگئی تو اس نے دوسرے ملکوں کو اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے تاکا اگر یہ ملک اور خاص کر ہندوستان امن کے طریقے پر عمل پیرا ہوتے تو انگلستان کے مال کی کھپت ممکن نہ ہوتی اسلئے برطانیہ نے آزاد تجارت کی علمبرداری کی۔ مانچسٹر اور لنکا شائر کے کارخانہ داروں کے دباؤ سے حکومت ہند نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ برطانیہ کے بغیر کسی روک ٹوک کے مصنوعات ملک میں درآمد ہونے لگے اور ہندوستان کے سپرد خام پیداوار پیدا کرنے کا کام ہوا۔

(۵) ضرورت تھی کہ برطانوی مال ملک کے گوشے گوشے میں پہونچ کر ہندوستانی مصنوعات کا گلا گھونٹے اس لئے برطانوی سرمایہ داروں نے سب سے پہلے ریلوں میں روپیہ لگایا اگرچہ یہ کام شروع میں منافع بخش ثابت نہ ہوا مگر چونکہ حکومت ہند نے برطانوی سرمایہ داروں کو منافع کی ایک خاص شرح ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا اس لئے انھوں نے اندھا دھند روپیہ لگایا۔ ولیم میسے صاحب نے جو وائسرائے کی کونسل کے وزیر مالیات تھے ایک پارلیمنٹری کمیٹی کے آگے برطانیہ کے سرمایہ داروں کی روش کے متعلق بیان دیا کہ انہیں "اس چیز کی پروا نہیں کہ جو روپیہ انھوں نے قرض دیا وہ کسی تعمیری کام میں صرف ہوتا ہے یا دریا ہگلی میں غرق کیا جا رہا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ کثیر تعداد میں خرچ کیا گیا اور ایسٹ انڈین ریلوے میں فی میل ۳۰۰۰۰ پونڈ خرچ ہوئے" بہرحال اس طرح ریلوں کا جال سارے ہندوستان میں پھیل گیا مشین کی بنی ہوئی سستی بیرونی مصنوعات کے مقابلے میں دیسی صنعتیں پنپ نہ سکیں۔ ریلوے کے محاصل اس انداز سے مقرر کئے گئے کہ باہر کا آیا ہوا مال ملکی مال سے کم خرچ میں منتقل ہو سکے۔

(۶) دیسی صنعتوں کو کسی قسم کی مالی امداد نہ مل سکی حکومت ہند نے ہندوستان کے زر کے ذخیروں سے انگلستان کے کارخانوں کو روپیہ قرض دیا مگر ملک کی ستی صنعتوں کی سرپرستی نہ کی۔ حکومت کے بنکاری کے اداروں یعنی پریزیڈنسی بنکوں اور امپیریل بنک نے اہل ہند کے مفادات کی طرف سے ہمیشہ مجرمانہ غفلت برتی۔

(۷) معاہدہ اٹاوہ میں شاہی ترجیح کا اصول تسلیم کیا گیا جس سے برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت برآمد کو نقصان پہونچتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ برطانیہ یا برطانوی نوآبادیات

کے مقابلہ میں دوسرے ممالک ہندوستان سے زیادہ سامان منگاتے ہیں۔ ترجیح ہمارے لئے صرف اسی صورت میں مفید ثابت ہوگی جبکہ برطانیہ کی مانگ ہماری مشہور اشیائے برآمد کے لئے زیادہ ہو جائے اور غیر ممالک کی مانگ بھی کم نہ ہو۔ ترجیح کا فائدہ مشتبہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ عظمٰی کو ہماری اشیائے برآمدہ کے زیادہ مقدار میں جانے کی امید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں غیر ملکی مال کی درآمد کی کمی کے باعث ان ممالک میں ہندوستانی اشیا کی مانگ یقیناً گھٹ جائے گی"

(خیالات پروفیسر برج نرائن صاحب)

غرض یہ کہ ان سب اسباب نے مل کر ہندوستان کی صنعتوں کو موجودہ حالت پر پہونچا دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس انقلابی دور میں حکومت اور اہل ہند کو صنعتوں کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے کیا انگلستان اور امریکہ کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان میں بھی اسی طرح کی صنعتی ترقی کے حصول کی کوشش کی جائے! یا جدید طرز کی صنعتوں کی طرف سے بالکل بے نیازی برتی جائے! یا پھر جاپان کی طرح جدید صنعتوں اور گھریلو دستکاریوں کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔

صنعتی ترقی کی نوعیت کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ ہمیں یہ ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ صنعتی ترقی محض ایک ذریعہ ہے جس کا مقصود تمام قوم کی معاشی خوشحالی ہے۔ یورپ کے جدید صنعتی نظام کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہاں ذریعہ کو مقصد قرار دے لیا گیا ہے۔ عہد حاضر کے اکثر سیاسی جھگڑے اسی غلطی کا نتیجہ ہیں وہاں مشین آدمیوں کو بیکار کر دیتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جدید انتظام کی بدولت جسے (Rationalisation) کہتے ہیں۔ امریکہ میں چالیس فی صدی آدمی بیکار ہو گئے۔ (بحوالہ رسالہ ہندوستانی اقتصادیات مضمون متعلقہ معاشی خیالات از مہاتما گاندھی) علاوہ اس کے ان ممالک میں جو پیداوار ہوتی ہے وہ اپنے ملک کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جس کی نکاسی کے لئے انکو دوسرے ممالک کو اپنی منڈی بنانا پڑتا ہے۔

ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک فی صد بڑے پیمانے کی صنعتوں میں مشغول ہے اور ہندوستان دنیا میں آٹھویں درجے کا صنعتی ملک تصور ہوتا ہے اگر موجودہ صنعتی پیداوار کو دوگنا کر دیا جائے تو یہ اچھی خاصی ترقی ہوگی مگر ہندوستان کی آبادی ہی کا اضافہ ایک فی صد سالانہ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ صنعتی ترقی کا

یہ اضافہ آبادی کے اضافے کی وجہ سے بیکار ہو جائے گا۔ اور ہمارا اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے گا جو تمام ملک کے باشندوں کے لئے روزگار فراہم کرنا ہے۔

پھر اگر بالفرض ہم اپنی تمام آبادی کو بھی بڑے پیمانے کی صنعتوں میں لگا دیں تو ہماری صنعتی پیداوار اتنی بڑھ جائے گی کہ ہمیں برطانیہ اور امریکہ سے بھی کہیں زیادہ بڑے علاقے کو اپنی منڈی بنانا پڑے گا اور یہ چیز خود کفالتی اور معاشی بے نیازی کے چرچوں کی وجہ سے بالکل ناممکن ہے۔ ہندوستان محض برآمدی ملک بھی نہیں بن سکتا کیونکہ آج کل تجارتِ خارجہ مبادلہ اشیا کے طریقے پر چلتی ہے۔ جتنی قیمت کا مال ہم برآمد کریں (جس کی مقدار مفروضہ بالا میں بے انتہا ہوگی) اتنا ہی مال درآمد بھی کرنا پڑے گا لیکن اگر ملک میں اسکی طلب اور مصرف نہ ہو تو تجارت خارجہ سرے سے بند ہو جائے گی۔

غرض یہ کہ محض جدید پیمانے کی صنعتوں کا چلانا کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف قدیم وضع کی صنعتوں سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ یہ مانا کہ قدیم زمانے میں ہندوستان میں چھوٹے اور متوسط پیمانے کی صنعتوں ہی کا رواج تھا۔ ملک خود کفیل تھا اور خوشحال۔ مگر آج کل حالات بدل چکے ہیں۔ مسابقت کے اس دور میں یہ طریق کار نہیں چل سکتا۔

بہترین حل اس مسئلے کا یہ ہے کہ قدیم اور جدید صنعتوں کو پہلو بہ پہلو چلایا جائے۔ جاپان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اہل جاپان نے بعض ایسے کاموں کو جو تمام کے تمام مشین سے ممکن تھے چھوٹے چھوٹے کاموں میں تقسیم کر کے گھریلو دستکاروں کو دیدیا۔ دستکار کارخانوں کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں اور بعد میں اپنے نتائج لاکر کارخانے کو دیدیتے ہیں جہاں مشین کے ذریعہ ان کی تکمیل کر دی جاتی ہے دیاسلائی اور پارچہ بافی خصوصاً ریشم کی صنعت اور بہت سی دوسری صنعتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہندوستان میں بھی یہی طریقہ کامیاب بن سکتا ہے۔ ایک ہی ملک میں ایک ہی پیشہ کی مسابقت سے چھوٹے دستکاروں کو نقصان کا زبردست اندیشہ ہے لیکن اگر مندرجہ بالا طریقے سے گھریلو صناعوں اور بڑے کارخانوں میں اشتراک عمل پیدا کر دیا جائے تو بہترین نتائج کا حاصل ہونا یقینی ہے۔ حاصل یہ کہ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں کو ترقی دینی چاہئے بلکہ طریق پیدائش میں اصلاح کر کے جدید مصنوعات سے ان کا ربط

قائم کر دینا چاہئے۔

اب ہمیں غور یہ کرنا ہے کہ کیونکر ان دستکاریوں کو ترقی دی جائے۔ ان کی امداد اور اصلاح کیلئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

(۱) قدیم صنعتوں کی امداد اور ترقی کے لئے پہلا قدم یہ اٹھانا چاہئے کہ ملک کی تمام گھریلو دستکاریوں کی مکمل تحقیقات کی جائے اور جو صنعتیں ابھرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کی ممکنہ امداد کی جائے۔

(۲) گھریلو دستکاریوں کی کامیابی کے لئے پہلی ضرورت دستکاروں کی تعلیم کی ہے۔ ان کو عام تعلیم اور صنعتی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں جگہ جگہ صنعتی اسکول کھول دینے چاہئیں اور اگر ممکن ہو تو عام طور پر اسکولوں اور کالجوں میں بھی دستکاریوں کی تعلیم بحیثیت ایک لازمی مضمون کے دی جائے تاکہ پڑھ لکھ کر ہمارے نوجوان بیکاری کی مصیبت میں گرفتار نہ ہوں۔

(۳) ضرورت ہے کہ تحقیقات فنی کا ایک ایسا ادارہ کھولا جائے جو گھریلو دستکاریوں کے کاروبار کی اصلاح اور ان کی وسعت کے امکانات پر غور کرے اور دستکاروں کے آگے بہتر سے بہتر لائحہ عمل پیش کرے۔

(۴) عمل پیدائش میں کافی اصلاح کی گنجائش ہے۔ چھوٹے پیمانے کے کاروباروں میں تقسیم عمل کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن جدید آلات اور زیادہ تنظیم کی بدولت تقسیم عمل کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ جدید آلات کے ساتھ اعلیٰ درجے کی خام پیداوار کی بھی ضرورت ہے تاکہ تیار شدہ اشیا کی قسم بہتر بنائی جا سکے۔ سستی قیمت پر اعلیٰ درجے کی خام پیداوار اور جدید آلات دستیاب نہیں ہو سکتے بغیر معقول مالی امداد کے یہ کام ناممکن ہے

۵۔ مالی امداد۔ صنعتی کمیشن کی رائے ہے کہ صنعتوں کے ناظم کی وساطت سے دستکاروں کو اصل کی ضروریات کے واسطے قرضے دئے جائیں۔ باقساط طریقہ خرید پر آلات تقسیم کئے جائیں لیکن بہترین حل اس مسئلے کا شاید امداد باہمی سے ممکن ہے۔ اگر صنعتی بنک کھول دئے جائیں تو وہ نہ صرف بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو مدد دے سکیں گے بلکہ اپنی شاخوں کے ذریعہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی بھی امداد کر سکیں گے۔ بہت سے صوبوں میں صنعتوں کو حکومت کی مالی امداد وغیرہ کے متعلق قوانین بھی بن چکے ہیں لیکن ابھی حکومت کی امداد کو بڑھانے کی بہت ضرورت ہے۔

(۶) دستکاروں کی جہالت اور ان میں کسی تنظیم کا نہ ہونا بھی گھریلو دستکاریوں کی پست حالی کا بڑا سبب ہے۔ کارخانہ داری کا طریقہ قابلِ اعتراض ہے۔ کارخانہ دار ملازمین سے کام تو لیتا ہے لیکن ان کی فلاح کا زیادہ خیال نہیں رکھتا۔ ضرورت ہے کہ امدادِ باہمی کی انجمنوں کے ذریعہ دستکار خود اپنے کارخانے قائم کریں۔

(۷) جب تک فروختِ پیداوار کی سہولتیں نہ ہوں یہ سب انتظام بیکار ثابت ہوگا۔ منظم بازار نہ ہونے کی وجہ سے دستکار اپنی چیزوں کی پوری پوری قیمت وصول نہیں کرسکتا۔ فروختِ پیداوار کے لئے انجمنہائے فروخت کا وجود ضروری ہے۔ ہمارے پاس بیرونی بازار تو ہیں ہی نہیں اور اندرونی منڈیوں کی حالت بھی قابلِ اصلاح ہے۔ بمبئی کے سودیشی اسٹورز میں ملکی پیداوار کی فروخت کے لئے قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ محکمۂ صنعت کو اس قسم کے تجارتی اداروں کے ساتھ کام کرکے ہندوستان کی دستکاریوں کو اندرونِ ملک و بیرونِ ملک کے گاہکوں تک پہونچانے میں مدد کرنی چاہئے۔ ابھری ہوئی دیہی صنعتوں کے اتحاد اور وسیع ترین ممکنہ منڈی کے حاصل کرنے کے لئے مرکز میں ایک تجارتی ادارہ قائم کرنا چاہئے۔ لائسنس یافتہ گوداموں اور امدادی فروخت گاہوں کی بھی ضرورت ہے۔ جہاں دیہی پیداوار کے ذخیرہ کرنے اور فروخت کرنے کا انتظام ہو۔

(۸) ایک عام شکایت یہ ہے کہ پبلک کا مذاق بگڑ گیا ہے اور وہ گھریلو دستکاریوں کی طرف توجہ نہیں دیتی۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ دستکاروں کو کام کرنے کے لئے جدید قسم کے نمونے فراہم کئے جائیں نیز ضرورت ہے کہ پوری قوت کے ساتھ دیسی فن کاری کے نمونوں کی تشہیر کی جائے۔ نمائشیں منعقد کی جائیں اور ہر طریقے سے گھریلو صنعتوں کو رواج دیا جائے۔ پروپیگنڈے کی ضرورت ہر جگہ ہے اور دیہی صنعتوں کی ترقی کی ہر کوشش میں اس سے کام لینا چاہئے۔

اگر ہم گھریلو صنعتوں کو مکمل طور سے ترقی دینے میں کامیاب ہوگئے تو یقین ہے کہ ملک کے سب سے بڑے مسئلے یعنی بیروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

آیت اللہ بیگ صاحب عارف

جرمنی اور سوویٹ کی جنگ

لینن اور ٹروسکی کا خیالی مکالمہ

(اس مضمون کا مواد ٹروٹسکی کی مشہور کتاب The Revolution Betrayed سے لیا گیا ہے۔ جوہر صاحب ٹروٹسکی کے معتقدین میں سے ہیں۔ یہ مضمون انھوں نے جنگ کے شروع ہونے پر لکھا تھا۔ اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھنا چاہیں تو وہ بخوشی 'جامعہ' میں چھاپا جا سکتا ہے۔ مدیر)

لینن۔ آج تو عجیب خبر سن رہا ہوں ٹروٹسکی!

ٹروٹسکی۔ کیا خبر!

لینن۔ کہ جرمنی اور سوویٹ میں جنگ شروع ہو گئی کیا تمھیں اس کا کچھ علم ہے!

ٹروٹسکی۔ جب میں دنیا میں تھا اس وقت تو جرمنی اور سوویٹ میں ایک معاہدہ دستخط ہوا تھا اور میں اسی وقت سمجھتا تھا کہ اس معاہدہ کی عمر شاید ہی دو برس ہو۔ بہت ممکن ہے کہ جنگ شروع ہو گئی ہو میں ابھی معلوم کرکے آتا ہوں۔ (ٹروٹسکی جاتا ہے اور کچھ دیر بعد معلوم کرکے واپس آتا ہے)

لینن۔ کیوں ٹروٹسکی کیا معلوم ہوا!

ٹروٹسکی۔ وہاں تو لاکھوں سپاہی آئے ہوئے ہیں جنگ بڑے زور شور سے جاری ہے۔ روسی افواج پسپا ہو رہی ہیں جنگ شروع ہوئے ۱۲ دن بھی نہیں ہوئے ہیں کہ جرمنی کی فوجیں ماسکو کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ سنتا ہوں کہ سوویٹ فوجیں مقابلہ تو کر رہی ہیں لیکن جرمنی کا پلہ بھاری ہے۔

لینن۔ یہ کیسے ہوا ٹروٹسکی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میرے بعد بھی ترقی جاری رہے گی اور سوویٹ ایک طاقتور پرولتاری حکومت ہو جائے گا لیکن جرمنی کی کامیابی سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ سوویٹ کی جو حالت میرے زمانہ میں تھی شاید اس سے بھی ابتر ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ وہاں کی اقتصادی حالت کیسی ہے۔

ٹروٹسکی۔ وہاں کی اقتصادی حالت کیا حالت بتاؤں! مجھے تو اسٹالین نے روس سے نکال دیا تھا اس لئے کچھ

اخباروں اور دوستوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتا رہتا تھا وہی جانتا ہوں۔ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی اقتصادی حالت اچھی نہیں ہے سوویٹ کی تیل کی صنعت کا افسر اعلیٰ لکھتا ہے:۔

۔ہماری صنعت میں وہی مشینیں استعمال ہوتی ہیں جو امریکہ میں لیکن ہمارے یہاں ماہر کاریگر کم ہیں اس لئے مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ بہت ہوتی ہے کام کرنے والے لاپرواہیں اور ماہرین اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کرتے۔

مولوٹوف کہتا ہے۔

۔ہم عمارت کے کام میں بہت پیچھے ہیں۔ عمارت کا کام پرانے طریقہ پر پرانی وضع کے اوزاروں سے کیا جاتا ہے:

اس قسم کے بہت سے جملے سوویٹ کے سربرآوردہ اصحاب کی زبان سے نکلتے رہتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کام تسلی بخش نہیں ہو رہا ہے۔ اگرچہ روس میں خام جنسوں کی پیداوار میں کافی ترقی ہوگئی ہے لیکن جب تک ملک میں اعلیٰ قسم کی مشینیں نہ تیار ہوں اسوقت تک لوہے، کوئلہ وغیرہ کی پیداوار بہت کم معنی رکھتی ہے۔ ملک کی صنعت وحرفت زیادہ تر فوجی محکمہ کا کام کرتی رہتی ہے لیکن محکمۂ فوج کا اعلیٰ افسر ریشیوٹوف لکھاتیا کہتا ہے:۔

جس قسم کی اشیا فوجی محکمہ کے لئے تیار کی جاتی ہیں ان کی مضبوطی وغیرہ قابل اطمینان نہیں ہوتی۔ یہ کافی مخدوش بیان ہے۔ رسل ورسائل بڑی خراب حالت میں ہیں۔ سڑکیں اتنی خراب ہیں کہ بڑی شاہراہوں پر موٹر گھنٹے میں صرف ۶ میل چل پاتی ہے۔ ملک میں سڑکیں بہت کم ہیں ہر ۱۰۰۰۰ آدمیوں کے لئے جرمنی میں ۴،۸ کیلو میٹر اور روس میں صرف ۵ کیلو میٹر ریل ہے۔ سوویٹ میں ریل کی پٹری تمام ترقی یافتہ ملکوں سے کم ہے۔ فرانس میں ۱۰۰۰ آدمیوں کے پاس ۵ر۴ موٹریں ہیں لیکن روس میں صرف ۲، ہیں۔ سوویٹ میں ایک سال میں مال کی موٹر امریکہ کی مال کی موٹر کی نسبت صرف ۱/۵ سفر طے کرتی ہے۔ ۱۰۰ میں سے ۵۰ مشینیں اس قابل نکلتی ہیں کہ کچھ عرصہ کام کرسکیں باقی کو کچھ کام کے بعد مرمت خانہ جانا پڑتا ہے۔ مرمت کا خرچ نئی مشین تیار کرنے سے دوگنا ہے

حکومت اس نقص کا اعتراف کرتی ہوئی لکھتی ہے :-

"موٹر کے ذریعے ریل کا سالانہ خرچ جنس بنانے کے پرزے کو بہت بڑھا دیتا ہے"

بقول (Council of Peoples' Commissariat) ریل میں بھی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سوویٹ میں ماہر کاریگروں کی بہت کمی ہے۔ اس کمی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ بجلی کی سوئچ صاف رکھنا ایک ایسا مشکل کام ثابت ہو رہا ہے کہ ان کی صفائی کے متعلق کریملین کے سب سے بڑے افسروں کو رپورٹ کی جاتی ہے۔ پراودا اخبار لکھتا ہے۔

"کپڑے کی صنعت بڑی ردی حالت میں ہے۔ مال اکثر ناقص سستا اور صرف دو چار نمونہ کا ہوتا ہے" لوہے کے روزمرہ کے استعمال کے برتن اور فرنیچر بڑا بھونڈا تیار ہوتا ہے۔ ملک کی عام پسماندگی کا یہ عالم ہے کہ روس میں اچھے قسم کے بٹن ملنے مشکل ہیں۔ دارالخلافہ اور دوسرے تجارتی شہر اپنے آپ کو بڑے اور خوشنما سینما، تھیٹر اور کلب گھروں سے تو مزین کر رہے ہیں لیکن رہنے کے مکانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اخبار ازوستیا لکھتا ہے۔

"ہم کافی خرچ کرنے کے بعد بھی ایک خراب عمارت بنا پاتے ہیں۔ عمارتیں مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بڑی خراب حالت میں ہیں۔ مرمت اول تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی ہے تو بری طرح اور ناکافی"

ملک کی صنعت و حرفت کا چونکہ ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ایک صنعت کی پسماندگی کا اثر دوسری پر پڑتا ہے اور دوسری کا دس اور پر۔ اس طرح ملک کی تمام صنعت و حرفت آشوبی ہو کر رہ گئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویٹ میں ایک مزدور ۳ٹن کوئلہ نکال پاتا ہے۔ اور جرمنی ۲ٹن نکالتا ہے۔ ایک مزدور سوویٹ میں ۷۶ کیلو گرام فولاد نکال پاتا ہے اور امریکہ میں ۲۰۰ کیلو گرام نکالتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں سوویٹ یونین میں فی کس ۱۵۳ کلو واٹ بجلی حصہ میں آتی ہے اور جرمنی میں ۲۷۴۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں سوویٹ میں ایک میٹر کپڑا فی کس حصہ میں آتا تھا۔ اونی کپڑا صرف امرا اور درمیانہ طبقہ کے لوگوں کو میسر آتا تھا۔ عوام جاڑوں میں بھی سوتی کپڑا استعمال کرنے پر مجبور رہتے۔

"سوویٹ یونین میں جتنے لوگ ننگے پیر رہتے ہیں شاید ہی دوسرے ملکوں میں رہتے ہوں۔ سوویٹ میں

۲۸ اور جرمنی میں ہر ۳ آدمیوں کے پاس گائے ہے اور اگر دودھ کی مقدار کا حساب لگایا جائے تو جرمنی کی ایک گائے روس کی دو گایوں کے برابر ہے کاغذ کے اعداد و شمار بہت دلچسپ ہیں کیونکہ یہ کسی ملک کی تہذیب و تمدن و ترقی کا پتہ دیتے ہیں ۱۹۲۵ء میں روس میں فی کس ۴ کیلوگرام کاغذ خرچ ہوتا تھا۔ اور جرمنی میں ۷ ۴ کیلوگرام امریکہ میں ایک سال میں فی کس ۲۱ پنسلیں استعمال کی جاتی ہے اور سوویٹ میں صرف ۴ اور وہ چار بھی امریکہ کی ایک پنسل کے برابر کام دیتی ہیں۔ اخباروں میں اکثر اس قسم کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں کہ کاغذ اور پنسل کی کمی کی وجہ سے اسکول کے کام میں بہت دقت محسوس ہوتی ہے

لینن۔ ٹراٹسکی تمہاری باتیں سن کر تعجب ہوتا ہے اگرچہ یہ حالات ۱۹۲۵ء کے ہیں لیکن اس سے روس کی ۱۹۴۱ء کی حالت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ سنتا ہوں کہ ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹالین ۱۵ سال میں نہ کر سکا۔ مجھے احساس ہے کہ روس اپنی پسماندگی اپنے کاندھوں پر اٹھا کے چل رہا ہے۔ ہر قوم کو اپنا ماضی اپنے ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ اشتراکی ملکیت قائم کرنے اور نقشہ کے مطابق اقتصادی زندگی کو ترتیب دینے کا یہ اثر ہوگا کہ روس دس پندرہ سال ہی میں سرمایہ دار ملکوں کے دوش بدوش آجائے گا۔

ٹراٹسکی۔ میرا بھی یہی خیال تھا اور اس ترقی کا امکان بھی تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پارٹی کمزور ہوگئی اور حکومتی طبقہ کو دبانے کیلئے ہم نے جو کنٹرول کمیشن مقرر کیا تھا حکومتی طبقہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کو اپنے طبقہ کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے یہاں آنے کے ذرا ہی بعد اسٹالین اور حکومتی طبقہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سوشلزم ایک ملک میں جاری کیا جا سکتا ہے اس کو دوسرے ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت سے کوئی سروکار نہیں۔ جب میں نے یہ کہا کہ سوویٹ کو اقتصادی دوڑ میں بین الاقوامی ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی رفتار کو بہت تیز کرنا چاہئے تو مجھ سے کہا گیا کہ میرا بین الاقوامی نقطہ نگاہ غلط ہے۔ جب میں نے بجلی کا ایک بڑا اسٹیشن بنانے کی تجویز پیش کی تو اسٹالین نے کہا کہ بجلی کا اسٹیشن بنانا روس جیسے پسماندہ ملک کے لئے ایسا ہے جیسے کسی کسان کا بجائے گائے کے گراموفون خریدنا۔ سوویٹ میں اقتصادی ترقی کچھوے کی چال سے ہوتی ہے حالانکہ دنیا

کی اقتصادی حالت دیکھتے ہوئے ہرن کی رفتار دکھا رہے۔

لینن۔ یہ ایک ملک کا نظریہ کیا ہے؟

ٹروٹسکی۔ کہ ہم صرف سوویٹ میں اشتراکی نظام قائم رکھ سکتے ہیں، ہمیں بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کرنے کی سعی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسٹالین نے ایک نامہ نگار رائے ہیوورڈ کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

"دنیا میں انقلاب کرنا نہ ہمارا مقصد ہے اور نہ ہم اس کی تدبیر کرتے ہیں یہ ایک بڑی تکلیف دہ اور مضحکہ خیز غلط فہمی دنیا میں پھیل گئی ہے کہ ہم تمام ممالک میں اشتراکی انقلاب کرنا چاہتے ہیں ہمارا ہر کہیں انقلاب کرنا لغو ہے۔ ہاں اگر کوئی ملک خود انقلاب کرنا چاہے تو کرے۔ ہم انقلاب کرنا چاہتے تھے چنانچہ ہم نے انقلاب کر دیا۔"

لینن۔ اس پر نامہ نگار نے اسٹالین سے یہ دریافت نہیں کیا کہ اگر ایک ملک میں انقلاب کا نظریہ درست ہے تو ماسکو میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کس مقصد کے لئے قائم ہے؟

ٹروٹسکی۔ بیچارا نامہ نگار اس قسم کے سوالات کیسے کر سکتا تھا۔ اس قسم کے سوال و جواب تو لی بھگت ہوتے ہیں

لینن۔ جب ہم نے کیمونسٹ انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی تو پکار پکار کر کہا کہ مختلف ملکوں کی پرولتاری جماعتوں کو ایک دوسرے کی مدد زبانی نہیں بلکہ ہتھیاروں سے کرنی چاہئے۔ ہم نے خود فنلینڈ، لٹویا، استھونیا، جارجیہ کی مدد اسی نوع سے کی تھی جب پولینڈ کی پرولتاری جماعت نے انقلاب کرنا چاہا تو ہم لال فوج لے کر وارسا پر جا دھمکے۔

ٹروٹسکی۔ ۱۹۲۶ء میں ہم نے چینی کیمونسٹ کی مدد کے لئے کمانڈر اور تنظیم کرنے والے روانہ کئے اور اسی سال لاکھوں روبل انگلستان کے ہڑتالی مزدوروں کو روانہ کئے کسی زمانہ میں بین الاقوامی انقلاب کا تخیل ہمارا بنیادی سیاسی تخیل تھا آج وہ اسٹالین کے نزدیک ایک تکلیف دہ اور مضحکہ خیز غلط فہمی ہو گیا ہے سنتا ہوں کہ موجودہ جنگ میں یوگوسلاویا پر حملہ ہوا جہاں اشتراکیوں کا زور تھا لیکن سوویٹ کا حکومتی طبقہ باوجود معاہدہ ہونے کے ان کو تباہ ہوتے دیکھتا رہا۔

لینن۔ اسٹالین اور حکومتی طبقہ نے جب ملکی اور قومی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرنا چاہا تو پرولتاری جماعت

اور ہماری پارٹی کے عام ممبروں نے مخالفت کیوں نہیں کی؟

ٹروٹسکی۔ پارٹی کے عام ممبر اور پرولتاری جماعت کیا مخالفت کرتی۔ آپ کے سامنے ہی خود پارٹی میں ایک اونچے لوگوں کی ذات پیدا ہو گئی تھی۔ آپ کے دنیا سے روانہ ہوتے ہی اس سربرآوردہ طبقے نے آپ کی یادگار میں؛ Leninist Levy کی یعنی پارٹی کے دروازے کھول دئے اور جس کسی نے درخواست کی اسی کو پارٹی کا ممبر بنا لیا چنانچہ پارٹی میں بے اندازہ مجازی اور ٹٹ پونجیا بورژوازی داخل ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے انقلاب کرنے میں تو حصہ نہیں لیا تھا لیکن جب انقلاب سے فائدہ اٹھانے میں پیش پیش تھے۔ یہ لوگ اپنے مفاد کی خاطر حکومتی طبقہ سے جا ملے اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ پارٹی میں حکومتی طبقہ کی بہت بڑی اکثریت ہو گئی اور بلا خوف مخالفت حکومتی طبقہ اپنے مفاد میں حکومت چلانے لگا۔ حکومتی طبقے نے آہستہ آہستہ نہ صرف مرکزی کمیونسٹ انٹرنیشنل کے اعمال کو بدل دیا بلکہ دوسرے ممالک کی کمیونسٹ پارٹی کے اطوار کو بھی اپنے اثر سے بدل ڈالا اور بجائے انقلابی لوگوں کے ایسے لوگوں کو لیڈر مقرر کر دیا جو سوویٹ کے حکومتی طبقہ کی پالیسی کے مطابق چلیں۔ سوویٹ کی پالیسی اسٹالین کے محدود انقلاب کے نظریہ کی بموجب صلح کل بنی ملکی اور قومی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرنے کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو مدد نہیں دی گئی اور وہ تباہ ہو گئیں ان کی تباہی کا روس کی پرولتاری جماعت پر یہ اثر ہوا کہ ان کا دل بیٹھ گیا۔ میرے ہم خیال لوگوں کی بابت حکومت نے یہ کہنا شروع کر دیا۔

"یہ لوگ بین الاقوامی انقلاب کے تخیل کو پیش کر کے سوویٹ کو دوسرے ملکوں سے لڑوانا چاہتے ہیں۔ ہم کافی زخم کھا چکے ہیں۔ اب ہمیں حق ہے کہ کچھ عرصے آرام کریں۔ ہم اپنے ملک میں اشتراکی نظام رکھیں گے سب کو چاہئے کہ لیڈروں کی رہنمائی پر اعتبار کریں"

حکومتی طبقہ کا آرام کا نظریہ اکثریت کو بھا گیا۔ بین الاقوامی پرولتاری متحد ہو جاؤ کا نظریہ پیچھے جا پڑا۔ اسٹالین کی سیاست بین الاقوامی نظریہ سے ہٹ کر ملکی اور قومی نقطہ پر آ ٹھہری اور دوسرے ملکوں کی پرولتاری تحریکوں کی فنا و بقا کا معیار یہ ٹھہرا کہ روس کا مفاد کس میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ ہر ملک میں قومی اور ملکی مفاد کا نظریہ زور پکڑ گیا اور سوویٹ بجائے اور سلطنتوں کے ایک سلطنت ہو گیا سوویٹ کی ملکی اور قومی سیاست کا یہ اثر ہوا کہ تمام یورپ میں فسطائی رجحانات زور پکڑ گئے اور فسطائی ڈکٹیٹر برسر اقتدار آ گئے۔ میں برابر یہ اعلان کر رہا تھا کہ بین الاقوامی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرو اور دوسرے ملکوں کی سرمایہ دارانہ معاہدہ کرنے کے بجائے ان ملکوں کی پرولتاری جماعت سے اتحاد عمل رائج کرو اور ان کو ہر امکانی کوشش سے طاقتور بناؤ تاکہ اگر کوئی سرمایہ دار حکومت روس پر حملہ بھی کرنا چاہے تو مقامی پرولتاری جماعت کے خوف سے سوویٹ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اگر آج جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی طاقتور ہوتی اور اس کا مطمح نظر کسی ملک اور قوم کا بچانا نہ ہوتا بلکہ ان اصولوں کو بچانا ہوتا جو ہمارے اکتوبر کے انقلاب کے حامل ہیں تو روس کو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ستم تو یہ ہو رہا ہے کہ سوویٹ کے احرار کی تقریروں میں بھی عوام سے یہ اپیل کی جاتی ہے کہ مادر وطن کو بچاؤ۔ سوویٹ کی ایک ایک انچ زمین کے لئے خون بہا دو۔ سوویٹ قوم کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو وغیرہ۔ در اصل کہنا یہ چاہئے کہ اشتراکی ملکیت کو بچاؤ۔ غریب کی آزادی کو بچاؤ۔ اشتراکی طریق پیداوار کو بچاؤ۔ اب سوویٹ کے حکومتی طبقہ کا بھی وہی تخیل ہے جو سرمایہ دار ملکوں کا۔ واقعہ یہ ہے کہ جرمنی سے قبل ہی سوویٹ میں ڈکٹیٹری حکومت قائم ہو گئی تھی اور بورژوازی اثرات اتنے نمایاں ہو گئے تھے کہ عوام میں ایک لفظ (Sov Born) عام ہو گیا تھا۔ یہ لفظ Soviet Bourgeois کا مخفف ہے۔

لینن پارٹی نے بین الاقوامی انقلاب کے تخیل کو پس پشت ڈال کر روسی انقلاب کو فنا کر دیا۔ ہماری گزشتہ زندگی ہی بین الاقوامی انقلاب کی مرہون منت ہے شروع زمانہ میں آسٹریا اور جرمنی کی فوجیں اس وجہ سے ہم پر حملہ نہ کر سکیں کیونکہ ان ممالک میں خود انقلابی حالات پیدا ہو گئے تھے۔ کوئی چار ماہ کے اندر ہی اندر جرمنی آسٹریا اور ہنگری میں بلوے ہو گئے اور برسٹ لٹوسک کا معاہدہ جو ہمارے مفاد کے خلاف تھا خود بخود کالعدم ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں کالے سمندر میں ملاحوں نے بلوہ کر کے فرانس کو مجبور کیا کہ روس سے فوجیں ہٹائے۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں مزدوروں کی جد و جہد سے مجبور ہو کر انگلستان نے

اپنی فوجیں روس سے ہٹائیں جب ہمیں ۱۹۲۰ء میں وارسا پر شکست ہوئی تو یہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی پرولتاری جماعت کی جد و جہد تھی جس نے سرمایہ دار ملکوں کو پولینڈ کی مدد پر آنے سے روکا درحقیقت سوویٹ کی طاقت کا انحصار دو قسم کی فوجوں پر ہے ایک تو سوویٹ فوج اور دوسرے ہماری وہ فوج جو سرمایہ دار ملکوں میں ہے یعنی سرمایہ دار ملکوں کی پرولتاری جماعت وہ بھی ہماری فوج ہی ہے اس فوج کو طاقتور بنانا بھی ہمارے لئے اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ سوویٹ کی فوج کا پرولتاری جماعت خفیہ سازشوں سے دشمن کو سوویٹ فوج کی نسبت زیادہ نقصان پہونچا سکتی ہے۔

ٹروٹسکی۔ لیکن آج کل تو ایک تیسری فوج کو طاقتور بنایا جا رہا ہے۔

لینن۔ وہ کونسی؛

ٹروٹسکی۔ خفیہ پولیس (G.P.U) جس نے روس میں ایسا غدر مچایا کہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں ہے اور سب انقلابی لوگ سائبریا پہونچا دیے گئے ہیں۔ میں بھی اسی پر زور دیتا تھا کہ یورپ کی پرولتاری جماعت اور دنیا کی محکوم قوموں سے اتحاد عمل پیدا کرو لیکن روس جمعیۃ الاقوام میں داخل ہو کر موجودہ ملکی تقسیم کا حامی ہو رہا تھا۔ اور وہ موجودہ ملکی تقسیم کی پالیسی اس قسم کی تھی کہ جب اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا تو اٹلی کے بیڑے کو باکو سے تیل جاتا رہا جب جاپان نے مشرقی چینی ریل پر قبضہ کر لیا تو سوویٹ نے کان تک نہ ہلایا کہ کہیں دنیا کی صلح ختم نہ ہو جائے۔ اس رویہ کو جاپان اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی جرأت اور بھی بڑھی اور جاپان نے منگولیا پر بھی آنکھ ڈالی سوویٹ کے حکومتی طبقہ کا خیال تھا کہ سرمایہ داری کا تضاد سرمایہ دار ملکوں میں جنگ برپا کر دے گا اور جس نسبت سے سرمایہ دار ملک تباہ ہوں گے اسی نسبت سے سوویٹ طاقتور ہو جائے گا اور پھر ان ملکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی انقلاب کرنا آسان ہو جائے گا میں نے امریکہ میں بیان دیتے ہوئے صاف صاف کہدیا تھا کہ سرمایہ دار حکومتیں آپس میں خواہ کتنا ہی کشت و خون کر لیں لیکن دوران جنگ میں ایک ایسا موقعہ ضرور آئے گا جبکہ وہ آپس میں لڑنے کے بجائے سوویٹ پر حملہ کر دیں گے۔

لینن۔ ٹراٹسکی یہ تو بتاؤ ال فوج کا کیا حال ہے۔

ٹراٹسکی۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں جبکہ جرمنی کی طرف سے خطرہ نہیں تھا اس وقت کل فوج ۵۶۲۰۰۰ تھی جرمنی سے خطرہ ہوا تو ۱۳۰۰۰۰۰ کر دی گئی تھی لیکن اب فوجی نظام بدل دیا گیا ہے۔ آپ کے زمانہ میں تو فوج میں جمہوری طریقہ پر انتخاب کے بعد افسر مقرر کئے جاتے تھے جس طریقہ کار کی یہ خوبی تھی کہ لائق اور تجربہ کار لوگ افسر مقرر ہوتے تھے لیکن اب حکومتی طبقہ اپنے مفاد کو مد نظر رکھ کر افسر مقرر کرتا ہے۔ ہم نے فیلڈ مارشل، جنرل، کمانڈر وغیرہ کے خطابات اڑا کر مساوات قائم کی تھی لیکن اب وہ سب خطابات از سر نو جاری ہو گئے ہیں اور فوجی افسروں کی ذاتیں بن گئی ہیں۔ در اصل فوج بھی سماج کا ایک جز ہوتی ہے جب سماج میں ذاتیں بن گئیں تو فوج کہاں بچ سکتی ہے۔ چنانچہ نا اہل لوگ فوج میں بڑے بڑے عہدوں پر آ گئے ہیں جس کا نتیجہ اس جنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سوویٹ فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔ سامان حرب جس قسم کا بنا ہوا ہے اس جنگ سے اس کا بھی پردہ فاش ہو گیا۔ جب میں ان امور پر تنقید کرتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ ٹراٹسکی تو اسٹالین کا رقیب ہے اس لئے تنقید کر کے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے لیکن اب سنتا ہوں کہ سامان حرب کے لئے انگلستان اور امریکہ سے التجا ہو رہی ہے اور فیلڈ مارشل بدلے جا رہے ہیں۔

لینن۔ ٹراٹسکی۔ آخر اس جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا؟

ٹراٹسکی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں خواہ اسٹالین فتح پائے یا شکست سوویٹ کا جو کچھ بھی بگڑا ہوا نظام ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ اگر دوسرے ممالک میں پرولتاری انقلاب ہو جائے تب تو البتہ امید ہے کہ اشتراکی نظام اور مستحکم ہو جائے بہت ممکن ہے کہ جیسے پہلی جنگ میں سرمایہ داری کی زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ٹوٹ گئی تھی اسی طرح اس جنگ میں شاید سرمایہ داری کی کوئی مضبوط کڑی ٹوٹ جائے۔ اس وقت ہمارے اشتراکی اصولوں کی فتح ہونا لازمی ہے۔ سرمایہ دار ملکوں کی مدد سے اگر سوویٹ کو فتح بھی ہو گئی تو وہ ملک سوویٹ کو مجبور کریں گے کہ اشتراکی نظام کو خیرباد کہے بلکہ شاید حکومتی طبقہ ان کی مدد کی احسان مندی میں خود ہی اشتراکی اصول چھوڑ دے۔

لینن ۔ اگر سرمایہ دار ملکوں کو فتح ہو گئی اور جنگ کے دوران میں پرولتاری انقلاب نہیں ہوا تو پھر سرمایہ داری کا تضاد دوبارہ رنگ لائے گا اور دوبارہ جنگ ہو گی ۔

ٹراٹسکی ۔ یقیناً اب دنیا کے سامنے دو راستے ہیں یا تو اشتراکی اصولوں کو اختیار کرے ورنہ تباہ ہو جائے انسان فطرتاً اپنی بربادی نہیں چاہتا ۔ اس لئے لازمی ہے کہ کچھ عرصے بعد انسان ایک دوسرے کی بربادی سے متاثر ہو کر اشتراکی اصول قبول کرے ۔ ہم اسٹالین اور سوویٹ کی حکومت کی طرف سے مایوس ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی پرولتاری جماعت سے قوی امید ہے کہ وہ دنیا کو بربریت کی طرف جانے سے روکے گی ۔

لینن ۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسٹالین اور سوویٹ روس تباہ ہو سکتے ہیں لیکن وہ اشتراکی اصول فنا نہیں ہو سکتے ۔ اور سرمایہ داری کا تضاد دنیا کو اس پر مجبور کرے گا کہ پھر اکتوبر کے انقلاب کو زندہ کیا جائے ۔

م ۔ م جوہر صاحب میرٹھی

زندگی اور موت

سائنس کی روشنی میں

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
(چکبست)

جب ہم اپنے جسم اور اس کی ساخت پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں تو دماغ ایک سوال پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ ہم کیا ہیں کیوں بنے اور کیسے بنے؟

کیا واقعی ہمارا تعلق کسی طرح سے ایک خلیہ کے جانور امیبا سے ہو سکتا ہے۔ اور اگر تعلق ہے تو اس کی کیا شہادت ہے؟

یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم انسانی وجود کی ابتدا پر ایک نظر ڈالیں تو ہم کو صاف طور سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ضرور ہمارا تعلق دنیائے وجود کے کسی نہ کسی زمانہ میں اِس ایک خلیہ کے جانور امیبا سے تھا۔ ہم اور ہم کیا تمام عالم حیات اپنی زندگی ایک خلیے سے شروع کرتے ہیں۔ انڈا ایک خلیہ ہے اور مادہ منویہ کے وہ چھوٹے خوردبینی کرمِ حیات (SPERMS) بھی ایک خلیے کے جانور ہوتے ہیں۔ انھیں دو خلیوں یا ان کے نواۃ کے آپس میں ایک خاص طریقہ کے اختلاط (ملاپ) سے ہمارا وجود عالم ہستی میں آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انڈے یا منی کے اجزائے تولید و تناسل (SPERMS) ایک خلیے کے جانور امیبا سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً۔

(۱) دونوں ایک خلیے کے بنے ہوئے ہیں۔

(۲) دونوں میں ایک ایک نواۃ موجود ہوتا ہے۔

(۳) دونوں اجسام حیاتیات کی طرح کھاتے ہیں۔ ہوا اپنے جسم کے اندر لیتے ہیں اور بیکار اجزا اپنے جسم سے خارج کرتے ہیں۔

(۴) اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دونوں میں حیات مع اپنے لوازمات کے موجود ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ حیات ہے کیا شئے؟

یہ ہمیں معلوم ہے کہ ہر کیمیاوی مرکب کی ایک خاص خاصیت ہوا کرتی ہے مثلاً پانی دو ہواؤں کا مرکب ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ معمولی درجہ حرارت پر رقیق ہوجاتا ہے۔ اونچی جگہ سے نیچی جگہ کو بہتا ہے اور جب برتن میں رکھا جاتا ہے اس کی سطح کو گیلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے ہمارے مادہ حیات (Protoplasm) میں بھی چند خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

(۱) یہ مادہ حیات بھی ایک کیمیاوی مرکب ہے۔ اس میں کاربن، گندھک، آکسیجن اور پانی وغیرہ ایک خاص کیمیاوی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔

(۲) ہر ایک جاندار خلیے میں مادہ حیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسی مادہ حیات کی بدولت ہمارے جسم کا ہر خلیہ ہوا لیتا ہے جو کہ زندگی کی ایک نشانی ہے

(۴) ہر خلیہ کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی غذا مادہ حیات کی زیست کو برقرار رکھتی ہے۔

(۵) فضلہ کا بدن یا خلیہ کے باہر نکلنے کی خاصیت بھی مادہ حیات ہی کی ایک ادنیٰ سی خصوصیت ہے۔

(۶) تولید و تناسل بھی مادہ حیات کی خصوصیات کا ایک کرشمہ ہے۔

ہم نے یہ دیکھا کہ ہماری حیات کا دارومدار اسی حیات پر ہے جو کہ ہمارے جسم کے ہر خلیہ میں موجود ہوتا ہے لیکن اب ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زندگی صرف مادہ حیات کی خصوصیات ہی کا نام ہے یا اس میں کوئی اور راز بھی پنہاں ہے یا یوں کہیے کہ مادہ حیات میں یہ حیات آئی کہاں سے اور ہے کیا شئے؟

اگر ہم حیات کو ایک طبیعاتی نظر سے دیکھیں تو ہم اس کو ایک برقی طاقت کہہ سکتے ہیں۔ کلیولینڈ کے ڈاکٹر کرائل نے تو اپنے تجربات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حیات بجلی کے چارج ہی کا نام ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی یہ رائے کسی ظنیانہ یا خیالی بنیاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ رائے ان کے مشاہدات و تجربات پر منحصر ہے

ڈاکٹر موصوف نے ایک کتے کا تھوڑا سا بھیجہ بجلی کے ذریعہ سے جلا کر خاک کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ مادہ فنا تو ہو نہیں سکتا ہاں ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ڈاکٹر صاحب نے بھیجے کی خاک

کی شکل میں تبدیل کرکے اس خاک میں سے کچھ نمک اور دوسرے اجزا کو کیمیاوی تحلیل سے علیحدہ کیا اور پھر اس میں کچھ لحمیات اور کچھ اور چیزیں ملا دیں۔ اب اس سفوف کو بجلی کے ذریعہ تحریک دینے سے ڈاکٹر صاحب مصنوعی زندہ خلیوں کے بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

اس کامیاب تجربہ نے ان کی امیدوں کو بڑھا دیا اور کئی اور تجربوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایسا پھر ایک تجربہ کیا جس نے ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ حیات بجلی کی لہر کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک بڑے جانفشاں تجربہ سے معلوم کیا کہ امیبا میں منفی (-) قسم کی بجلی ہوتی ہے۔ انھوں نے صرف بجلی کی قسم ہی معلوم کر لینے پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے اعلیٰ تجربات کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس امیبا میں ایک وولٹ کے ساتویں (۱/۷) حصہ کے برابر منفی بجلی ہوتی ہے۔ یہ معلوم کرکے ڈاکٹر صاحب نے ایک خوردبینی بجلی کے تار سے مثبت (+) بجلی جس کی مقدار بھی ۱/۷ وولٹ تھی اس امیبا میں داخل کی طبیعاتی اصول کے مطابق نتیجہ یہ ہوا کہ دو متضاد اور ہم مقدار قسم کی بجلیوں کے ملنے سے دونوں قسم کی بجلیوں کا اثر زائل ہوگیا۔ اور وہ امیبا جو کہ پہلے تیزی سے چلتا پھرتا تھا کھاتا پیتا تھا اور نسل کو بڑھاتا تھا حیات کی یہ تمام خصوصیات کھو بیٹھا اور آخر میں اس دنیائے فانی سے عالم بقا کی طرف رخصت ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے تجربات سے یہ بھی معلوم کیا کہ اگر مثبت (+) قسم کی بجلی کی مقدار اس اصلی منفی (-) قسم کی بجلی کی مقدار سے کم یا زیادہ ہو جائے تو امیبا نہیں مرتا۔ اس کو اجل کا گھونٹ جب ہی پینا پڑتا ہے جبکہ دونوں قسم کی بجلیوں کی مقدار یکساں ہو۔ اگر ایک قسم کی بجلی دوسرے قسم کی بجلی سے زیادہ یا کم ہو جائے تو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ متضاد ہم مقدار بجلیاں تو ایک دوسرے کا اثر زائل کر دیتی ہیں اور بچی ہوئی بجلی حیات کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا جسم امیبا جیسے سیکڑوں بلکہ لاانتہا خلیوں سے بنا ہے اور ہمارے جسم کا ہر خلیہ ایک قسم کی بیٹری ہے کم عمر اور نوجوان خلیے بہت تیز بجلی پیدا کرتے ہیں لیکن زیادتی عمر کے ساتھ اس بجلی کی طاقت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ موت کیا ہے؟ اسی بجلی کی طاقت کا بالکل زائل ہو جانا۔ جیسے کہ شہر کی بجلی ... مگر بجلی کے کام کا دارومدار ... جس کی بجلی کی مقدار پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے افعال ...

وغیرہ کا دار و مدار بھی انہیں خلیہ نا بیٹریوں پر منحصر ہے۔

اب اگر ہم سے کوئی حیات اور موت کی تعریف پوچھے تو ہم یوں کہہ سکیں گے کہ حیات جانور کے عالم وجود میں آنے کا وہ زمانہ ہے جبکہ بجلی کی طاقت یا اور زیادہ صحیح الفاظ میں بجلی کا پوٹینشل موجود ہو۔ اور موت اسی قوت یا Potential کے ضائع یا منتشر ہو جانے کا نام ہے جس طرح ہم کہتے ہیں کہ پانی ایک اونچی سطح سے نیچی سطح کو بہتا ہے اسی طرح سے بجلی یا برق ایک اونچے Potential سے نیچے Potential کو بہتی ہے۔

روس کے دو سائنسدانوں نے کٹے کا ایک سر اور انسان کا دل ان کی موت کے کئی گھنٹے بعد تک زندہ رکھا ہے۔ امریکہ کے ڈاکٹر الیکسس کیرل کے دار التجربہ میں بیس سال کے مرے ہوئے مرغی کے بچوں کے جسمانی خلیے زندہ اور تندرست موجود ہیں۔ حالانکہ مرغی کی زندگی عام طور سے پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کے جسمانی خلیات کو ایسی فضا میں رکھا کہ وہ ۲۰ سال سے زندہ ہیں۔

یہ سن کر ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ہمارے جسم کے زندہ خلیات بجلی کی قوت یا Potential کے لحاظ سے حیات ابدی رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے جانور اور اشرف المخلوقات انسان کو اجل کا جام پینا پڑتا ہے؟

دراصل یہی ایک مسئلہ ہے جس نے سائنسدانوں کے دماغ کے پرخچے اڑا دیئے ہیں اور مذہب اور عالم ارواح کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا ہے ورنہ اگر حیات دائمی ہوتی تو نہ تو کوئی مذہب کا نام لیتا اور نہ جنت دوزخ کا خیال اس کو خوشی یا رنج بخشتا۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا لیکن ہاں اگر واقعی دار التجربہ میں ایسے حالات اور فضا پیدا کی جا سکتی ہے جس میں کہ انسانی جسم کے کٹے ہوئے اعضا زندہ رہ سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انسان کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتے؟

ڈاکٹر کیرل صاحب اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے جسم کے خلیات اگر علیحدہ علیحدہ کر لئے جائیں تو وہ غیر فانی ہیں لیکن جب وہ دو یا دو سے زیادہ ایک جگہ جمع ہو کر ہمارے جسم کو

ترتیب دیتے ہیں تو ان کا تعلق پڑوس کے دوسرے خلیوں اور بھیجے سے ناقابل علیحدگی ہو جاتا ہے اور یہی خلیوں کا اجا ڑ یا ایک جگہ جمع ہونا ہماری موت اور بربادی کا باعث ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک زندہ خلیہ (جیسے امیبا) اپنے زہریلے اندرونی فضلہ کو اپنے جسم سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے لیکن ان اجسام زندگی کو جن کا جسم کئی خلیوں کا بنا ہوتا ہے ان زہریلے اجزائے فضلہ کو جس کی کہ ہمارے جسم کو قطعاً ضرورت نہیں ہوتی جسم سے باہر پھینکنے کا موقعہ نہیں ملتا اور وہ زہریلے اجزا جسم کے باہر نہیں نکلتے برخلاف اس کے امیبا میں یہ اجزا جسم یا خلیہ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جسم میں زہریلے اجزا کا قیام ہماری موت کا باعث ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خلیہ کا جانور مثلاً امیبا کبھی اپنی قدرتی موت سے نہیں مرتا۔

قدرت کے اس قانون کو سن کر ہمیں اپنی بدبختی پر نہایت ہی افسوس ہوتا ہے اور فوراً ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش کیا اچھا ہوتا اگر امیبا کی طرح ہم بھی غیر فانی ہوتے لیکن موت تو انسان کے اعلیٰ وارفع ہونے کی دلیل ہے اور بغیر اس کے زندگی کا مزا ہی کیا۔ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کیا پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جاوید حبیب صاحب
متعلم مسلم یونیورسٹی

بھید

(ترجمہ کینڈڈا مصنفہ برنارڈ شا)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تیسرا ایکٹ

(رات کے دس بج چکے ہیں پردے کھینچے ہوئے ہیں اور لیمپ روشن ہیں ٹائپ رائٹر اپنے کیس میں رکھا ہوا ہے۔ بڑی میز بالکل صاف کر دی گئی ہے۔ ہر بات سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کی مصروفیتیں ختم ہو چکی ہیں۔ کینڈڈا اور مارچ بینکس آتشدان کے قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔ پڑھنے کے لئے لیمپ مینٹل پر یوجین کے سر کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ وہ خود چھوٹی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی کتاب زور زور سے پڑھکر سنا رہا ہے۔ کچھ مسودات اور شاعری کی دو تین کتابیں پاس ہی قالین پر رکھی ہوئی ہیں کینڈڈا آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے۔ پیتل کی آگ کریدنی اس کے ہاتھ میں ہے۔ آرام سے جھکی ہوئی ہے اور آگ کریدنی کو اٹھائے بہت مویت سے اس کی نوک دیکھنے میں مشغول ہے۔ پیر آگ کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جاگ تو رہی ہے مگر بالکل کھوئی ہوئی سی خیالات اپنے ماحول سے میلوں دور ہیں۔ یہاں تک کہ یوجین کی موجودگی کا بھی ہوش نہیں ہے)

ی م۔ (پڑھتے پڑھتے رکتے ہوئے) دنیا کے ہر شاعر نے اس خیال کو باندھا ضرور ہے بلکہ اسے باندھنا پڑتا ہے۔ وہ مجبور ہے اس کے لئے وہ کینڈڈا کی طرف رائے لینے کے لئے دیکھتا ہے لیکن کیا دیکھتا ہے کہ وہ کریدنی میں کھوئی ہوئی ہے) کیا آپ سن نہیں رہی تھیں؟ (کوئی جواب نہیں) مسز مارل!

ک۔ (چونک کر) کیا؟

ی م۔ کیا آپ سن نہیں رہی تھیں؟

ک۔ (کافی سے زیادہ اخلاق ظاہر کرتے ہوئے) ہاں ہاں کیوں نہیں یہ تو بہت اچھی نظم ہے۔ آگے پڑھو یوجین! میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اُس فرشتہ کا کیا حشر ہوتا ہے

ی م۔ (مسودہ کو اپنے ہاتھ سے گراتے ہوئے) معاف کیجئے گا کہ میں نے آپ کو خواہ مخواہ اس قدر زحمت دی۔

ک۔ لیکن تم نے مجھے بالکل زحمت نہیں دی۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں اور سچ کہتی ہوں کہ میں سن رہی تھی۔ مہربانی سے اور آگے پڑھو۔

ی م۔ مگر میں نے وہ فرشتہ والی نظم تو کوئی پندرہ بیس منٹ ہوئے ختم کر دی۔ اس کے بعد سے اور بہت سی نظمیں بھی پڑھ چکا ہوں۔

ک۔ (شرمندگی سے) اچھا تو پھر مجھے واقعی افسوس ہے۔ یوجین خیال ہے کہ اس کریدنی نے مجھ پر ہپناٹزم کر دیا ہوگا (وہ اسے نیچے رکھ دیتی ہے)

ی م۔ مجھ کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی

ک۔ تو پھر تم نے مجھ سے کہہ کیوں نہیں دیا میں اسے فوراً رکھ دیتی۔

ی م۔ لیکن میں آپ کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا معلوم ہوتا تھا گویا یہ کوئی اسلحہ ہے۔ اگر میں پرانے زمانہ کا کوئی ہیرو ہوتا تو میں اپنی تلوار اپنے اور آپ کے درمیان رکھ دیتا اگر مارلی آجاتا تو وہ بھی سمجھتا کہ آپ نے کریدنی اسی لئے اٹھالی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی تلوار نہیں تھی۔

ک۔ (متعجب ہو کر) کیا؟ (تعجب کی نظر سے اسے دیکھ کر) میں سمجھتی ہوں تمہاری نظموں نے میرا دماغ بالکل ماؤف کر دیا ہے۔ آخر ہمارے درمیان تلوار کیوں ہوتی؟

ی م۔ (ٹالتے ہوئے) یونہی، کچھ نہیں (اپنا مسودہ اٹھانے کے لئے جھکتا ہے)

ک۔ نہیں یوجین! بس اب بیٹھے رہو تو میرے شوق شاعری کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ وہ خواہ تمہاری شاعری ہی کیوں نہ ہو۔ تم دو گھنٹے سے زیادہ یعنی جب سے جیمس گیا ہے۔ پڑھتے رہے ہو۔ اب میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

ی م۔ (ملول خاطر ہوتا ہے) [illegible] نہیں مجھ کو باتیں نہیں کرنی چاہئیں (وہ ادھر ادھر [illegible]

کہنے لگتا ہے) میں جاتا ہوں ذرا باہر جاکر پارک میں دو ایک چکر لگا آؤں (دروازہ کی طرف بڑھتا ہے)

ک۔ بیوقوف پارک تو کبھی کا بند ہو گیا ہوگا۔ اِدھر آؤ اور قالین پر بیٹھ جاؤ اور اپنی وہی شیخ چلّی والی باتیں اڑاؤ۔ میں اب ذرا تفریح چاہتی ہوں تم بھی تو چاہتے ہوگے!

ی م۔ (ڈرتے ہوئے اور خوش ہوتے ہوئے) ہاں!

ک۔ اچھا تو پھر اِدھر آؤ (وہ اپنی کرسی کچھ پیچھے دھکیلتی ہے تاکہ اس کے لئے جگہ نکل آئے۔ وہ پہلے تو کچھ ہچکچاتا ہے پھر ڈرتے ڈرتے آتشدان کے قریب بچھے ہوئے کمبل پر لیٹ جاتا ہے۔ اس کا سر کینڈڈا کے گھٹنوں پر ہے اور نظر اس کے چہرے پر)

ی م۔ آج میں دن بھر اس قدر پریشان رہا ہوں کہ کیا بتاؤں اور وہ سب اس لئے کہ قاعدہ کی باتیں کر رہا تھا اور اب جبکہ بے قاعدہ باتیں کر رہا ہوں میں خوش ہوں۔

ک۔ (مسکرا کر شفقت سے) ہاں میرے خیال میں تم اب اپنے کو بڑا پختہ شریر اور تجربہ کار کامیاب فریبی سمجھ رہے ہوگے اور خود پر نازاں! کیوں نا!

ی م۔ (اپنا سر جلدی سے اوپر اٹھاتے ہوئے اور اس کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے) ذرا ہوشیار رہیے گا۔ میں آپ سے بہت زیادہ تجربہ کار اور معمر ہوں کاش آپ کو معلوم ہوتا (گھٹنوں پر الٹ جاتا ہے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں پڑی ہوئی ہیں اور ہاتھ اس کی گردن میں۔ آواز میں جذبہ آجاتا ہے اور خون میں گرمی) کیا میں چند شریر باتیں کہہ سکتا ہوں؟

ک۔ (بغیر خوف اور سنجیدگی کے مگر اس کے جذبات کا کافی احترام کرتے ہوئے پھر بھی مادرانہ و شفقتانہ طرز میں) نہیں۔ لیکن تم ہر وہ بات کہہ سکتے ہو جسے واقعی اور سچے دل سے محسوس کر رہے ہو۔ وہ کوئی بات ہو۔ کوئی چیز ہو مجھے ڈر نہیں ہے لیکن ہونا چاہئے حقیقت کوئی وقتی حالت نہ ہو۔ شریرو رندانہ، شاعرانہ حالت نہ ہو۔ میں تم کو تمہاری عزت و صداقت کی قسم دلاتی ہوں کہ کسی وقتی حالت کا ذکر نہ کرنا۔ اب کہو جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو۔

ی م۔ (اس کے چہرے سے وہ شوق کی رنگ آمیزی جو پیدا ہو گئی تھی ایک دم غائب ہو جاتی ہے آنکھیں اداس مگر

ہوجاتی ہیں) اب، اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا جتنے الفاظ میں جانتا ہوں سب کسی نہ کسی حالت سے متعلق ہیں، سوائے ایک لفظ کے۔

ک۔ وہ کیا؟

ی م۔ (نرمی سے اور خود کو اس کے نام کی موسیقی میں کھوتے ہوئے) کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا اب میں یہی کہوں گا کیونکہ تم نے مجھے میری عزت اور صداقت کی قسم دلا دی ہے میرے دل میں تمہارا تخیل مسز ماریل کی حیثیت سے کبھی نہیں ہے۔ ہمیشہ کینڈڈا کی حیثیت سے ہے۔

ک۔ ہاں، ہاں بیشک لیکن تم کینڈڈا سے کہنا کیا چاہتے ہو؟

ی م۔ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ تمہارا نام ہزاروں بار رٹا کروں کیا تم محسوس نہیں کرتیں کہ ہر بار گویا میں تمہاری تسبیح پڑھتا ہوں اور پرستش کرتا ہوں۔

ک۔ کیا تمہیں اس سے مسرت نہیں ہوتی کہ بس تم پرستش کئے جاؤ؟

ی م۔ ہاں بے حد مسرت۔

ک۔ بس یہی مسرت تمہاری پرستش اور تمہاری تسبیح کا صلہ ہے اب اس سے زیادہ کسی اور چیز کی بھی تمنا ہے؟

ی م۔ نہیں بالکل نہیں۔ میں بس اب جنت میں ہوں جہاں خواہش کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

(ماریل اندر آجاتا ہے وہ دہلیز پر ایکدم رکتا ہے اور منظر پیش نظر کو ایک نظر میں سمجھ جاتا ہے)

م۔ (سنجیدگی اور متانت سے) مجھے امید ہے کہ میں حارج نہیں ہو رہا ہوں۔

(کینڈڈا تیزی سے چونک پڑتی ہے لیکن بغیر کسی گھبراہٹ کے خود پر ہنستے ہوئے۔ یوجین کینڈڈا کے ایکدم اٹھ کھڑے ہونے سے قلابازی کھا جاتا ہے لیکن لیٹے ہی لیٹے اپنی حالت سنبھالتا ہے اور کمبل پر اکڑوں اپنے گھٹنوں کو سینے سے لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کو بھی کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں ہے)

ک۔ جیمس تم نے تو بالکل مجھے چونکا دیا۔ میں یوجین کی باتوں میں اس قدر مصروف تھی کہ میں نے تمہیں دروازہ کھولتے سنا بھی نہیں۔ میٹنگ کیسی رہی۔ تم تو خوب بولے ہو گے؟

م۔ میں زندگی بھر آج سے بہتر کبھی نہیں بولا۔

ک ۔ بہت ہی خوب۔ چندہ کتنا جمع ہوا!

م ۔ یہ میں پوچھنا بھول گیا۔

ک ۔ (دوہین سے) مسٹر مارل ضرور آج بہت ہی اچھا بولے ہوں گے ورنہ وہ ایسی باتیں کبھی نہیں بھولتے (ایلی سے) اور دوسرے سب لوگ کہاں ہیں؟

م ۔ وہ لوگ تو مجھ سے بہت پہلے چل چکے تھے۔ مجھے تو چھکارا ہی نہیں ملتا تھا خیال ہے وہ لوگ کھانے کے لئے کہیں رُک گئے ہوں گے۔

ک ۔ (اپنے گھریلو کام کاج کے لہجہ میں) تب تو پھر میں میری یاسے کہدوں کہ وہ سونے کے لئے جائے۔ میں جاکر اس سے کہے دیتی ہوں (وہ باورچی خانہ کی طرف چلی جاتی ہے)

م ۔ (دوہین کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) کہئیے!

ی م ۔ (کمبل پہ اکڑوں بہت ہی مضحک بے ڈھنگے پن سے بیٹھے مارل کی طرح نہایت مطمئن بلکہ ہونٹوں پر شرارت کھیلتی ہوئی) کہئیے؛

م ۔ کچھ کہئیے گا!

ی م ۔ صرف اتنا کہ جب تک تم وہاں پبلک میں خود کو بیوقوف بناتے رہے ہیں یہاں تخلیہ میں خود کو بیوقوف بناتا رہا۔

م ۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے بالکل ہی ایک دوسرے کی طرح نہیں۔

ی م ۔ (متعدی سے اچھی طرح اُٹھ بیٹھتے ہوئے) بالکل، بالکل۔ بالکل ایک دوسرے کی طرح، بالکل تمہاری طرح میں یہاں ایک نیک آدمی کا پارٹ ادا کرتا رہا۔ جب سے تم بلند ہمتی کا مظاہرہ کر کے کینڈڈا کو یہاں میرے پاس چھوڑ گئے ——

م ۔ (بے اختیارانہ چونک پڑتے ہوئے) کینڈڈا!

ی م ۔ ہاں میں یہاں تک پہونچ گیا ہوں لیکن ڈرو مت بلند ہمتی متعدی ہوا کرتی ہے مجھ کو یہ بیماری تم سے لگ گئی۔ میں نے تم سے قسم کھائی تھی کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی ایسا لفظ کبھی نہ کہوں گا جو تمہارا

موجودگی میں کم از کم ایک ماہ پیشتر نہ کہہ چکا ہوں گا۔

م۔ اور کیا تم نے اپنی قسم برقرار رکھی؟

ی م۔ (ایک دم کرسی کی پشت پر بیٹھتے ہوئے) ہاں کوئی دس منٹ تک تو کسی نہ کسی صورت سے برقرار رہی یعنی اس وقت تک تو میں برابر اور لگاتار اپنی اور ہر شخص کی نظمیں سناتا رہا تاکہ بات چیت کا موقعہ ٹلتا رہے۔ میں گویا جنت کے دروازہ پر کھڑا ہوا تھا لیکن اندر جانے سے انکار کر رہا تھا تم سمجھ نہیں سکتے کہ کس قدر بلند ہمتی کی یہ بات تھی اور کس قدر تکلیف دہ۔ اس کے بعد۔۔۔۔

م۔ (اپنے ضبط کو بہ جبر روکتے ہوئے) اس کے بعد!

ی م۔ (بہت بد مزگی اور معمولی طریقہ سے کرسی میں بیٹھتے ہوئے) اس کے بعد اس نے کہا کہ بس اب تمہارا پڑھنا وڑھنا میں نہیں سن سکتی۔ بند کرو۔

م۔ اور تم چنانچہ جنت کے دروازہ کی طرف آخر کار بڑھے!

ی م۔ ہاں۔

م۔ اچھا! (غضبناک ہوکر) آگے بول۔ مرد خدا کیا میرے جذبات کا تجھے کچھ احساس نہیں ہے!

ی م۔ (نرمی اور موسیقیت کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کرتے ہوئے) اس کے بعد وہ ایک فرشتہ ہوگئی اس کے علاوہ ایک جلتی ہوئی تلوار تھی کہ ہر طرف گھوم رہی تھی چنانچہ میں اندر نہ جا سکا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ دراصل دوزخ کا دروازہ تھا۔

م۔ (مسرت سے پھول کر) یعنی اس نے تم کو مسترد کر دیا۔

ی م۔ (سخت حقارت سے اُدھر کو مڑتے ہوئے) نہیں بیوقوف آدمی اگر وہ ایسا کرتی تو مجھے کبھی معلوم ہی نہ ہوتا کہ میں درحقیقت جنت ہی میں تھا۔ مسترد کر دیا! تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح ہم لوگ بچ جاتے! کیا خوب اطمینان کا پہلو ارے تم تو اس دنیا میں اس کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں تھا یہ [illegible] سے کرنے کے دوسری طرف چلا جاتا ہے

م۔ (وہیں جگہ کھڑا بغیر کچھ حس و حرکت کئے برابر دیکھتا رہتا ہے) کیا تم سمجھتے ہو لوچی کہ تم اس طرح کا بنا [illegible]

دینے سے اپنے کو بہتر ثابت کر سکتے ہو۔

ی م۔ یہ گویا آپ کی آخری واعظانہ نصیحت ٹھہری۔ مارل میں تمہارے وعظوں کا قائل نہیں ہوں۔ وعظ تو میں سمجھتا ہوں کہ تم سے بہتر میں خود دے سکتا ہوں لیکن اس شخص سے ضرور ملنا چاہتا ہوں جس سے کینڈڈا نے شادی کی۔

م۔ وہ آدمی جس سے۔ تمہارا مطلب مجھ سے ہے نا؟

ی م۔ میرا مطلب عالی جناب جیمس میور مارل سے نہیں جو کہ محض ناصح اور ہوا کا ایک پھکنا ہے بلکہ میرا مطلب اس اصلی شخص سے ہے جو عالی جناب کے سیاہ کوٹ میں کہیں پوشیدہ ہے۔ اُس شخص سے جس سے کینڈڈا محبت کرتی تھی۔ تم کینڈڈا جیسی عورت سے محض اس بات پر محبت نہیں کروا سکتے کہ وہ محض تمہارے کالر کو پادریوں کی طرح بجائے سامنے کے پیچھے بند کیا کرے

م۔ (ہمت و استقلال سے) جب کینڈڈا نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا تب بھی میں ایسا ہی ناصح اور بقول تمہارے ہوا کا پھکنا تھا جیسا کہ اب تم دیکھتے ہو۔ اسوقت بھی میں سیاہ کوٹ پہنتا تھا اور میرا کالر بجائے آگے کے پیچھے سے بند کیا جاتا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اگر اپنے پیشے میں فریب سے کام لیتا تو وہ مجھ سے زیادہ محبت کرتی؟

ی م۔ (صوفے کے اوپر اپنے گھٹنوں کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے) نہیں، اس نے تمہیں معاف کر دیا جس طرح اس نے میرے بزدل اور کمزور ہونے کو معاف کر دیا بلکہ جیسا تم کہتے ہو کہ رونے کتے کے پلے ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا (حویت میں آکر) اس قسم کی عورت ملکوتی عقل و ہوش رکھتی ہے وہ ہماری روحوں سے محبت کرتی ہے نہ کہ ہماری بیوقوفیوں سے یا مغالطوں سے یا ہمارے فضول خیالات سے نہ ہمارے کوٹوں سے نہ ہمارے کالروں سے اور نہ ہمارے طرح طرح کے فضول چیتھڑوں سے جس میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے رہتے ہیں (اس بات پر وہ کچھ دیر تک محو رہتا ہے اس کے بعد مارل سے بڑے شوق سے سوال کرنے لگتا ہے) ہاں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر تم اُس آتشیں تلوار سے کیونکر نکل گئے جس نے مجھے روک لیا۔

م۔ غالباً اس لئے کہ دس منٹ بعد کسی نے مداخلت نہیں کی تھی۔

ی م۔ (متعجب ہو کر) کیا!

م۔ آدمی بلند سے بلند چوٹیوں پر پہونچ سکتا ہے لیکن وہاں دیر تک رہ نہیں سکتا ـــــ

ی م۔ (اُچک پڑتے ہوئے) یہ جھوٹ ہے۔ وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہ سکتا ہے۔ عمر بھر وہیں۔ یہ تو دوسرے لمحات ہوتے ہیں جب اس کو آرام نصیب نہیں ہوتا اور اُسے زندگی کے پرسکون جمال کا احساس نہیں ہوتا۔ تو مجھے تم سمجھتے کیا ہو: میں اگر اعلیٰ بلندیوں پر اپنے لمحات نہ گذاروں گا تو کہاں گذاروں گا!

م۔ باورچی خانہ میں۔ پیاز چھیلتے میں اور لیمپ میں تیل بھرنے میں۔

ی م یا ممبر کلیسا کی میز پر معمولی ذلیل مٹی کی روحوں کی گرد جھاڑنے میں۔

م۔ ہاں یوں بھی لیکن ایسے ہی لمحات تھے جب مجھ کو وہ سنہرا موقعہ حاصل ہوا اور اس بات کا حق بھی کہ میں اس سے محبت کی التجا کروں۔ میں نے ایسے لمحات کسی سے قرض نہیں لئے اور نہ میں نے ان میں کسی دوسرے آدمی کی مسرت چرانے کی کوشش کی۔

ی م۔ (بے انتہا ناامید ہو کر آتشدان کی طرف بعجلت جاتے ہوئے) مجھے اس کا بالکل یقین ہے کہ تم نے معاملت بالکل ایمانداری سے کی ہوگی۔ بالکل اسی ایمانداری سے جس طرح کہ سیر آدھ سیر پنیر خریدنے میں کیجاتی ہے۔ (وہ آتشدان والے قالین کے کنارے پر رک جاتا ہے۔ اریل کی طرف پیٹھ ہے۔ کچھ سوچتا ہے خود سے مخاطب ہوتا ہے) البتہ میں صرف بطور ایک فقیر کے اُس سے مانگ سکتا تھا۔

م۔ (چونکتے ہوئے) ایک ایسا فقیر جو سردی سے مر رہا ہو اور اس کا دوشالہ مانگ رہا ہو!

ی م۔ (تعجب سے ڈرتے ہوئے) شکریہ! کہ تم نے میری شاعری کی تکمیل کردی۔ ہاں اگر آپ کا جی چاہے تو یہی کہہ لیجئے۔ ایک فقیر جو سردی سے مر رہا ہو اور اس کا دوشالہ مانگ رہا ہو!

م۔ (جوش سے) اور اس نے انکار کر دیا۔ کیا میں تمہیں بتلا دوں کہ اس نے کیوں انکار کر دیا؟ میں خود اس کے الفاظ تمہیں بتا سکتا ہوں۔ اس نے انکار اس لئے کر دیا کہ ــــ

ی م۔ اس نے انکار نہیں کیا۔

م۔ نہیں کیا!!

ی م۔ اس نے سب کچھ دیا جو میں نے مانگا۔ اپنا دوشالہ دیا۔ اپنے بوسے دیئے۔ اپنے ماتھے کے تارے دیئے، اپنے ہاتھ کے سوسنی پھول دیئے۔ اپنے قدموں کے نیچے کا جال دیا۔

م۔ (اس کو پکڑتے ہوئے) بد ذات، بیچ آدمی! میری بیوی میری بیوی ہے۔ میں تمہاری یہ شاعرانہ فضولیات کچھ نہیں سننا چاہتا۔ یہ مجھے خوب معلوم ہے کہ اگر اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے اور تم سے محبت کرنے لگی ہے تو دنیا کا کوئی قانون اسے مجھ سے باندھ نہیں سکتا۔

ی م۔ (ہلکے سے بغیر کسی خوف و جھجک کے) مارل! میرے قمیص کے کالر سے مجھے بیکار پکڑتے ہو۔ وہ پھر آکر ٹھیک کر دے گی جیسے اس نے صبح کیا تھا (خاموش مسرت سے) اور پھر مجھے اسی طرح اس کے ہاتھ چھونے کو ملیں گے۔

م۔ شیطان کے بچے تجھے نہیں معلوم کہ ایسی باتیں میرے سامنے کرنا کہاں تک روا ہیں؟ (یاد شک کرتے ہوئے) کچھ ایسی بات ہو گئی ہے جس نے تجھے اس قدر نڈر بنا دیا ہے۔

ی م۔ مجھ کو اب ڈر بالکل نہیں ہے۔ میں تم سے پہلے نفرت کرتا تھا اور اسی لئے پہلے تمہارے چھونے تک سے گھبراتا تھا لیکن آج صبح کو جب وہ تمہیں پریشان کر رہی تھی میں نے دیکھا کہ تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔ اس وقت سے میں اب تمہارا دوست ہو گیا ہوں۔ اب بھی چاہے میرا گلا گھونٹ دو۔ مجھے ڈر نہیں۔

م۔ (اسے چھوڑتے ہوئے) اگر یوجین تم یہ ظالمانہ کرسے نہیں کہہ رہے ہو اگر تم میں انسانی احساسات کی ایک چنگاری بھی باقی رہ گئی ہے تو کیا مجھے بتاؤ گے کہ میری عدم موجودگی میں کیا ہوا؟

ی م۔ کیا ہوا! ہوتا کیا رہی آتشیں تلوار (مارل بے چینی سے اپنا پاؤں پٹکتا ہے)۔ اچھا تو خیر سیدھی سیدھی نثر میں یہ کہ اس نے اس قدر اعلیٰ طریقہ کی محبت کی کہ مجھے کسی بات کی آرزو نہ رہی سوائے اس کے کہ میں اسی محبت کی حالت میں رہوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی بلند ترین بلندیوں سے نیچے آ تم آگئے۔

م۔ (بے انتہا تکلیف سے) لو گویا یہ بات اب بھی ناتمام رہی پھر بھی شک و شبہ کی مصیبتیں۔

ی م۔ مصیبت! مجھ سے بڑھ کر اب خوش کوئی نہیں ہے۔ مجھے اب کسی بات کی آرزو نہیں سوائے اس کی خوشی کی (جذبہ میں آکر) مارل حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں کو اسے چھوڑ دینا چاہئے ہم اس کے شایاں شان نہیں ہیں۔ میں ایک چھوٹا کمزور عصبی مریض، تم ایک نہایت احمق پادری۔ چلو ہم دونوں دنیا کے سفر کو چلیں تم مشرق جاؤ اور میں مغرب اور اس کے لئے ایک نہایت لائق نہایت مناسب اور اس کی جوڑ کا بر تلاش کر کے لائیں کوئی ایک نہایت ہی خوبصورت فرشتہ ہو جس کے احمریں شہپر ——

م۔ یعنی کوئی بیوقوف! افسوس اگر وہ اتنی پاگل ہوگئی ہے کہ مجھے چھوڑ کر تمہارے ساتھ جانے پر تُل گئی ہے تو پھر اس کی حفاظت کون کرے گا؟ کون اس کے لئے محنت کرے گا؟ کون اس کے بچوں کی نگہداشت کرے گا؟ (وہ صوفے پر پریشان ہو کر بیٹھ جاتا ہے گھٹنوں پر کہنیاں ہیں اور اپنے سر کو ہاتھوں سے دبا لیتا ہے)

ی م۔ (بے تحاشا اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے) وہ تو اس قسم کے بیکار سوالات نہیں کرتی۔ اصل میں وہ مدد نہیں چاہتی بلکہ وہ خود کسی دوسرے کی حفاظت کرنا مدد کرنا اور اس کیلئے محنت کرنا چاہتی ہے ارے احمق وہ خود کسی دوسرے کے بچوں کی نگہداشت، ان کی مدد اور ان کیلئے کام کرنا چاہتی ہو کوئی ایسا بوڑھا آدمی جو دوبارہ بچہ ہو گیا ہو۔ ارے بیوقوف ایسا شخص میں ہوں۔ مارل ایسا شخص میں ہوں (جوش مسرت سے اٹھ کر ناچنے لگتا ہے اور کہتا ہے) تم نہیں جانتے کہ عورت کیا چیز ہے مارل اسے فوراً بلا بھیجو اسے بلا بھیجو اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینے دو ——

(دروازہ کھلتا ہے اور کینڈڈا اندر داخل ہوتی ہے۔ یوجین ایک دم ناچتے ناچتے سہم کر رہ جاتا ہے)

ک۔ (متعجب ہو کر دلیز پر سے) یوجین یہ آخر تم کیا کر رہے ہو؟

ی م۔ (انکے پیچھے سے) یوجین اور ہم دونوں وعظ دینے کا مقابلہ کر رہے ہیں اور وہ ہار رہا ہے۔

(کینڈڈا مارل کی طرف دیکھتی ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہ پریشان معلوم ہوتا ہے اس کی طرف بڑھتی

فکرمند ہو کر بڑھتی ہے)

ک۔ تم اس کو پریشان کر رہے تھے یوہین میں ایسی باتیں پسند نہیں کرتی سنا تم نے؟ (اپنا ہاتھ ماریں کے کندھے پر رکھتی ہے اور اپنے غصہ کی وجہ سے اپنا اطیانہ ہنر بھول جاتی ہے) میرے پیارے کو بس اب پریشان نہیں کیا جائے گا۔ میں اس کی حفاظت کروں گی۔

م۔ (فخر سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) حفاظت!

ک۔ (اس کی بات دھ سنتے ہوئے یوہین سے) آخر تم کیا کہہ رہے تھے؟

ی م۔ (ڈر کر) کچھ نہیں۔ میں ——

ک۔ یوہین! کچھ نہیں!

ی م۔ (رو دا سا ہو کر) میرا مطلب یہ۔ میں —— مجھے بہت افسوس ہے۔ میں اب ایسا پھر نہ کروں گا۔ سچ اب نہ کروں گا۔ میں اسے بالکل چھوڑ دیا کروں گا۔

م۔ (غصہ سے یوہین کی طرف بڑھتے ہوئے) مجھے چھوڑ دے گا! شیطان کے ——

ک۔ (اسے روکتے ہوئے) نہیں۔ رُک جاؤ جیمس۔ میں دیکھو اسے ٹھیک کئے دیتی ہوں۔

ی م۔ کیا آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟

ک۔ (سختی سے) ہاں میں تم سے بے حد خفا ہوں اور میرا قطعی ارادہ ہے تم کو گھر سے باہر نکال دوں۔

م۔ (کینڈڈا کی جرأت سے متعجب ہو کر پھر بھی یہ نہ چاہتے ہوئے کہ کسی مرد کے مقابلہ میں اس کی بیوی اسے بچائے نرمی سے کینڈڈا) نرمی سے کینڈڈا! میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں۔

ک۔ (اسے تھپتھپاتے ہوئے) ہاں ہاں کیوں نہیں پیارے لیکن تم کو اب پریشان کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ کرنے دوں گی۔

ی م۔ (تقریباً روتے ہوئے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے) تو اب میں جاتا ہوں۔

ک۔ نہیں تمہارے جانے کی ابھی ضرورت نہیں ہے آتی رات گئے تمہیں گھر سے باہر نہ نکالوں گی! (زور سے) تمہیں شرم نہیں آتی بے شرم!

ی م۔ (تنگ آکر) لیکن میں نے کیا کیا ہے؟

ک۔ مجھے خوب معلوم ہے جو کچھ تم نے کیا ہے اور اس قدر گر گیا کہ میں خود یہاں موجود تھی تم نے بہت نالائق بات کی ہے تم بالکل بچوں ہی کی طرح ہو اپنی زبان کو روک نہیں سکتے۔

ی م۔ مجھے ایک چھوڑ دس موتیں آ جائیں اگر میں آپ کو ایک لمحہ کی بھی تکلیف دینے کا خیال کروں۔

ک۔ (اس لڑکپن کی بات پر سخت تنفر ظاہر کرتے ہوئے) تمہارے مرنے سے مجھے بڑا فائدہ ہی ہو جائے گا۔

م۔ کینڈڈا ڈیر یہ سوال وجواب بالکل بیکار اور نامناسب ہیں۔ دراصل قصہ یہ دو آدمیوں کا اور میں ہی اسے بہتر طے کر سکتا ہوں۔

ک۔ دو آدمیوں کا! کیا تم ایسے شخص کو ایک آدمی سمجھتے ہو؟ (یوجین سے) شریک نہیں کا!

ی م۔ (اس ملامت کو خود میں ایک عجیب بہت محسوس کرتے ہوئے) اگر مجھے لڑکوں ہی کی طرح برا بھلا کہا جا رہا ہے پھر لڑکوں کا سا جواب بھی دوں گا جھگڑا اصل میں اس نے پہلے شروع کیا اور یہ مجھ سے بڑا لڑ

ک۔ (ذرا پریشان ہوتے ہوئے کیونکہ ایل کی شان پر دھبہ آتا تھا) یہ صحیح نہیں ہو سکتا (ایل سے) جیمس تم نے باتیں شروع نہ کی ہوں گی۔ کیوں نا جیمس؟

م۔ (حقارت سے) نہیں۔

ی م۔ (غصے سے) آئیں!

م۔ (یوجین سے) تم نے خود آج صبح اس قسم کی ابتدا کی (کینڈڈا اس سے فوراً وہ سمجھ جاتی کہ بات سمجھ جاتی ہے کہ سویرے کی باتوں سے تعلق ہے۔ چنانچہ وہ شک سے اور تیزی سے اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے اور ایل سلسلہ کلام جاری رکھتا ہے اس لہجہ میں گویا اس کی برتری کو صدمہ پہنچ رہا ہے) تمہاری دوسری بات درست ہے کہ میں بڑا لڑکا ہوں اس لئے زیادہ مضبوط بھی۔ کینڈڈا تم یہ معاملہ بس میرے ہاتھ چھوڑ دو۔

ک۔ (ایل کو تسکین دیتے ہوئے) ہاں پیارے کیوں نہیں میں تم پر چھوڑ دوں گی۔ لیکن (پریشان ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج صبح کیا معاملہ تھا۔

م۔ (اس کی بات کو نرمی سے ٹالتے ہوئے) پیاری تمہیں اس کے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ک۔ لیکن جیسی میں (باہر گھنٹی بجتی ہے) — اوہ! تو یہ وہ لوگ آ رہے ہیں (وہ دروازہ کھولنے کے لئے چلی جاتی ہے)

ی م۔ (اریل کی طرف دوڑ کر جاتے ہوئے) اریل، اریل! یہ کس قدر خراب بات ہوگئی کہ وہ ہم لوگوں سے خفا ہوگئی ہے۔ مجھے تو اسے نفرت ہی ہوگئی ہے۔ اب میں کیا کروں؟

م۔ (عجیب پریشانی کی حالت میں کمرہ میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے) یوجین میرا سر چکرا رہا ہے مجھے تھوڑی دیر میں کہیں پاگلوں کی طرح ہنسنے نہ لگوں۔

ی م۔ (فکر مند ہو کر اس کے ساتھ ٹہلتے ہوئے) نہیں نہیں ایسا نہ کرنا ورنہ وہ سمجھے گی کہ تم کو میں نے پاگل بنا دیا ہے۔ ہنسنا مت۔

(باہر شور اور قہقہوں کی آوازیں قریب آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ میکس ول کی آنکھیں چمک رہی ہیں طرز عمل سے غیر معمولی شگفتگی عیاں ہے لیکن ہوش و حواس بجا ہیں۔ برگمین کے ساتھ داخل ہوتا ہے برگمین بدستور اپنی جگہ مطمئن ہے اور چکنی چپڑی باتیں کر رہا ہے مس گارنٹ اپنی بہترین ٹوپی اور بہترین جیکٹ جمائے ہوئے ان دونوں کے پیچھے آتی ہے۔ حالانکہ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ چمک رہی ہیں لیکن بظاہر ابھی خود کو مدہوش نہیں سمجھتی۔ اپنے ٹائپ رائٹر والی میز کی طرف بڑھ کر کے بیٹھ جاتی ہے ایک ہاتھ میز پر خود کو سہارا دینے کے لئے رکھتی ہے۔ دوسرا پیشانی پر رکھتی ہے جیسے کچھ تھک گئی ہو یا کچھ چکر سا آ رہا ہو۔ مارچ بینکس کو پھر اپنے شرمیلے پن کا شدید احساس ہوتا ہے اور کھڑکی کی طرف جہاں اریل کی کتابیں رکھی ہیں چپکے چپکے کھسکنا شروع کرتا ہے)

ل۔ (انتہائی شگفتگی سے) مجھے آپ کو ضرور مبارکباد دینی چاہئے (اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) آپ نے کس قدر عمدہ، کس قدر اعلیٰ درجہ کا جذباتی خطبہ دیا ہے آپ تو خود اپنے سے بڑھ گئے۔

ب۔ اس میں کوئی شک نہیں جیسی میں تو تمہارے آخری لفظ تک برابر جاگتا رہا کیوں نا مس گارنٹ؟

پ۔ (ہنس کر) مجھے کیا معلوم مجھے تو تمہارا خیال ہی نہ تھا میں تو اپنے نوٹس لکھ رہی تھی (اپنی نوٹ بک نکالتی

[illegible]

م۔ پھر اس کیا میں بہت تیز بولا؟

پ۔ بہت ہی تیز۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نوّے الفاظ فی منٹ سے زیادہ نہیں لکھ سکتی چنانچہ بہت کچھ چھوٹ گیا۔ (غصہ میں نوٹ بک کو اپنی مشین کی طرف پھینکدیتی ہے کہ دوسرے دن دیکھا جائیگا اور اب مطمئن ہوکر بیٹھتی ہے)

م۔ (تسکین دیتے ہوئے) خیر، خیر کوئی حرج نہیں۔ جانے دو۔ ہاں یہ بتاؤ کیا تم سب لوگ کھانا کھا چکے؟

ل۔ مسٹر برگیس نے آج ہم لوگوں کو ہگر یو ہوٹل میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی دعوت دی۔

ب۔ (فیاضانہ شان سے) مسٹر ل یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے (انکساری سے) آپ لوگوں کی ہمیشہ ایسی ہی خاطر تواضع کرنے کے لئے تیار رہوں۔

پ۔ ہم لوگوں کو شمپین پینے کو ملی۔ میں نے تو اس سے پہلے اسے چکھا بھی نہ تھا۔ مجھے چنانچہ ذرا چکر محسوس ہو رہا ہے۔

م۔ (تعجب سے) شمپین کے ساتھ دعوت! یہ تو واقعی بہت اعلیٰ رہی۔ کیا بات تھی برگیس۔ یہ میری فصاحت کا اثر تھا کہ جس کے سبب تم اس قدر خرچ پر آمادہ ہوگئے؟

ل۔ (خطیبانہ رنگ بتاتے ہوئے) آپ کی فصاحت اور (مسٹر برگیس کی دریا دلی) (انتہائی شگفتگی کے جوش میں آکر) اور ہمارے صدر بھی کیا لاجواب آدمی تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے پر آیا تھا۔

م۔ (تعجب بکمال کو برگیس کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا! آ۔آ۔صدر! تو اب میں سمجھا
(برگیس انکساری کے طور پر کھانسنے لگتا ہے یہ چھپانے کے لئے کہ اپنی چالاکی پر مسرور و مطمئن ہے۔ لیکن اپنے بازوؤں کو لپیٹ کر ایک شان کے ساتھ صوفے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک چکر آتا ہے لیکن خود کو سنبھال لیتا ہے۔ کینڈ (ایک کشتی میں گلاس، لیموں اور گرم پانی کا ایک جگ لاتی ہے)

ک۔ لیمونیڈ کون پئے گا؟ تم لوگ ہمارا قاعدہ جانتے ہو یعنی شراب سے قطعی پرہیز۔ (کشتی کو میز پر رکھتی ہے اور لیموں نچوڑنے والی مشین اٹھاتی ہے اور ہر ایک کی طرف دیکھتی ہے)

م۔ کوئی ضرورت نہیں اس کی کینڈڈا۔ یہ سب لوگ شمپین پی کر آئے ہیں۔ پر اس نے بھی اپنا حصہ توڑ دیا

ک۔ (پولا زر پائن سے) کیا واقعی تم نے بھی شمپین پی ہے!

پ۔ (زور دے کر) ہاں میں نے پی۔ میں نے تو صرف بیر کے متعلق توبہ کی تھی۔ بیر کو میں سخت ناپسند کرتی ہوں۔ مسٹر ہارلی آج اب اور کوئی خط تو میرے جواب لکھنے کے لئے نہیں ہے؟

م۔ ہاں بس اب آج کوئی نہیں۔

پ۔ اچھا بات تو پھر — سب لوگ خدا حافظ!

ل۔ (ہمت مردانہ سے) مس گارنٹ کوئی مضائقہ نہ ہو تو میں آپ کو آپ کے مکان تک چھوڑ آؤں؟ نہیں شکریہ میں خود کو اس وقت کسی پر چھوڑ نہیں سکتی۔ کاش کہ میں وہ ذلیل شئے ذرا بھی نہ پیتی۔ (وہ لڑکھڑاتی ہوئی دروازہ کی طرف بڑھتی ہے اس سے ٹکرا جاتی ہے اور بمشکل گرتے گرتے بچتی ہے)

ب۔ (غصہ سے) ذلیل شئے! لڑکی جانتی بھی نہیں کہ شمپین کیا چیز ہے۔ پامری اور گرینو کمپنی کی ساڑھے بارہ شلنگ کی ایک بوتل! اور وہ پورے دو گلاس پی گئی!

م۔ (اس کے متعلق فکرمند ہو کر) لیکی جاؤ اور راستے حفاظت سے گھر پہونچا آؤ۔

ل۔ (دو گلاس سن کر اور فکرمند ہو کر) لیکن اگر وہ واقعی — یعنی فرض کیجئے اگر وہ سڑک پر گانے لگے یا اسی طرح کی کوئی اور حرکت —

م۔ ہاں یہی مجھے بھی ڈر ہے کہ شاید وہ ایسا کر بیٹھے۔ اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ جا کر اسے حفاظت سے گھر پہونچا آؤ۔

ک۔ ہاں لیکی ضرور شاباش! (وہ اس سے ہاتھ ملاتی ہے اور آہستہ سے دروازہ کی طرف دھکیل دیتی ہے)

ل۔ ہاں جانا مجھ پر فرض ہے گو مجھے امید ہے اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہ پڑے گی خدا حافظ مسٹر ہارلی (سب سے مخاطب ہو کر خدا حافظ! وہ چلا جاتا ہے اور کینڈڈا دروازہ بند کر دیتی ہے)

ب۔ وہ خود بھی دو گھونٹوں کے بعد بڑی احتیاط سے پی رہا تھا لوگ اب اتنی پیتے نہیں جتنی کہ اگلے زمانہ والے پیا کرتے تھے (آتش دان کی طرف بڑھتے ہوئے) اچھا جیمس بس اب گھر کے دروازہ بند کر لینا

وقت آگیا ہے مسٹر ہاچ بنکس آپ بھی مکان چل رہے ہیں نا؟ کیا میں راستہ میں کچھ دور تک آپ کی شرف ہمراہی سے سرفراز ہو سکتا ہوں؟

ی م۔ (اٹھ کر) ہاں ٹھیک اب مجھ کو بھی جانا چاہئے (وہ دروازہ کی طرف بڑھتا ہے لیکن کینڈڈا سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس کا راستہ روک لیتی ہے)

ک۔ (خاموش تحکمانہ لہجہ میں) تم ادھر بیٹھو چل کے۔ تم ابھی نہیں جا سکتے۔

ی م۔ (التجا کرتے ہوئے) نہیں، میں—— میرا مطلب جانے کا نہیں تھا (آکر چپکے سے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

ک۔ پاپا، مسٹر ہاچ بنکس آج ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہیں گے۔

پ۔ اچھا اچھا تو میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ جیمس (ا۔یل سے معانقہ کرتا ہے اور یوجین کی طرف آتا ہے) مسٹر ہاچ بنکس تم اپنے بستر کے قریب ان لوگوں سے ایک لیمپ رکھوا لینا کیونکہ ممکن ہے تم کو بھی دورہ پڑے تو دقت نہ ہو۔ اچھا خدا حافظ

ی م۔ شکریہ میں ضرور ایسا کروں گا خدا حافظ مسٹر برگیس (دونوں معانقہ کرتے ہیں۔ برگیس دروازہ کی طرف جاتا ہے)

ک۔ (ماریل کو روکتے ہوئے جو برگیس کے پیچھے اسے پہنچانے جا رہا ہے) ذرا رکنا ڈیر میں پاپا کو ان کا اوورکوٹ تو پہنا دوں (وہ برگیس کے ساتھ باہر چلی جاتی ہے)

ی م (چپکے سے اٹھ کر ماریل کے پاس جاتے ہوئے) ماریل بس اب ایک زبردست منظر پیش ہونے والا ہے تم خوفزدہ تو نہیں ہو؟

م۔ ذرہ برابر بھی نہیں۔

ی م۔ تمہاری ہمت پر اس وقت البتہ رشک معلوم ہوتا ہے (وہ تعریف کے طور پر اپنا ہاتھ ماریل کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے) میرے قریب رہنا۔ رہو گے نا؟

م۔ (اسے ہٹاتے ہوئے) نہیں یوجین ہر شخص اپنی آپ حفاظت کرے۔ بس آج اس وقت اس کو ہم دونوں میں سے کسی کو ہمیشہ کے لئے انتخاب کر لینا ہے۔

(کینڈڈا واپس آجاتی ہے یوجین ایک خطاوار اسکول کے لڑکے کی طرح چپکے سے دبکا ہوا صوفے پر واپس آجاتا ہے)

ک۔ (ان دونوں کے درمیان آکر یوجین سے مخاطب ہوتے ہوئے) تمہیں اپنے کئے پر ندامت ہے؟

ی م۔ (ندامت سے) ہاں، دلی تکلیف۔

ک۔ اچھا خیر تو پھر تم معاف کئے جاتے ہو۔ اور بس اب ایک اچھے چھوٹے لڑکے کی طرح جا کر بستر پر سو تو رہو۔ میں جیمس سے کچھ تمہارے متعلق باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

ی م۔ (سخت انتشار سے اٹھتے ہوئے) نہیں! ارِل میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں یہیں رہوں گا۔ تم اس سے سب کچھ کہہ دو۔

ک۔ (اپنے شکوک صحیح پاتے ہوئے) مجھ سے کیا کہہ دو؟ (یوجین کی نگاہیں اس سے چار نہیں ہوتیں وہ مڑتی ہے اور مارِل کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

م۔ (انجام کے لئے خود کو تیار کرتے ہوئے) مجھے اُس سے کچھ کہنا نہیں ہے سوائے اس کے کہ (یہاں اس کی آواز نرم و گلوگیر ہو جاتی ہے) وہ دنیا میں میرا بہترین خزانہ ہے۔ اگر واقعی وہ میری ہی ہے۔

ک۔ (اس کے اس خطیبانہ لہجہ کو برا مان کر نیز اس بات کو برا مانتے ہوئے کہ وہ اس سے گویا سینٹ میتھو کا مجمع سمجھ کر مخاطب ہو رہا ہے) میرا خیال یہ ہے کہ اگر صرف اتنا ہی کہنا تھا تو یوجین بھی اس سے کچھ کم نہیں کہہ سکتا

ی م۔ (ناامید ہو کر) مارِل وہ ہم دونوں پر ہنس رہی ہے

م۔ (جز بز ہو کر) اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کینڈڈا کیا تم ہم پر ہنس رہی ہو۔ کینڈڈا؟

ک۔ (دبائے ہوئے غصے سے) جیمس یوجین بہت تیز لڑکا ہے۔ ممکن ہے کہ میں ہنسنے لگوں لیکن یہ زیادہ ممکن ہے کہ مجھے سخت غصہ آ جائے۔ (وہ آتشدان کے پاس چلی جاتی ہے اور وہاں مینٹل پر اپنا بازو رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک پیر آتشدان کے سیخوں پر ہے۔ یوجین مارِل کے پاس چپکے سے جاتا ہے اور آہستہ سے اس کی آستین پکڑ کر جھٹکا دیتا ہے)

ی م۔ (چپکے سے کان میں کہتے ہوئے) دیکھو مارِل۔ ہم دونوں کو کوئی بات زبان سے نکالنی چاہئے۔

م۔ (یوجین کو ہٹاتے ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے) کینڈڈا، تم یہ دھمکی دے رہی ہو مجھے امید تو ایسی نہیں ہے۔

ک۔ (دروازے سے جھانکتے ہوئے) ہاں جمیں غالباً! یوجین میں نے تم سے جانے کو کہا تھا۔ جاتے ہو کہ نہیں؟

م۔ (اپنا پیر زمین پر زور سے اٹھاتے ہوئے) نہیں وہ نہیں جا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہیں رہے۔

یو۔م۔ نہیں میں چلا جاؤں گا۔ جو کچھ تم مجھ سے کہو گی وہی کروں گا (وہ دروازہ کی طرف بڑھتا ہے)

ک۔ رکو (وہ رک جاتا ہے) کیا تم نے جمیں کا کہنا سنا نہیں کہ وہ نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔ یہاں کا مالک جمیں ہے۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم؟

یو۔م۔ (ایک نوجوان شاعر کی طرح ظلم کے خلاف برافروختہ ہوتے ہوئے) لیکن وہ مالک ہے کس حق سے؟

ک۔ (آہستہ سے) اسے بتلا دو جمیں!

م۔ (چونک کر) میری پیاری! مجھے نہیں معلوم کہ وہ کونسا ایسا حق ہے جس سے میں یہاں کا مالک ہوں میں تو اس قسم کا کوئی حق نہیں جتاتا۔

ک۔ (سخت ملامت کے لہجہ میں) تم نہیں جانتے جمیں۔ اے جمیں! (یوجین کی طرف متوجہ ہو کر) یوجین تمہیں تو معلوم ہوگا (وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا ہے لیکن اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا) ہاں تم ابھی بہت بچے ہو۔ خیر اچھا تو اب تمہیں یہاں رکنے کی اجازت دیتی ہوں تاکہ تم یہ باتیں سیکھ لو۔ جاؤ (وہ آتشدان کے پاس سے آتی ہے اور ان دونوں کے درمیان آکر کھڑی ہو جاتی ہے) اچھا جمیں! اب یہ بتاؤ ماجرا کیا ہے؟ بتاؤ! مجھ سے کہو!

یو۔م۔ (اوپر کی طرف پیچھے سے کہتے ہوئے) مت بتانا۔

ک۔ بدمعاش کہو تو!

م۔ (آہستہ سے) میں چاہتا تھا کہ تمہارے سامنے کو رفتہ رفتہ تیار کروں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے۔

ک۔ ہاں! اس کے پہلے ہی تو مجھے معلوم ہے کہ تم نے کیا کیا لیکن ان باتوں کا خیال نہ کرو مجھے کوئی غلط فہمی نہ ہوگی۔

م۔ [illegible]

ک۔ اچھا تو!

م۔ (ایکدم صاف صاف بول اٹھتا ہے) یوجین یہ کہتا ہے کہ تمہیں اس سے عشق ہے۔

ی م۔ (جلدی سے اور انتہائی گھبراہٹ سے) نہیں نہیں، نہیں، نہیں کبھی نہیں، مسٹر اریل یہ میں نے کبھی نہیں کہا یہ صحیح نہیں ہے میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے محبت ہے اور میں نے یہ کہا تھا کہ میں تم کو خوب سمجھ پاتا ہوں اور یہ نہیں سمجھ پاتا اور یہ سب اس وقت نہیں کہا تھا جب وہ تمام باتیں آگ کے سامنے ہوئی تھیں میں قسمیہ کہتا ہوں آج صبح صرف یہ بات ہوئی تھی۔

ک۔ (واقف ہو کر) آج صبح!

ی م۔ ہاں (وہ کینڈڈا کی طرف دیکھتا ہے تاکہ یقین ہو جائے اور پھر آگے کہتا ہے) میرے کالر خراب ہو جانے کی وجہ یہی تھی۔

ک۔ تمہارا کالر؟ (مطلب سمجھ کر فوراً اریل کی طرف مڑتی ہے۔ سنجیدہ اور متعجب) ارے جیمس کیا تم نے ——؟ (رک جاتی ہے)

م۔ (شرمندہ ہو کر) کینڈڈا تم جانتی ہو کہ مجھے اکثر غصہ آ جاتا ہے۔ اور یہ کہہ رہا تھا (کانپ کر) کہ تم مجھ سے سخت نفرت رکھتی ہو۔

ک۔ (جلدی سے یوجین کی طرف مڑتے ہوئے) کیوں، کیا تم نے ایسا کہا تھا؟

ی م۔ (ڈر کر) نہیں۔

ک۔ (تقریباً غضبناک ہو کر) تو اس سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ جیمس مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔

ی م۔ نہیں نہیں، میں میں (بہت ہمت کر کے) وہ داؤد علیہ السلام کی بیوی کا قصہ تھا اور وہ واقعہ بھی گھر میں نہیں ہوا تھا بلکہ ان سے خفا ہو گئی تھیں اور نفرت کرنے لگی تھیں جب انھوں نے ان کو دوسرے لوگوں کے سامنے خطیبانہ رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

م۔ (مناظرہ کرنے والوں کی طرح اپنا موقع پاتے ہوئے) سنا کینڈڈا! تمام لوگوں کے سامنے رقص کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اپنی ان حرکتوں سے تمام لوگوں کے دل موہ کر ان کی اصلاح کر رہا ہے حالانکہ

سب پر اسی والی حکایت میں مبتلا تھے (کینیڈا کچھ کہنے کو ہوتی ہے لیکن وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیتا ہے) نہیں تمہیں غصہ ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کینیڈا—

ک۔ ظاہر کرنے کی!

م۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) یوجین صحیح کہتا تھا جیسا کہ تم نے بھی چند گھنٹے گذرے کہا تھا کہ یوجین ہمیشہ صحیح بات کہتا ہے۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کو خود تم اس سے بہتر طریقہ پر نہیں کہہ چکی تھیں۔ وہ شاعر ہے اور ہر بات سمجھ جاتا ہے میں صرف پادری ہوں جو کچھ بھی نہیں سمجھتا۔

ک۔ (تاسف کے لہجہ میں) جو کچھ ایک بیوقوف لڑکا کہے تم اسے مان لوگے اگر وہی بات میں نے بھی مذاق میں کہدی ہو۔

م۔ یہ بیوقوف لڑکا ایک معصوم بچے کی طرح الہامی گفتگو کر سکتا ہے لیکن اس میں ایک افعی کی مکاری شامل ہوتی ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تم دراصل اس کی ہو نہ کہ میری۔ اور صحیح یا غلط مجھ کو بھی یہ شک پیدا ہو گیا ہے کہ شاید ایسا ہی ہو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ شک و شبہ میں مبتلا ہو کر ادھر ادھر پریشان مارا مارا پھروں۔ میں ایسی بھی زندگی برداشت نہیں کر سکتا کہ ہوں تو ساتھ ساتھ لیکن دل میں غبار بھرے رہوں۔ میں حسد کرنے کی ناقابل برداشت ذلت اپنے لئے روا نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے ہم دونوں اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تم ہم میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو۔ اب میں تمہارے انتخاب کا انتظار کرتا ہوں۔

ک۔ (آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹتی ہے۔ اس عبارت آرائی سے اس کا دل سخت ہو جاتا ہے۔ باوجودیکہ یہ الفاظ بچے جذبات سے کہے گئے ہیں) اچھا تو مجھے انتخاب کرنا ہے؟ کیوں نا؟ تو میرے خیال میں غالباً تم دونوں میں یہ مسئلہ بالکل طے ہو گیا ہے کہ میں دو میں سے ایک کی ہو جاؤں۔

م۔ (استقلال سے) بالکل! بس تم اب قطعی طور سے اپنا انتخاب کر لو۔

کی م۔ (وہ پریشانی سے) ادریل تم سمجھے نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود آپ اپنی مالک ہے۔

ب۔ (اس کا طرف خفا ہو کے) ہاں میاں یوجین میرا یہ مطلب بھی ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی جو [illegible]

کو معلوم ہو جائے گا۔ اچھا میرے مالکین وقابضین ذرا یہ تو مجھے بتائیے کہ آپ لوگ اپنے انتخاب کے لئے اپنا اپنا کیا عطیہ مجھے پیش کرتے ہیں۔ اس وقت میں نیلام پر چڑھی ہوئی ہوں۔ اچھا بولو جیس تم کیا قیمت پیش کرتے ہو میرے لئے؟

م۔ (انتہائی تکلیف سے) کینڈ ــــــ (اس کی آواز کام نہیں کرتی۔ آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں اور آواز گلوگیر۔ عطیہ ایک زخمی جانور ہو کر رہ جاتا ہے) میں بول نہیں سکتا۔

ک۔ (بے اختیار ہو کر اس کے پہلو میں جاتے ہوئے) آہ! میرے پیارے ــــ

ی م۔ (گھبرا کر) رکو! یہ معاملہ کی صفائی نہیں ہے ماریل تم یہ نہیں دکھلا سکتے کہ تم کو تکلیف ہے۔ میں خود سخت مجروح ہوں لیکن اپنی جراحت دل دکھا کر اس کو اپنی طرف ہمدردانہ راغب کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نہیں روتا۔ اس کے جذبہ رحم کو نہ ابھارو جو کچھ تمہیں کہنا ہے کہو ــــ مردانہ وار کہو۔

م۔ (اپنی تمام قوتیں مجتمع کر کے) ہاں یہ تم ٹھیک کہتے ہو مجھے رحم کی قیمت لگانا مطلوب نہیں ہے (اپنے کو کینڈڈا سے چھڑا لیتا ہے)

ک۔ (واپس ہوتے ہوئے رکھائی سے) معاف کرنا جیس میں تم سے مس ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اچھا اب میں تمہاری قیمت سننا چاہتی ہوں۔

م (غرور، انکساری کے ساتھ) کینڈڈا! میرے پاس تمہاری قیمت کے لئے کچھ نہیں ہے سوائے اپنی طاقت تمہاری حفاظت کے لئے۔ اپنی ایمانداری تمہارے اطمینان کے لئے۔ اپنی محبت دنیا قت تمہاری معاش کے لئے اور اپنا اثر واقتدار تمہاری شان کے لئے۔ بس یہی چیزیں ایک مرد ایک عورت کو پیش کر سکتا ہے۔

ک۔ (بہت ہی خاموشی سے) اور تم یوجین! تم کیا پیش کرتے ہو؟

ی م۔ اپنی کمزوری۔ اپنی بے بسی۔ اپنی احتیاج دلی۔

ک۔ (متاثر ہو کر) یوجین یہ قیمت اچھی ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں اپنا انتخاب کس طرح کروں۔

(وہ کچھ دیر رکتی ہے اور ہر دو کی طرف دیکھتی ہے گویا دونوں کو تول رہی ہے۔ ماریل جس کا زور رخصت ہو گیا

کی قیمت سن کر ایکدم شکست ہو گیا ہے اب اپنی پریشانی کو چھپا نہیں سکتا۔ یوجین شدت اضطراب وذہنی سے بالکل بت کی طرح ساکت ہے)

م۔ (بھاری گلوگیر آواز میں۔ اس کی روح سخت ترین تکلیف کی وجہ سے بے اختیارانہ التجا کر رہی ہے) کینڈڈا!

ی م۔ (الگ حقارت کے لہجہ میں) بزدل!

ک۔ (معنی خیز انداز میں) میں تم دونوں میں سے کمزور ترین شخص کو اپنے تئیں حوالہ کرتی ہوں۔

(یوجین فوراً اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے اور اس کا چہرہ بھٹی کے لوہے کی طرح سپید پڑ جاتا ہے)

م۔ (اپنی شکست سمجھ کر سر تسلیم خم کرتے ہوئے) کینڈڈا! میں تمہارا فیصلہ قبول کرتا ہوں۔

ک۔ تم سمجھے یوجین؟

ی م۔ اف! میری تو دنیا تباہ ہو گئی۔ وہ اس خوشی کا بار نہیں اٹھا سکتا۔

م۔ (نہ یقین کرتے ہوئے اپنا سر ایک دم مضحک انداز میں اٹھاتے ہوئے) کیا تمہارا مطلب مجھ سے ہے کینڈڈا؟

ک۔ (کچھ مسکرا کر) اب ہمیں بیٹھ کر بالکل دوستوں کی طرح اس گفتگو کو ختم کر ڈالنا چاہیئے (ماریل سے) بیٹھ جاؤ پیارے (ماریل بالکل خود فراموش آتشدان کے پاس سے لڑکوں والی کرسی اٹھا لیتا ہے) یوجین میرے لئے وہ کرسی اٹھا تو لینا (آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یوجین بہت خاموشی سے کرسی لاتا ہے اور ماریل کے پاس اس سے کچھ پیچھے رکھ دیتا ہے۔ خود مہمانوں والی کرسی لے لیتا ہے اور آہستہ سے اس پر بے حس بیٹھ جاتا ہے جب سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو وہ اپنے متین، خاموش اور ہلکے لہجوں سے ان پر ایک سکوت کا عالم طاری کر دیتی ہے) تمہیں یاد ہوگا یوجین جو کچھ تم نے اپنے متعلق مجھے بتایا تھا کہ جب سے تمہاری بوڑھی دایہ فوت ہوئی کسی نے تمہاری طرف التفات سے نہیں دیکھا ہے اور کس طرح تمہارے فیشن ایبل بھائی اور بہنیں، تمہارے باپ اور ماں کے چہیتے تھے اور کس طرح تم اسکول میں تکلیف اٹھاتے تھے اور کس طرح تمہارا باپ آکسفورڈ میں تم کو جبراً بھیجنے کے لئے تم کو مالی تکلیف دے رہا ہے اور کس طرح تم کو پریشان بے آسرے اور بے ٹھکانے رہنا پڑا ہے۔ ہمیشہ تنہا بے یار و مددگار۔ نفرت اور بدگمانی کا شکار۔ بیچارہ!

ی م۔ [illegible] کے ہوتے میرے لئے میری کتابیں تھیں میرے سامنے مظاہر قدرت تھے [illegible]

تم سے ملاقات ہوئی۔

ک۔ خیر اس کا فی الحال ذکر چھوڑو۔ اب میں تمہیں اس بڑے لڑکے کے متعلق بتانا چاہتی ہوں اسکو شروع ہی سے لاڈ و پیار نے خراب کر دیا۔ ہم لوگ ہر مہینہ کم از کم دو مرتبہ اس کے والدین کے وہاں جاتے ہیں تم کبھی پر جین آنا تو میں تمہیں اس گھر کے پرانے ہیرو کی تصویریں دکھاؤں گی۔ جمیس کے بچپن کی تصویر جس میں وہ تمام بچوں سے عجیب وغریب ہے۔ جمیس کی آٹھ سال کی عمر کی تصویر جب اس نے اسکول میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ جمیس کی گیارہ برس کی تصویر جب وہ اپنی ٹیم کا کپتان ہوا تھا۔ جمیس اپنے پہلے فراک کوٹ میں غرضیکہ جمیس کی مختلف شاندار حالتوں کی تصویریں ہیں تم جانتی ہو کہ جمیس کس قدر مضبوط آدمی ہے مگر مجھے امید ہے کہ اس نے تمہیں زیادہ اذیت نہ پہنچائی ہوگی کس قدر ہوشیار ہے کس قدر خوش وخرم (سنجیدہ ہوتے ہوئے) جمیس کی ماں اور اس کی تینوں بہنوں سے پوچھو کہ ان لوگوں نے اسے صرف مضبوط، بہادر، ہوشیار اور خوش وخرم بنانے میں کس قدر تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ مجھے کس قدر تکلیف اٹھانا پڑتی ہے جبکہ تنہا مجھے اس کی ماں اس کی بہن اور اس کی بیوی اور اس کے لڑکوں کی ماں سب کا پارٹ ادا کرنا ہوتا ہے۔ پراسی اور میریا سے پوچھو کہ گھر کے کاموں میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے اور خاص کر جب ہمارے ہاں کوئی ملاقاتی ہم کو پیاز چھیلنے میں مدد دینے کے لئے نہیں ہوتا۔ ان سوداگروں سے پوچھو جو جمیس کو پریشان کرنے اور اس کے دلچسپ خطبے خراب کرنے آیا کرتے ہیں۔ کون ہے جو ان کو دور رکھتا ہے؟ جب ہم لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے تو جمیس انہیں دیتا ہے۔ جب نہیں ہوتا تو ان سے معافی میں مانگتی ہوں۔ میں اس کے آرام آسائش اور محبت کی خاطر گھر کو ایک قلعہ سا بنائے رکھتی ہوں اور دروازے پر ہمیشہ ایک نگران کی طرح کھڑی رہتی ہوں کہ معمولی قسم کی فکریں اندر نہ آنے پائیں۔ میں اس کو یہاں مالک بناتی ہوں۔ حالانکہ وہ خود اسے نہیں جانتا اور ابھی کچھ دیر ہوئے تمہیں بتلا بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کس طرح مالک ہے (شیریں طنز سے) اور حالانکہ جب اسے یہ شک ہوا تھا کہ شاید میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو پہلی فکر اسے یہ ہوئی تھی کہ ——— میرا کیا حشر ہوگا اور میرے یہاں قائم رہنے کیلئے

جانتے ہو اس نے کس چیز کی ترغیب دی۔ (اس کی طرف جھک کر اور ہر جلد پیاس کے بالوں کے لچھوں کو سہلاتی ہوئی) اپنی طاقت میری حفاظت کے لئے۔ اپنی محنت میری زندگی کے لئے۔ اپنا وقار میری شان کے لئے (رزم پڑتے ہوئے) نہیں میں تمہارے دلکش نغمہ کو غلط ترتیب سے خراب کئے دے رہی ہوں کیوں نا پیارے (محبت سے اپنا گال اریل کے گال سے ملا دیتی ہے)

م۔ (بالکل ازخود رفتہ ہو کر اس کی کرسی کے پاس گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اور اس سے بالکل بھولے بچوں کی طرح ہم آغوش ہوتے ہوئے) جو کچھ تم نے کہا بالکل صحیح کہا ایک ایک لفظ صحیح۔ جو کچھ میں ہوں تمہارا ہی بنایا ہوا ہوں تمہیں نے مجھے اپنے ہاتھوں کی محنت اور دل کی محبت سے بنایا ہے۔ تم میری بیوی بھی ہو، میری ماں بھی اور میری بہنیں بھی۔ ہر ایک کی محبت اور خبر گیری تم میں ملی ہوئی موجود ہے

ک۔ (اس کے بازوؤں میں ہلتی ہوئی یوجین سے) کیا یوجین میں تمہارے لئے بھی تمہاری ماں اور تمہاری بہنیں ہوں

ی م۔ (اٹھتے ہوئے سخت حقارت کے انداز میں) نہیں کبھی نہیں!! اچھا تو بس اب میں جاتا ہوں۔

ک۔ (ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے) نہیں یوجین کیا تم اتنی رات گئے چلے جاؤ گے؟

ی م۔ (اس کے الفاظ میں اب ایکدم مردانہ لہجہ آگیا ہے لڑکوں والا لہجہ نہیں رہا) مجھے معلوم ہے کہ کونسا وقت کس بات کے لئے مناسب ہے۔ جو کچھ مجھے کرنا ہے۔ اس کو کرنے کے لئے بیتاب ہوں۔

م۔ (وہ بھی کھڑا ہو گیا) کینڈڈا اسے کوئی عجلت کی بات نہ کرنے دینا۔

ک۔ (مطمئن۔ یوجین کی طرف مسکراتے ہوئے) نہیں اس کا ڈر نہیں ہے۔ وہ بغیر خوش ہوئے زندہ رہنا سیکھ گیا ہے۔

ی م۔ مجھ کو اب خوشی کی تمنا نہیں رہی۔ زندگی خوشی بہت بہتر اور برتر چیز ہے۔ پادری جیمس میں دونوں ہاتھوں سے اپنی خوشی ختم کر دیتا ہوں مجھے تم سے محبت ہے اس لئے کہ تم نے اس عورت کو آسودہ کر دیا ہے جس سے میں محبت کرتا تھا۔ خدا حافظ۔ (وہ دروازہ کی طرف جاتا ہے)

ک۔ اچھا ایک آخری بات اور سن لو (وہ رک جاتا ہے لیکن بغیر اس کی طرف مڑے ہوئے کینڈڈا اس کے پاس جاتی ہے) تمہاری عمر کیا ہے یوجین؟

[illegible]

ک۔ (شارہ) اچھا تو تم میری خاطر ذرا دو جملوں کو ایک نظم میں نظم کر دینا اور مجھ سے وعدہ کرو کہ جب کبھی میرا خیال آئے گا ان کو ضرور کہہ لیا کرو گے

ی م۔ (بغیر کوئی حرکت کئے) جلدی بتاؤ کیا ہیں؟

ک۔ جب میری عمر تیس برس کی ہوگی اس کی بیتالیس کی۔ جب میں ساٹھ کا ہوں گا تو وہ پچھتر کی ہوگی۔

ی م۔ (اس کی طرف مڑتے ہوئے) یہ تو کوئی بات نہیں ایک سو برس میں ہم دونوں عمر کی ایک ہی منزل میں ہوں گے۔ لیکن اس سے بہتر مجھے ایک بھید معلوم ہوگیا ہے جو میرے دل میں محفوظ ہے اچھا بس اب مجھے جانے دو۔ رات بہت جا رہی ہے اور موسم باہر بہت خراب ہے۔

ک۔ خدا حافظ۔ (اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے وہ اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے۔ اور فوراً گھٹنوں کے بل ہو جاتا ہے وہ اس کی پیشانی چوم لیتی ہے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے چلدیتا ہے۔ کینڈڈا ماریل کی طرف واپس آتی ہے اپنے بازو پھیلائے ہوئے) آہ جیمس!

(دونوں ہمکنار ہو جاتے ہیں لیکن دونوں یہ نہیں سمجھ پاتے کہ شاعر کونسا بھید اپنے دل میں لے کر گیا)

(پردہ)

مترجمہ نور الحسن ہاشمی

نوید فردا

اب غمِ دل ہی علاجِ غمِ دوراں ہوگا
دردِ کونین ہی اب مژدۂ درماں ہوگا

دورِ تاریکیٔ پیہم ہے تو غم کیا ناداں!
تپشِ زیست اگر کم ہے تو غم کیا ناداں!

شعلۂ مرگ جو برہم ہے تو غم کیا ناداں!
شعلۂ مرگ ہی اب سر بگریباں ہوگا

یہ تباہی ہے اک آبادیٔ نو کی تقریب
غرق کر دے گی مشیت یہ طلسمِ تخریب

خواب ہو جائے گا، آلام کا سیلاب مہیب
سرد آتشکدۂ فتنۂ دوراں ہوگا

یہ جو لہرا کے اٹھا ہے افقِ امکاں سے
پھول برسیں گے ابھی ابرِ شرر افشاں سے

کیوں ہے تجھ کو غمِ طوفاں کہ اسی طوفاں سے
اک نیا ساحلِ امید نمایاں ہوگا

اک نئی صبح کی تعمیر ہے تاریکیٔ شام
لمحہ لمحہ ہے یہاں قاصدِ تجدیدِ نظام

یہی شعلے کہ جو لائے ہیں خزاں کا پیغام
انہیں شعلوں سے چراغانِ بہاراں ہوگا

خود ہی اٹھ جائیں گے سرمایۂ محنت کے حجاب
رخِ گیتی نظر آئے گا برافگندہ نقاب

جگمگا دے گا جہاں کو نفسِ عالمتاب
پردۂ ابر سے خورشید نمایاں ہوگا

عدل و انصاف و مساوات کا پرچم لے کر
ابنِ آدم کے لئے جنتِ آدم لے کر

زندگی آئے گی تسکینِ دو عالم لے کر
یہ جہاں غیرتِ کاشانۂ رضواں ہوگا

سینۂ دہر سے ہٹ جائے گا سنگِ بیداد
کر سکے گا نہ کوئی روحِ بشر کو ناشاد

تازگی قلب کو بخشے گا ضمیرِ آزاد
ذوقِ پرواز، بصد ناز پر افشاں ہوگا

بند ہو جائے گا دروازۂ مکر و تزویر
نہ سنے گا کوئی افسانۂ دار و زنجیر

دل شکن ہی نظر آئے گا نہ کوئی دلگیر
دلِ انساں ہی نگا ہ دلِ انساں ہوگا

جلوہ گر ہوگی زمانے میں وہ تہذیبِ عظیم
بہرِ تن شوق ہے جس کیلئے ہر قلبِ سلیم

[illegible] کوثر و تسنیم و نسیم
[illegible] سے حسن کے [illegible] ہوگا

شعلۂ غم کو بجھا دے گی ہوائے دوراں ۔ سرِ آلام جھکا دے گی ہوائے دوراں
پھول کانٹوں کو بنا دے گی ہوائے دوراں ۔ دامنِ دہر گل افروز و گل افشاں ہوگا

خود پرستی کا جہاں سوز ترانہ کب تک! ۔ امتیازات تمدن کا بہانہ کب تک!
نسل اور رنگ کا تاریک فسانہ کب تک! ۔ عام اب ہر شرفِ عالمِ امکاں ہوگا

یہ تمدن جسے پندارِ خود آرائی ہے ۔ یہ تمدن کہ جو پروردہ دارائی ہے
یہ تمدن کہ جو انسان کی رسوائی ہے ۔ یہ تمدن ہی اب اک خوابِ پریشاں ہوگا

عافیت خانۂ جمہور بنے گی دنیا! ۔ سوزِ دل سے ہمہ تن نور بنے گی دنیا!
ہم نشینِ شہ و مزدور بنے گی دنیا! ۔ کوکبِ امن و مساوات درخشاں ہوگا

خاک ہو جائے گی لندن انھیں میدانوں کی ۔ خلد بن جائے گی دنیا انھیں ویرانوں کی
اب بدلنے کو ہے تقدیر بیابانوں کی ۔ اور ہی رنگِ رخِ گردشِ دوراں ہوگا

صبحِ نو عرش سے پیغامِ بقا لائے گی ۔ بہرِ اربابِ وفا، روحِ وفا لائے گی
مژدۂ خدمتِ مخلوقِ خدا لائے گی ۔ خدمتِ خلقِ خدا مذہبِ انساں ہوگا

بھوک اور غم کے مظالم نہ سہے گا انساں ۔ اب نہ افلاس کی موجوں میں بہے گا انساں
کسی انساں کا بھکاری نہ رہے گا انساں ۔ ہر بشر نازکشِ رحمتِ یزداں ہوگا

شمعِ بیداریٔ افکار فروزاں ہوگی! ۔ آگہی جراتِ احساس پہ نازاں ہوگی!
زندگی نغمۂ آزادیٔ انساں ہوگی! ۔ دہر گہوارۂ آزادیٔ انساں ہوگا

کم نگاہی کی ضرورت نہ رہے گی باقی ۔ یہ سلگتی ہوئی نفرت نہ رہے گی باقی
یہ چمن سوزِ سیاست نہ رہے گی باقی ۔ ایک ہی مرتبۂ لالہ و ریحاں ہوگا

اب جسے دولتِ عرفانِ یقیں حاصل ہے ۔ چشمِ بیدار و دلِ درد نشیں حاصل ہے
سوزِ دل سوزِ وفا سوزِ یقیں حاصل ہے ۔ وہی تاباں و درخشاں و فروزاں ہوگا

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی) ۔ **رَوِش صاحب صدیقی**

رابندرا ناتھ ٹھاکر (ٹیگور)

تری نوا تھی کہ ایک سحر کا کرشمہ تھا؛ ترا کلام تھا یا ایک طلسم زندہ تھا؛
خمارِ عشرتِ عرفاں سے نغمہ پُر کیف وہ تیرے گیت نہیں سادگی کا معجزہ تھا؛

وہ سوز و درد کی لذت ترے بیان میں تھی
جو ریشہ ریشہ میں ہر دل کے کل جہان میں تھی

سرودِ گیتی کے تاروں کو کیسا ملایا تھا! دلوں کے چنگ میں اک زمزمہ جگایا تھا
خزاں نصیبوں کو مژدہ بہارِ نو کا دیا! پیام کیا تھا جو تو نے انھیں سنایا تھا!

گداز و سوز کا کیا راز آشکار کیا!
زمین سوختہ بختی کو لالہ زار کیا!

بکھیر کر فلک نیلمی کا سوسنی رنگ سمیٹ کر شفق لالہ گوں کی بھولی ترنگ
ہلالِ صبح کی سیمیں شعاعیں ٹپکا کر ملا کے برقِ طربناک و صوتِ بے آہنگ

وہ کھینچی عیش ترنم کی جانفزا صہبا
سرودِ مستی سے لبریز کر دیا مینا!

تو سونے مندروں میں پھولوں کی مہک لایا تو اجڑے باغوں میں شادابی کی لہک لایا
سکھائے تو نے شگوفوں کو کس جہاں کے گیت گویا باغ کا جوبن سے اتنا چہک لایا!

وہ پھول جو تی کے جھڑتے تھے تیری نغمہ سحر
وہ بھینی بھینی صداؤں کا روپ بھرتے تھے!

شرارِ لالہ سے آتشکدے بنائے ہیں تبسمِ گلِ انجم سے گل کھلائے ہیں
چراغ پھولوں کے روشن صنم کدوں میں کئے جہاں صبا نے شگوفوں کے گیت گائے ہیں

شمیم نامہ ترے مطربِ چمن کا بنی
نسیم پیک ترے بھونروں کے وطن کا بنی

وہ لوریاں سی تھیں تیری رسیلی باتوں میں   پہیلیوں کی سی الجھن وہ سیدھی باتوں میں
وہ چٹکیاں سی اچھوتے ترے ترانوں میں   وہ میٹھا میٹھا سا اک درد میٹھی باتوں میں

یہ کہنا "دل میں تو آتے ہو سامنے بھی تو آؤ!
جو گنگناتے ہو وہ گیت مجھ کو بھی سکھلاؤ"

برہ کی آگ سے دل کے دیئے کو سلگانا   دکھوں کی بتیاں ایک ایک کر کے اکسانا
کبھی یہ پوچھنا "پوجا یہ کب قبول ہوگی؟"   غموں کے داغوں کو تاروں کی طرح گنوانا

یہ کہنا "آتے کدھر سے ہو یہ بتاؤ مجھے؟
کواڑ دل کے مرے کھول کے دکھاؤ مجھے!"

کبھی وہ پتوں کی تتلاتی سرسراہٹ پر،   کبھی وہ پھولوں کی شرمیلی چلبلاہٹ پر
کبھی وہ دور کے دھیمے سروں کے جھونکے پر   کبھی ہوا کے دبے پاؤں کی آہٹ پر

یہ کہنا چونک کے "دیکھو وہ آنے والے ہیں!
کدھر سو جا لگوں اندھیرے بھون میں تالے ہیں!"

جو گیت چھیڑے رباب حیات پر تو نے   اڑا لئے ہونٹوں سے پھولوں کے سوسن خوشبو نے
بسا دئے وہ نئی آس اور امنگوں سے   جو دل کہ یاس میں مدت سے تھے پڑے سونے

سما گئی ترے نغمہ کی لے زمانہ میں!
کہ جیسے چاندنی گردوں کے آشیانہ میں!

بسے دلوں میں ترے گیت جیسے پھولوں میں بو   سرور و کیف سے لبریز جیسے مے سے سبو
کرن خیال کی تیرے جہاں میں پھیل گئی   کہ جیسے بزم میں خوشبوئے نافہ آہو

سبک کش مے نغمہ ترا زمانہ ہوا
تری نوا سے کوئی تھا جو آشنا نہ ہوا

سریلے سُر ترے گیتوں کے دل میں کھبتے تھے   جو نشتروں کی طرح جاں کی رگ میں چبھتے تھے

نوٹ: ۱، ۲، ۳، ان تینوں بندوں میں ٹیگور کے گیتوں کے کم و بیش لفظ و خیال دوہرائے گئے ہیں۔

کبھی چراغ سے پٹ بیجوں کی روشنی کے   خیال تیرے چمکتے تھے اور بجھتے تھے

وہ لوریاں سی تھیں تیرے اچھوتے خوابوں کی

کہ جن میں چاندنی اور رات مل کے بہتی تھی!

سما گیا تھا ترے دل میں کس جہاں کا جمال   جو دل کے پردوں میں بھی چھپ کے رہ گیا تھا خیال!

سروں میں پھرتی تھیں پرچھائیاں سی شہانی!   جو ہو گیا کبھی بیتابی نظر کا سوال ہو

وہ کون تھا کہ جو چھپ چھپ کے گنگناتا تھا؟

دھنوں میں چھن کے تری راگ کس کا آتا تھا!

شفق کے پھول تھے یادیں ترے ترانوں کی   جو ٹہنیوں میں صبح شام کے لٹکتی تھی!

تری نوا میں نہ جانے کہاں کا جادو تھا   ہر ایک بات کلیجہ مسوس لیتی تھی!

سروں میں بین کے کیا بجلیاں سی کوندتی تھیں!

جو راز عشق کے کون و مکاں کو روندتی تھیں!

فضائے سوز کا تو آفتاب ہو کے رہا   جہان درد میں تو انتخاب ہو کے رہا

نشاط عشق کا کیا راز تو نے کھول دیا!   کہ روئے حسن ازل بے نقاب ہو کے رہا!

سرور کیف دو عالم ترے کلام میں ہے

خمار بادۂ وحدت ترے پیام میں ہے

وہ شعلہ عشق کا بھڑکایا خاک انساں میں   رفو کی جگہ نہ چھوڑی فنا کے داماں میں

چراغ اشک سے الفت کا راز ڈھونڈیا   جہان سوز کی ہر شمع شعلہ ساماں میں

نقاب تو نے اجل کا اٹھا کے دیکھ لیا

کہ زیست ماہ ازل پر کتاں کا پردہ تھا!

تا سے اب بھی وہ [illegible] کے تھی!   وہ [illegible] بھی کھلتے ہیں کل جو کھلتے تھے!

[illegible] کے گیت وہی   وہ سب [illegible] میں جو پہلے [illegible] تھے

[illegible]

وہی جمال وہی ساز، اور وہی نغمہ — وہی ہے مطرب عشق اور وہ درد کا زمزمہ
وہی بہار و خزاں ہے، وہی حیات و ممات — وہی ہے بزم، وہی شمع و سوز پروانہ!

ظروف میکدہ ہیں جام و شیشہ و مینا
ہوئے گسار کوئی خم میں ہے وہی صہبا!

وہی ہیں حسن کے گیسو اور عشق کا شانہ — وہی ہے ذوق خود آرائی اور آئینہ
وہی لباس بدلنا بہار کا ہر بار — وہی شہید خزاں کا ہے شاہد غنچہ

سبو نئے سہی، مے بھی نئی، نیا ساقی
ہیں کیف روح کے سامان تو وہی باقی

نظر وہی ہے نظارہ ہزار تازہ ہو — وہی ہے رنگ گل نو بہار تازہ ہو
وہی خموشئ غنچہ وہی تبسم گل — ہے دل میں داغ وہی لالہ زار تازہ ہو

ہزار پر لگیں لیکن وہی ہے روح قدیم
پیام صبح ازل کا وہی ہے پیک نسیم

ہے نقش فانی ازل کے نقاب کے باہر — کہ جیسے سایہ مہ و آفتاب کے باہر
نہ کیف بادہ ہے پیالہ میں نہ شیشہ میں — ہے نغمہ زمزمہ و تار و رباب کے باہر

دوام کا ہے ترے راز تیرے گیتوں میں
ہو جسم خاک، مگر تو رہے گا جیتوں میں

مئے کہن تھی ابد یت عنبریں میں نہ تھی — بھری تھی بجلیوں میں ماہتاب کی مستی!
کبھی جو مشک ملا کر وہ بادہ تند کیا — تو ذرہ ذرہ نشوں میں کرتی تھی رقص مدہوشی!

اسی جان کا صہبائی وہ جہان بھی ہے
اسی خمار کی انگڑائی آسمان بھی ہے!

آصف علی صاحب — (منزل علی ہلا ہور)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

انجمن تاریخی تحقیقات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رسالہ بابتہ ماہ اپریل [illegible]

مدیر شیخ عبد الرشید صاحب ایم۔ اے ملنے کا پتہ نمبرہ شبلی روڈ علی گڑھ قیمت فی پرچہ [illegible] کاغذ

وطباعت بہت عمدہ۔

یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کو ایک عرصہ کے بعد اس کا احساس ہوا کہ ملک کی آئندہ نسلوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اس کی سچی تاریخ لکھی جائے تاکہ وہ اپنے اسلاف کے [illegible] کو پڑھ کر اور ہر پہلو سے دیکھ کر سمجھ سکیں کہ دنیا کی سلطنتیں صرف قوت پر قائم نہیں رہتیں بلکہ رعایا [illegible] ہندوستان کی زمانہ وسطیٰ کی تاریخ جو انگریزی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں زیادہ تر سیاسی پہلو کو [illegible] اور معاشی رخ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کا بیڑہ علی گڑھ کی انجمن نے اٹھایا ہے اور [illegible] کے جدید تحقیقی رسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ خدا کرے اس جدوجہد میں وہ کامیاب ہو۔ ہندوستان کی [illegible] وسطیٰ کی تاریخ جو مسلمانوں نے لکھی ہے وہ فارسی زبان میں ہے اور اس زمانہ کے علمی مذاق کے مطابق اختصار کو ملحوظ نہیں کیا گیا ہے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تاریخی واقعات ادب کے استعارات اور مضمون [illegible] بلند پروازیوں میں الجھ گئے۔ انگریزی مورخوں کو یہ اچھا موقع ملا کہ واقعات کو الجھاؤ سے نکال کر اپنے مطلب کی اشاعت کے لئے ان پر رنگ آمیزی کی۔ بہت سے واقعات ہندوستان کے [illegible] جو کے نفس مطلب کو اگرچہ مورخوں نے صرف منقول ہی نہیں کیا [illegible]

[illegible]

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہازراں کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی اور کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام نئی وضع کے سات جہازوں کا شاندار بیڑا جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس اسلامی

وزن ۹، ۵۰۷ ٹن

بھی شامل ہے۔

گذشتہ موسم میں جب کہ جنگ کی وجہ سے جہازرانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا اور نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن، جدہ اور بحیرہ احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشس تک مسافر اور باربرداری کی سروس

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جا سکتی ہیں تفصیلات کے لئے خط کتابت کیجئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۶ بینک اسٹریٹ بمبئی

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے سنہ ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیا کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں، جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے، بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے)، آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر۔ خانہ باغ ۔ لکھنؤ

معاصر مدینہ کی رائے

نئی کتابیں

اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ اور یہاں کے تعلیمیافتوں میں اردو خواں طبقہ کی اکثریت ہے لیکن اردو لٹریچر کا دامن ایسی کتابوں سے تقریباً خالی تھا۔ جن کے مطالعہ سے حالات حاضرہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ بہی خواہان اردو نے اس طرف توجہ فرمانا شروع کردیا ہے۔ اور ایسی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ جن سے پڑھنے والوں کی نہ صرف سیاسی تربیت ہوسکتی ہے بلکہ وہ آئے دن کے سیاسی و قومی انقلابات کے اسباب و نتائج کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو بڑی بڑی قیمتی کتابیں نہیں خرید سکتے۔ یا ان کے پڑھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ ان کا مطالعہ بہت زیادہ مفید ہوگا۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست۔ از عشرت علی صدیقی بی اے۔ کتابی سائز۔ مجلد صفحات ۱۷۲۔ عمر

قومیت اور بین الاقوامیت۔ از محمد قاسم حسن، بی اے، بی ٹی کتابی سائز، مجلد صفحات ۱۷۴۔ عمر

بحر الکاہل کی سیاست۔ از امین خالدی۔ کتابی سائز مجلد صفحات ۱۹۲۔ قیمت عمر

نازیت۔ از شاہد حسین رزاقی ایم اے (عثمانیہ)، کتابی سائز: مجلد صفحات ۱۷۲ عمر

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی

پرواز خیال

یہ مجموعہ ہے ملک کے مایہ ناز ترقی پسند ادیب و شاعر جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کے ان عدیم المثال افسانوں کا مجموعہ ہے جو رفعت تخیل اور حسین پرشکوہ الفاظ کے اعتبار سے شاہکار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ یہ ہندوستان کے مختلف معیاری رسائل اور اخبارات میں شائع ہو کر ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

یہ عدیم النظیر افسانے اردو لٹریچر میں بالکل نئی چیز تسلیم کئے گئے ہیں جو ہماری اخلاقی اور مجلسی زندگی کی بہترین تصویر ہیں۔

اس مجموعہ میں جزئیات سیرت نگاری اور تخیل جذبات یعنی تبسم و مسکراہٹ، حسن و محبت ناز و نیاز، سوز و گداز، یاس و امید، ناکامی و کامرانی، اخلاق و کردار، محبت و نفرت اور آزادی و غلامی کے ایسے ایسے نادر نمونے مطالعہ کے بعد آپ کی نظر سے گزریں گے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔

غرضیکہ ہر افسانہ مصنف کی اعلیٰ ترین علمی طرز نگارش اور قلبی کیفیات اور روحی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی، اور ترتیب دلکش جلد نظر افروز۔

حجم ۲۴۰ سائز ۲۶×۱۶ قیمت عہ مجلد

کتاب میں مصنف کا فوٹو بلاک بھی شامل ہے

ملنے کا پتہ

نظامی پریس، بدایوں

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

جولائی سنہ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ کاغذ سازی
۲۔ بچہ پر موروثی اثرات
۳۔ اصول تعلیل اور جدید طبیعیات
۴۔ ہوائی حملہ اور زہریلی گیسیں

اگست سنہ ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ سائنس
۲۔ حیوان کی گرمائی اور سرمائی نیند
۳۔ اوزان اور پیمانوں کی معیار بندی
۴۔ ہمارے دانت
۵۔ دوران خون

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق سوال و جواب، سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ علم کے شائقین حضرات زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔ تفصیلات کے لئے طلب کئے جا سکتے ہیں۔

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک • فی نسخہ ۱۲ آنے

المشتہر

[illegible]

رسالہ ہندوستانی

رسالہ ہندوستانی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے حکومت صوبجات متحدہ کی سرپرستی میں گیارہ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ ہے، جو اکیڈمی کا آرگن ہے۔ اس میں قدیم و جدید علوم و فنون کے اہم موضوعات پر، ماہرین فن اور کہنہ مشق اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس استناد کی وجہ سے یہ رسالہ، رسالہ نہیں ہے بلکہ حوالے کی ایک کتاب ہے۔ ہر کتب خانے میں اس کی جلدوں کا موجود رہنا نہایت ضروری ہے۔ رسالے نے ۱۰، ۱۱ سال کے عرصہ میں علم و ادب کے جو اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں، ان کی وجہ سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہو گیا ہے کہ اب وہ اردو زبان کے دو تین سب سے ممتاز رسالوں میں سے ایک ہے۔ احباب کی علم دوستی سے امید ہے کہ اس کے حلقۂ خریداری میں شامل ہو کر علم و ادب کی خدمت کا اس کو موقع عطا فرمائیں گے۔ اسی سلسلے میں اس کی توسیع اشاعت کی طرف بھی جناب کو توجہ دلاتا ہوں۔ جو حضرات اس کی خریداری منظور فرمائیں گے، یا جو پانچ خریدار بہم پہنچائیں گے، ان کی خدمت میں اکیڈمی کی بعض مطبوعات نصف قیمت پر پیش کی جائیں گی۔ ان مطبوعات کی تفصیل دفتر سے معلوم ہو سکے گی۔ رسالے کا سالانہ چندہ [illegible] ہے۔

خریداری اور اس سلسلے کی خط و کتابت کے لئے ذیل کے پتے سے رجوع فرمایئے

دفتر رسالہ ہندوستانی، ہندوستانی اکیڈمی صوبجات متحدہ

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

جناب نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس

صدر دفتر کانفرنس سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک، مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے اس اخبار پر نہایت عمدہ الفاظ میں ریویو کر کے اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی مدح و ستائش کی ہے۔ متعدد تعلیم یافتہ اصحاب اس میں مضامین لکھتے ہیں۔ ایک کارڈ لکھنے پر نمونہ مفت ملتا ہے۔ قیمت سالانہ تین روپیہ۔

ہر خریدار کو جو اخبار کی سالانہ قیمت پیشگی عنایت فرمائیں، حسب ذیل کتابیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ التربیۃ والتعلیم۔ ضخامت مع ٹائٹل ۱۵۰ صفحے۔

یہ کتاب مصر کے مشہور فاضل علامہ سید رشید رضا ایڈیٹر المنار کی تین معرکۃ الآرا تقریروں کا مجموعہ ہے جو ممدوح نے سیاحت ہندوستان کے موقع پر اجلاس ندوۃ العلما لکھنؤ، محمڈن کالج علی گڑھ اور مدرسہ دیوبند میں فرمائیں۔ ہر تقریر کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے قابل ہے۔

۲۔ رسالہ تمدن و معاشرت۔ ضخامت ۱۰۰ صفحے۔

یہ کتاب ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم کے ۲۲ مفید مضامین کا مجموعہ ہے۔ مثلاً اس میں ۸ بہترین مضامین سر سید مرحوم کے ہیں۔ تین نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں کے ہیں اور پانچ مضمون نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کے ہیں۔ اس کے علاوہ سید محمود مرحوم اور مولانا حالی مرحوم کے مضامین ہیں

مندرجہ بالا کتابوں کا محصول خریدار کے ذمہ ہوگا۔ لہذا جو صاحب خریداری منظور فرمائیں وہ تین روپے سات آنے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی بھیجنے کی اجازت دیں۔

ملنے کا پتہ۔ دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

سیاسیات

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ روزہ رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعے اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ رسالے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر شخص کو پڑھنا چاہیے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری ذہنی تنگ نظری کی اصلاح ہو گی۔

خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر تاریخ سیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن [illegible] کے متعلق [illegible]

[illegible]

نئی کتابیں

[illegible] بے نیا

منّا فان بارن ہلم ایک دلچسپ اور سبق آموز رومانی ڈرامہ ہے، جسے مشہور جرمن شاعر لیسنگ نے اپنے زورِ قلم سے دوامی قبول عام بخشا۔ اور یورپ کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

ڈاکٹر سید ابوالعلم دبیر صاحب نے بہت محنت سے اس ڈرامے کا اردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں ترجمہ خاصہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کام کے لئے ایک پختہ کار ادیب کی محنت و توجہ کی ضرورت تھی تاہم دبیر صاحب کی محنت قابل داد ہے۔ قیمت ۱۰/

(حنیفہ مجبور)

بہارلا اور دوسرے رومانی افسانے — مصنفہ شفیق بانو صاحبہ۔ شفق۔ بہارلا میں سے چھوٹے انیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ موصوفہ نے اچھی زبان میں یعنی اس زبان میں جو ہماری بہنیں گھروں میں بولتی ہیں، یہ مختصر افسانے لکھے ہیں۔ زبان میں روانی ہے اور اظہار خیال کا طریقہ پاکیزہ ہے۔ ستھری زبان کے ساتھ جگہ جگہ چست اور چبھتے ہوئے فقرے افسانوں کی جان ہیں۔ قیمت ۱۲

حیات اجمل — حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات ہے۔ جس میں مرحوم کے مختصر حالات علمی و ملکی حالات، مطب اور سفروں کے واقعات درج ہیں۔ قیمت [illegible]

انتظام کتب خانہ — اس رسالے میں کتب خانے کی حفاظت اور [illegible] کتابوں کے [illegible] کی تقسیم [illegible] اور [illegible] کے اعتبار سے اور جلد سازی [illegible]

[illegible]

قیمت [illegible]


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۵ نمبر ۴	بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۱ء	چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

احسن مارہروی (مرحوم)

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں (میر)

مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو ان سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر ان کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اردو داں طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں ان کے فیصلے اکثر دبیشتر بے چون وچرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کے اُن لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں سے ان تک پہنچے تھے بایں ہمہ وہ اردو ادب و شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار۔ اس نئے دبستان کے نقطہ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے خواہ شاعر کا مسلک ان کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اردو میں مغربی انداز کی تنقید ان کے سامنے مقبول و مروج ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ اردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا مولانا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات اور تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے دوسرے کے نقطۂ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے اس اعتبار سے ان کو ترقی پذیر اور ترقی پسند قرار دینے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ ترقی پذیر اور ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سنے

رحلت کے وقت مرحوم کا سن ۶۵-۶۶ کے لگ بھگ رہا ہوگا جسم کے بھاری بھرکم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوشدلی اور تواضع فشی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرا ہوا فوراً اس کی ڈھونڈ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے مطلب برآری نہ ہوئی تو بلا کسی لحاظ اور تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی ادھیڑ بن میں رہے۔ بالاخر بات واضح ہوگئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتائے۔

اس بارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سعی و جستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات پروفیسر کرنکو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لئے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم متبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کرکے بتائیں گے۔ جب بات منقح ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے۔

پروفیسر کرنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ بوڑھے ہنس مکھ، بات کرنے کے شائق، متوسط جسم لمبا قد، عینک لگائے ہوئے۔ اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لئے اکثر لائبریری پہونچتے ہیں۔ پروفیسر کرنکو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے ہوتے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب کرتے گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اسے مخاطب کرکے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی اس کا خلاصہ سنا کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار (Model de Luxe) کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ

بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کہلوایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ سے کم نہ تھی

زبان و بیان یا شعر و شاعری سے متعلق باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر مرحوم ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھتے۔ کہتے تھے استاد داغ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث یا محل استعمال کے بارہ میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ ان الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اُردو میں آتے ان پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرتے والے بعد میں لکھتے کہ مولنا مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اُردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کرتے کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولنا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولنا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے۔ ان کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں نوجوانوں میں نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے اُن میں اِن سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام۔ کہتے تھے زبان کی غلطی کیسے سن لوں ساری عمر اسی میں گنوائی۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کبھی تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔

ایک دن شعبۂ اردو میں ایک صاحب تشریف لائے یہ گورداسپور میں ریلوے میں ملازم تھے مسودا کا بستہ ساتھ تھا اردو شعراء کا مبسوط تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غریب نے ملازمت کس محکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی اثنا میں مرحوم تشریف لائے۔ نووارد کا ان سے تعارف کرایا گیا۔ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا غیر حاضر سے ہیں۔ نووارد سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولانا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسودہ کی طرف مائل ہوں مولانا نے مطلق التفات نہ کیا اس سے نہ تو نووارد کی دل جمعی ہوئی نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کو اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی۔ مولانا نے کسی قدر اکتا کر مسودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ کہکر مسودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولانا نے بغیر ان کی طرف رخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کیا دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں۔ مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرات نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا لکھا تا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف ہوئے میں نے عرض کیا مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چاہئے مفت میں پلوا دیں!

مولانا نے بے ساختہ بہت زور سے قہقہہ مارا۔ نووارد سے بہت کچھ التفات فرمایا اور بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سمائی نہیں اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا

ایک دوست نے مولانا کو انتہائی رازدار سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بدنصیبی سے مولانا کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب "سینۂ بسمل سے پر افشاں" نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولانا سنی اَن سنی کرتے جاتے تھے اور جب انھیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انہوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھر کم جسم کو اس طرح تولا یا اس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور نکان میں آکر پھونکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا۔

میں اُن کے ارادہ سے واقف ہو گیا۔ میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی ان سے اتنی ہی دور کر لی جتنی انہوں نے قریب کی تھی۔ مولانا کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ انہوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہ کیا اور نفس مضمون پر آنے کی جد و جہد شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ پسپا نہ ہوں گے چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اٹھ کر بھاگا۔ مولانا بآن جسد عنصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہی فرمایا رشید صاحب ارے وہ بھی سنا۔ میں بھاگنے کی سائنس و آرٹ یعنی (Rearguard action) ریر گارڈ ایکشن[1] (جنگ پسپائی) سے پورے طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے ہی ہوئے جواب دیا۔ جی ہاں مولانا میں ابھی آتا ہوں مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے میں دروازے سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی۔ میں گر گیا مولانا نے راز فاش کر دیا تھا

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ سترہویں صدی کے آخر یا اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے اور اس خاندان کے بانی ہوئے

---

[1] اس سلسلہ میں غالب کا ایک شعر آپ کو یاد ہوگا

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق — جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

چنانچہ مرحوم کے عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے۔ علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور تک مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اسوقت نظر آئی جب مولانا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور سے وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے۔ جب کوئی بچہ آتا، اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا مولانا کے قریب جا کر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے انکی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے پاجامے۔ سر پر بال باریک ترشے ہوئے۔ پاؤں میں جوتا، سر پر ٹوپی، چلنے پھرنے ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شگفتگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے ننگے سر پھرنے یا انواع اقسام کے نکر اور قمیصیں پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آزادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے، مولانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور رہتے تھے۔ بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ یہ قل آعوذیت تھی، قل آعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن نسوانیت یا شہدپن کے مقابلہ میں قل آعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دیا جا سکتا لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لئے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہانتک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے

پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں نہ ان کو ملزم قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی دنیا زمانہ مجموعہ صد کرامات سہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی انسانوں اور انسانیت کے لئے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔

مرحوم پرانی دنیا کے آدمی تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چولیں سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے۔ مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے۔ ہر جگہ ان کی پذیرائی خوشدلی سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے۔ تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیسی کر گذرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب کبھی ان پر فقرے بھی چست کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا، بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جبکہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو کھا رکھنے میں تماشائے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو معترض کیوں ہوتے ہو!

مرحوم شاعری کے قدیم دبستاں کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری، تصنیف و تالیف تحقیق و تدقیق میں گذاری اپنے استاد کے مسلم الثبوت پیرو تھے لیکن کلام میں استاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی شوخی رنگینی و جدت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا زبان، محاورہ، مصطلحات و متعلقات شاعری کے

سمجھنے پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اٹھتے جارہے ہیں صحت زبان اور مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس برتے پر کرے۔ شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے جارہے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں۔ فنی تبحر بڑی چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے۔ اس لئے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گذرا ہے۔ شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیحضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحہ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولانا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا عالم یہ تھا کہ شعبہ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں ہر طرح کے طلبا اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جارہی ہے مشکل سے تین چار دن گذرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہوگئی۔ مولانا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اسوقت ہوسکتا ہے جب اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیش نظر ہوں۔

ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے برسبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرعہ طرح دیدیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کردیں۔ مولانا مرحوم یہ سن کر آپے سے باہر ہوگئے آواز میں لکنت تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہوجاتا تھا ململ کا ڈھیلی آستین کا کرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستینیں چڑھالیں اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔ میاں ہوش میں آؤ، یہ کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر صاحب کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے۔ جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پر پڑیں تابڑ توڑ جوتے اس وقت مصرعہ طرح دو دیکھیں

کون کتنے پانی میں ہے۔

مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا، مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعر کے صدر رہیں۔ اگر مجوزہ آداب آئندہ سے مشاعروں میں نافذ کر دیے جائیں تو کیسا ہو۔ مرحوم قہقہہ مار کر کرسی پر لیٹ گئے۔ کہنے لگے بڑا اچھا ہو کمبخت گویوں سے نجات ہو جائے!

منوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں فصل ۔ میں کس کس قسم کے وحوش وطیور کہاں کہاں سے کھنچکر آتے ہیں اور صید وصیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔ صف اول میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں یکہ بانوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرعہ مجھے یاد ہے

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی بھلے مانسوں کے سیدھے سادے لب ولہجہ میں یہ رباعی پڑھی۔

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانان سخن بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے اس شعر پر جو صف اول کو مدنظر رکھکر پڑھا گیا، مجمع سے وہ نعرۂ تحسین وتہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت یہ مصرف خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف وانہماک سے اس کا اہتمام کرتے تھے اور شعرا مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے یہاں کوئی تقریب منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے وہ ایک دن بڑی چہل پہل کے گذرتے۔ ہر شاعر کا پورا پورا حفظ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور ومطمئن رہتا۔

اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا چنانچہ

رخصت لے کر بمبئی گئے۔ وہاں احباب اور قدر دانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اس زمانہ میں یہاں پر وائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دیے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے اس بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولانا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبہ کی بھی خیر نہیں۔ میری طلبی ہوئی۔ مکالمہ سنئیے۔

صاحب۔ (سرخ ہو کر اور سہ کرسی میری طرف رخ کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

میں۔ (متعجب و سراسیمہ ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے، جناب!

صاحب۔ (چیں بجبیں ہو کر) بے شک مولانا صاحب نے کیوں درخواست دی۔ ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض سے انھوں نے غفلت برتی۔

میں۔ جناب والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہئے۔

صاحب۔ (نہایت غصہ ناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر گئے کیوں؟

میں۔ شعر پڑھنے

صاحب۔ شعر!

میں۔ شعر، جناب والا!

صاحب۔ اپنے شعر!

میں۔ مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب۔ لیکن یہ ہوا کیا!

میں۔ ہوتا ہوتا کچھ نہیں عالیجاہا لیکن مانتا کوئی نہیں۔

صاحب۔ تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے؟

میں۔ جناب والا میں اپنی نالائقی تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب ان سے بھی گفتگو فرمالیں بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی۔

صاحب۔ بہت خوب مولانا کو میرے ہاں لانا۔ (کسی قدر زہر خند فرماکر) مجھے اب تک ان سے ملنے کی مسرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

(دوسرا منظر)

پرو وائس چانسلر صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی۔ میں اور مولانا حاضر ہوئے۔ صاحب یک لخت جھجکے لیکن فوراً ہی سرو قد ہوکر مولانا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرساں حال نہ تھا۔ البتہ میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجالانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سرو قد کھڑے ہو گئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہو گئی۔

(ڈراپ سین)

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھ چکے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت آزردہ و برہم چلے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آگئے۔ معلوم ہوا بعض طلبا کلاس میں سکوت وسکون قائم نہیں رہنے دیتے۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔

معاملہ رفت وگزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو ہوئی فرمایا۔ رشید صاحب اطلبا پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گذارنے اور تفریح وتفنن کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہیں کرلیں علم تو ان کو آنے کا نہیں۔ میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجئے گا۔ یہ طلبا کا قصور نہیں ہے دنیا کا یہی رنگ ہے۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدر وقیمت رکھتی تھیں اب وہ مردود

ہو چکی ہیں جنظ مراتب اٹھ چکا ہے۔ یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کر دیجئے نہیں لڑکوں کو معاف کر دیجئے۔ ان کو نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کا شکار ہیں۔

مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا۔ بولے جی نہیں۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجئے۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا مولانا فرض کیجئے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجئے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجئے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کر لیتے ہیں۔ مولانا دھیمے پڑ گئے اور کسی قدر مدھم سروں میں انا للہ — پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔ برسات میں پھنیوں سے لد جاتے لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو در کنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ذیابیطس کے پرانے مریض تھے لیکن اس کی بالکل پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس وضعداری نے کاربنکل سے دو چار کیا اور کاربنکل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعاد عمر ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے جو ان سے بہت کم عمر والوں کے لئے مشکل تھا۔ ان کے قوائے ذہنی و جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں بزرگ۔ کیسے کیسے زمانے کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوئے، یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۳۰ راگست ۱۹۴۰ء کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہونچ گئی۔

اگست ۱۹۴۰ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا۔ مکان سے یونیورسٹی آرہا تھا کہ خبر ملی کہ مولانا احسن صاحب کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہونچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے اور کہیوں

حضور، سنتا ہوں خندانؔ[1] شائع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے۔ پڑھ کر واپس کر دوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب اور کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب اللہ اکبر! میں مبہوت ہو گیا اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان و زمین کی ساری پہنائیوں پر مریض کی شخصیت مستولی ہو گئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے رشید صاحب خدارا کتاب بھیجدیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں!

عجیب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

رشید احمد صدیقی

---

[1] راقم الحروف کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ جو اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

گرانی اور ہندوستان

وہ زمانہ تو بہت دور گیا جب سیاسی جنگیں لڑی جایا کرتی تھیں۔ اب تو معاشی لڑائیوں کا زور ہے ہر فریق دوسرے کو معاشی زک پہونچانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے اثاثوں کو ضبط کرنا بحری ناکہ بندی، سامان لانے اور لیجانے والے بدرقوں پر حملے، دشمن کے کارخانوں اور گوداموں پر گولہ باری اور اپنے علاقوں کو دشمن کے قبضہ میں جانے سے پہلے خود ہی ہر طرح تباہ کر دینا کامیابی کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ نازیت، فاشیت، اشتراکیت، جمہوریت، شہنشاہیت اب صرف سیاسی اصطلاحیں نہیں ہیں بلکہ ان میں معاشی مفہوم بھی پنہاں ہیں۔ بلکہ ہر "یت" کا بذات خود ایک مکمل معاشی نظام ہے اور ان ہی مختلف نظاموں میں کشمکش جاری ہے۔ پھر چونکہ ذرائع حمل ونقل کی آسانیوں، صنعتی ترقیوں اور تجارت خارجہ کی سہولتوں کی وجہ سے ساری دنیا ایک بین الاقوامی معاشی نظام کے دائرے میں آگئی ہے اس لئے یہ کشمکش اور زیادہ شدید نظر آنے لگی ہے کوئی ملک اپنی روزانہ کی استعمال کی معمولی معمولی چیزوں کو لے لے اور دیکھے کہ وہ کہاں کہاں سے آ رہی ہیں، ربر، بنسل، پالش کی ڈبیاں۔ استروں کے بلیڈ، صابن تیل رومال وغیرہ دیکھنے میں کس قدر حقیر معلوم ہوتی ہیں مگر دنیا کے دور دراز ملک ان چیزوں کو مہیا کرتے ہیں۔ جب بھلا معمولی چیزوں کا یہ حال ہو تو پھر اہم اور ضروری کا تو ذکر ہی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ لڑائی دو ملکوں کے درمیان ہوتی ہے مگر اس کا اثر ساری دنیا پر پڑتا رہتا ہے۔

موجودہ جنگ کی طرح تو آج تک دنیا میں کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں۔ اس جنگ میں ساری دنیا کے ملک تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک حملہ کرنے والے اور ان کے ساتھی۔ دوسرے مدافعت کرنے والے اور ان کے ساتھی۔ تیسرے غیر جانبدار، یہ تقسیم کوئی نئی نہیں ہے بلکہ ہر بڑی لڑائی میں ایسا ہی ہوتا ہے مگر دوسری لڑائیوں میں غیر جانبدار ملکوں کی تعداد زیادہ رہا کرتی تھی لیکن اس لڑائی کی خصوصیت

یہ ہے کہ اس میں غیر جانبداروں کی تعداد کم ہے اور نسبتاً روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس دائرہ میں بھی بعض نام نہاد طور پر غیر جانبدار ہیں ورنہ وہ کسی ایک فریق کے ساتھ ہیں مثلاً امریکہ آئینی طریقہ پر تو لڑائی میں شریک نہیں لیکن وہ کھلے بندوں اتحادیوں کا ساتھ دے رہا ہے یا اسپین علی الاعلان محوری طاقتوں کی طرفداری کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بعض ملک ایسے ہیں جن کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حقیقی معنوں میں غیر جانبدار ہیں۔ اس طرح یہ دائرہ بہت ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے اور ایسی صورت میں دنیا جنگ کے معاشی اثرات سے جتنی بھی متاثر ہو کم ہے۔

جنگ کا ایک عام معاشی اثر گرانی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم گرانی کے اسباب اور ہندوستان پر اس کے اثرات کو ظاہر کرنے کی حد تک محدود رہیں گے۔

گرانی کے اسباب | گرانی کیوں ہوتی ہے؟ اس مختصر سے سوال کا جواب دو چار لفظوں میں نہیں دیا جا سکتا گرانی کے اسباب معلوم کرنے سے پہلے ہمیں اپنی ضروریات کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ایک وہ جو دوسرے ملکوں میں پیدا یا تیار ہوتی ہیں اور وہاں سے ہمارے ملک میں آتی ہیں دوسرے وہ چیزیں جو خود ہمارے ملک کے اندر پیدا یا تیار کی جاتی ہیں۔ اب باہر سے آنے والی چیزوں کو لیجئے ان کی قیمت اس لئے گراں ہوتی ہے کہ

(۱) درآمد کرنے والے ملک ہمارے دشمن یا ان کے ساتھی ہیں اس لئے مال وہاں سے نہیں آسکتا۔

(۲) درآمد کرنے والے ملک ہمارے دوست ہیں۔ مگر ان کی توجہ جنگ کی طرف ہے اس لئے وہ ذخائر حرب زیادہ تیار کرتے ہیں اور دوسرے مال بہت کم تیار کرتے ہیں اور جب ان کے یہاں مال ہی کم تیار ہو تو وہ باہر بھی زیادہ مقدار میں نہیں بھیجا جا سکتا۔

(۳) اس زمانہ میں غیر جانبدار ملک نئے بازاروں پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر سمندری خطروں، بیمہ کی شرح میں اضافوں، ریلوں اور دوسری چیزوں کے کرایوں میں اضافہ کی وجہ سے اس مال کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

مگر اس وقت دنیا کا کوئی بڑا ملک ایسا نہیں جو جنگ میں شریک نہ ہو دریاستہائے متحدہ بلاد راست

جنگ میں شریک نہیں مگر بالواسطہ طریقہ پر اس کی ساری توجہ جنگ اور ضروریات جنگ کی طرف لگی ہوئی ہے) اب رہ گئے چھوٹے چھوٹے ملک تو ان کے یہاں نہ ایسی صنعتی ترقی ہوئی کہ وہ نئے بازاروں پر قبضہ کر سکیں اور نہ اتنے جہاز کہ دوسرے ملکوں کو سامان بھیج سکیں۔ دراصل یہ فوقیت تو یورپ کے چند چھوٹے چھوٹے ملکوں مثلاً ہالینڈ، بلجیم اور ڈنمارک وغیرہ کو حاصل تھی کہ وہ باوجود رقبے میں چھوٹے ہونے کے اور آبادی کی کمی کے بین الاقوامی تجارت میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ جنوبی امریکہ اور ایشیا کے اکثر ملک رقبے اور آبادی میں ان سے کافی بڑے ہیں لیکن ان کو یہ بات میسر نہیں۔ گویا اس طرح ہندوستان کی درآمد کو بڑا نقصان پہونچا اور باہر سے آنے والی اشیا کی مقدار گھٹ گئی اور ان کی قیمت بڑھ گئی۔

دوسری طرف خود اندرون ملک پیدا ہونے والی چیزوں کو لیجئے ان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جن کی ہمیں بھی ضرورت ہے اور وہ جنگی اغراض و مقاصد کے لئے بھی ضروری ہیں مثلاً پٹرول، تیل، روئی، دھاگہ، کپڑا، اون، کمبل، چمڑے کا سامان، لوہے اور لکڑی کا سامان، زرعی پیداوار، ربر، شکر وغیرہ اب جو کارخانے فوجی اغراض کے لئے ان کو استعمال یا تیار کر رہے ہیں انکی ضرورت اہم اور شدید ہے اور ان کے پاس ایسے خریدار بھی ہیں جو اس سامان کی قیمت بھی زیادہ دینے پر تیار ہیں۔ ایسے کارخانے خام مال کی قیمت زیادہ دے سکتے ہیں۔ یہ مزدوروں کو بھی زیادہ اجرت دیتے ہیں اور ان کا مال باوجود گرانی کے فروخت بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تمام کارخانوں سے خام مال اور مزدور ادھر آنے لگتے ہیں مگر دوسرے کارخانے بھی اپنا کاروبار جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ مجبوراً وہ بھی زیادہ قیمت اور زائد اجرت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں یعنی اس طرح عام اشیا کی لاگت بڑھ جاتی ہے لہذا ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے مگر یہ اضافہ ایسا ہے جو بادی النظر میں ہر شخص کی سمجھ میں آتا ہے لیکن عوام اور ناواقف لوگوں کو اس وقت حیرت اور تعجب ہوتا ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایسی چیزوں کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جو ان کے ملک میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں مثلاً پان یا دودھ، پھل، ترکاریاں، مچھلی، دودھ، غلے وغیرہ جو کہیں باہر نہیں جاتے، مٹی کے برتن، گھڑے، مٹکیاں، گملے وغیرہ ان چیزوں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ہندوستان کے کسی

ایک حصہ میں پیدا ہوتی ہیں اور ملک کے دوسرے حصوں میں صرف ہوتی ہیں۔ ان کی قیمت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ مزدوروں کی اجرت، اخراجات نقل و حمل اور باربرداری بڑھ جاتے ہیں۔ نئے نئے ٹیکس لگ جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا بار اشیا کی قیمتوں پر پڑ کر ان میں اضافہ کر دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ چیزیں ہیں جو بالکل مقامی طور پر بنتی ہیں اور وہیں صرف ہوتی ہیں۔ ان کی بڑی اچھی مثال مٹی کے برتن ہیں یہاں نہ تو کوئی نیا ٹیکس لگا نہ یہاں مزدوروں کی اجرت بڑھی کیونکہ یہ سب کام کمہار اور اس کا خاندان کرتا ہے اور نہ ان چیزوں کو ادھر سے ادھر منتقل کرنے میں اخراجات بڑھتے ہیں نیز ان کی بنوائی پر اتنا ہی وقت اور محنت صرف ہوتی ہے جتنی کہ پہلے ہوتی تھی پھر ان کی قیمت میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں روپیہ کی قدر گھٹ جاتی ہے یعنی جو چیز پہلے ایک روپیہ میں خریدی جا سکتی تھی اب اس کے دو روپے دینا پڑتے ہیں بالفاظ دیگر روپیہ آٹھ آنے کی برابر ہو گیا ہے لیکن غریب کمہار ان نکتوں سے ناواقف ہے البتہ وہ یہ جانتا ہے کہ پہلے وہ دس گھڑے روز بناتا تھا اور ان کو ایک آنہ فی گھڑے کے حساب سے فروخت کر کے دس آنے روز کما لیتا تھا اور ان دس آنوں میں وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھی بھر لیتا تھا اور کچھ آنے بچا بھی لیتا تھا جو اس کے کپڑے لتوں میلے تہواروں اور تقریبوں پر کام آتے تھے۔ اب بھی وہ دس گھڑے بناتا ہے اور ان کو دس آنے میں بیچتا ہے مگر اب اس رقم کو جب وہ اپنی ضرورتوں پر صرف کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ بچت تو درکنار اس کے روزمرہ کے اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے گھڑوں کی تعداد بڑھا دے تاکہ اس کو اتنی رقم ملنے لگے کہ اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں مگر ایک تو یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ وہ روزانہ بیس گھڑے بنا لیا کرے۔ دوسرے اس کو اتنے خریدار بھی نہیں ملتے جو یہ گھڑے خرید لیا کریں، تیسرے طبعاً ہر انسان آرام پسند ہوتا ہے یعنی وہ کم کام کر کے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا آسان نسخہ یہی ہے کہ وہ اپنے گھڑوں کی قیمت میں اضافہ کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے اور جیسے جیسے عام چیزوں کی قیمت بڑھتی جاتی ہے ویسے ہی گھڑوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس تجزیہ پر غور کرنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کیوں ان چیزوں

کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے جن کو جنگ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

گرانی کا دوسرا سبب اضافہ اجرت ہے یعنی جب جنگ کے زمانہ میں چیزوں کی قیمتیں بڑھنے لگتی ہیں تو مزدوروں کو نقصان پہونچنے لگتا ہے۔ ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے اور ان کی پہلی اجرتوں سے ان کی ساری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں لہذا وہ اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ابتدا میں ان کو یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ابھی چیزوں کی قیمتوں میں اتنا اضافہ نہیں ہوا کہ اجرت بڑھائی جائے۔ مگر جب مطالبات شدید ہوتے جاتے ہیں اور ہڑتالوں اور در بندیوں کی نوبت آنے لگتی ہے تو اجرتوں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح لاگت بڑھ کر چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دیتی ہے

گرانی کا تیسرا سبب حقیقی دولت کی پیدائش میں کمی کا ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں سارے ملک کی توجہ سامان حرب یا جنگی اغراض کے لئے ضروری سامان تیار کرنے کی طرف رہتی ہے۔ کپڑے، لوہے، فولاد، چمڑے کے وہ کارخانے جو پہلے ملک کی عام ضرورتوں کے لئے چیزیں تیار کرتے تھے اب جنگی اغراض کے لئے سامان بناتے ہیں یا ان کی تیار کردہ چیزوں کی بڑی تعداد جنگی اغراض کے لئے خریدی جاتی ہے۔ اس وجہ سے ملک میں ضرورت کی عام چیزوں کی مقدار گھٹ جاتی ہے اور مقدار کی کمی باقی ماندہ اشیا کی قیمت بڑھا دیتی ہے۔ اب اس زمانہ میں چونکہ نفع کافی ہوتا ہے اس لئے نئے نئے کاروبار کھلنے کی توقع کی جا سکتی ہے مگر جنگ کے زمانہ میں عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ خام مال کی قیمت کی زیادتی، اجرتوں میں اضافہ، شرح سود کی زیادتی، مقدار زر کی کمی اور سب سے بڑھ کر خریداروں کی کمی کی وجہ سے نئے کاروبار چلا کر نفع حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اور ہر معاشرہ میں ایسے اولوالعزم اور بلند حوصلہ آدمی کم ہوتے ہیں جو غیر معمولی خطرات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کا مقصد جنگی اغراض کو پورا کرنا ہوتا ہے کیونکہ اسی شعبہ میں ان کو ہر طرح کی سہولتیں میسر آ جاتی ہیں اس وجہ سے نئے کاروبار کھلنے کے باوجود اس کمی کی تلافی کو پورا نہیں کیا جا سکتا جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

گرانی کا چوتھا سبب تجارت خارجہ میں تخفیف ہے یہ ایک تو اس طرح ہوتا ہے جس کا ذکر

ابتدا میں کیا جا چکا ہے لیکن دوسری طرف اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ہمارے حلیف یا غیر جانبدار ملک باوجود خطروں، بیموں اور کرایوں کی شرحوں میں اضافہ کے زیادہ سے زیادہ مال درآمد کرنے کو تیار رہیں تو خود ہمارے پاس بھی اس قیمت کا مال یا خدمات ہونا چاہئیں جتنی قیمت کا مال باہر سے منگوایا جا رہا ہے، تجارت خارجہ کا یہی اصول ہے کہ وہ زر یا سکوں کی بدولت نہیں چلتی بلکہ ہر ملک اسی قدر مال درآمد کر سکتا ہے جتنا کہ وہ برآمد کرنے کے لئے تیار ہو یعنی اصولاً ہر ملک اپنی زائد اشیاء یا خدمات کو ہی برآمد کرتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں جب ملک کی حقیقی دولت کی پیدائش ہی گھٹ جائے تو اس کے پاس زائد اشیا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہیں خدمات یا ہندوستان جیسے زرعی ملکوں میں زرعی پیداواریں تو ان کا رخ بدل جاتا ہے مثلاً وہ لوگ جو جنگ سے پہلے حملہ کرنے والے ملکوں میں بینکاری یا بیمہ یا دوسرے کام کرتے تھے اب ان خدمتوں سے الگ ہو جاتے ہیں اور خود ملک میں ان کی خدمات منتقل ہو جاتی ہیں۔ اب رہیں زرعی پیداواریں تو وہ پہلے ان ملکوں کو برآمد کی جاتی تھیں جہاں سے ہم کو اپنی ضرورت کے مطابق مختلف سامان کی ضرورت ہوتی تھی لیکن اب وہ حلیف ملکوں کو جاتی ہیں۔ پھر بعض وقت حلیف ملک ان کی قیمت (ان کے مساوی دوسری اشیا) بھی فی الوقت ادا نہیں کرتے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ہندوستان کو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا یعنی اس طرح ہم اپنی رہی سہی زائد چیزوں کے منافع سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

گرانی کا پانچواں سبب نفع کمانے کی ناجائز خواہش ہے عموماً ہر شخص ہر وقت (اگر اس کو موقع ملے) ناجائز منافع حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ مگر جنگ کے زمانہ میں بعض امکانات اس توقع کو بڑھا دیتے ہیں اور اس وجہ سے خوب نفع ستانی ہوتی ہے۔ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کہیں جنگ نے طول کھینچ لیا تو ملک میں باہر سے آنے والی چیزوں کی مقدار گھٹ جائے گی اور ان کی قیمت بڑھ جائیگی اور اس وقت جن لوگوں کے پاس مال ہوگا ان کو خوب نفع ہوگا لہذا وہ ابھی سے اپنے ذخیروں کو محفوظ کر دیتے ہیں اور یہ ظاہر کر کے کہ ان پاس بہت تھوڑا مال ہے اس کی قیمت بڑھا دیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک طویل عرصہ تک وہ ناجائز منافع حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ایسا کرنے والے بڑے بڑے تھوک فروش تاجر

اور دو کا ندار ہوتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو ریڈیو، بحری تاروں اور ٹیلیفون کے ذریعہ دنیا کے سارے حالات کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ نیز جس طرح حکومتیں کسی آنے والی جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی پہلے سے غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں مثلاً بین الاقوامی حالات سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ کچھ عرصہ میں دو ملکوں کے تعلقات خراب ہو جانے والے ہیں لہٰذا وہ پہلے ہی سے وہاں سے کثیر تعداد میں ضروری سامان منگوا لیتے ہیں۔ اس طرح اپنے ذخیروں کی مقدار بڑھا لیتے ہیں۔ پھر ہر تھوک فروش کے پاس ایسا سامان کثیر مقدار میں ہوتا ہے جو کم قیمت پر خریدا گیا تھا مگر حالات میں تبدیلی ہوتے ہی وہ ایک دم چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً جس دن حکومت برطانیہ اور اس کی نو آبادیوں اور مقبوضوں نے جاپانی اثاثوں کو ضبط کیا اس کے دوسرے دن بمبئی میں بعض جاپانی چیزوں کی قیمت دوگنی ہو گئی۔ اس قسم کی من مانی کارروائیاں ملک پر بڑے بڑے اثرات ڈالتی ہیں اور بعض اوقات صورت بہت ہی نازک ہو جاتی ہے، جیسا کہ اس مرتبہ ہندوستان میں ہو رہا ہے اور حکومت کو کوشش کرنا پڑتی ہے کہ اس ناجائز منافع کی روک تھام کرے۔ چنانچہ اس مرتبہ جنگ شروع ہوتے ہی نگرانی نرخ اشیا کے سلسلہ میں دو ایک کل ہند کانفرنسیں ہوئیں جن میں سارے برطانوی صوبوں اور اکثر بڑی بڑی ریاستوں نے اشتراک کیا۔ بعض صوبوں میں حکومت کی جانب سے چیزوں کے نرخ مقرر کئے گئے بعض جگہ سرکاری دوکانیں قائم ہوئیں۔ ناجائز منافع حاصل کرنے والوں کو سزائیں دی گئیں۔ مگر ان عارضی بندشوں سے منافع ستانی کی حقیقی روک تھام نہ ہو سکی اور یہ شکایت اب پھر بڑھ گئی ہے چنانچہ پھر حکومت ایک کانفرنس کے انعقاد پر غور کر رہی ہے۔

گرانی دراصل ایک چکر ہے یعنی جب ایک چیز گراں ہوتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری چیزیں بھی گراں ہونے لگتی ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ گیہوں یا چاول کی ہندوستانی فوجوں یا دوسری فوجوں کے لئے باہر بھیجنے کی ضرورت ہوئی اس لئے ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ اب ملک کے وہ غریب لوگ جو پہلے گیہوں یا چاول کھاتے تھے ان کے بجائے دوسرے معمولی اور ارزاں غلے مثلاً مکا، جوار، باجرہ، راگی، کودوں وغیرہ کھانے لگے گویا اب ان چیزوں کی مانگ بڑھی اور یہ قاعدہ ہے

کہ جب کسی چیز کی مانگ بڑھتی ہے تو اس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے لہٰذا ان چیزوں کی قیمت بڑھ گئی۔ یہی اصول دوسری تمام چیزوں پر منطبق ہوتا ہے اور ہر چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور اسی کو عام گرانی کہا جاتا ہے جس کے اثرات بہت شدید اور اہم ہوتے ہیں۔

گرانی کے اثرات گرانی کے اسباب معلوم ہونے کے بعد اس کے اثرات معلوم کرنا ضروری ہیں۔ گرانی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ معین آمدنی پانے والوں کو نقصان ہونے لگتا ہے۔ اس طبقہ میں تین قسم کے آدمی شامل ہیں ایک کارخانوں کے مزدور، دوسرے متفرق مزدوری کرنے والے، اور تیسرے حکومت کے لازم، پہلا طبقہ بہت کچھ منظم ہے اس پر حکومت کی بھی کوئی بندش نہیں۔ ان کی انجمنیں اور سبھائیں بھی ہیں ان کے جلسے اور کانفرنسیں بھی ہوتی رہتی ہیں یہ شروع میں آئینی اور پرامن طریقوں پر اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ان کے مطالبے تسلیم کر لئے جاتے ہیں تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے ورنہ ہڑتالوں اور دربندیوں کی نوبت آتی ہے بالخصوص جب جنگی مقاصد کو ان سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو اور نازک حالات میں حکومت کی مداخلت ضروری ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو حکومت کو کارخانوں کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑتا ہے جیسا کہ آج کل ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اکثر مقامات پر ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں اب تک صورت حال کبھی اتنی نازک تو نہیں ہوئی لیکن پولیس کی نگرانی اور پہرہ، لاٹھی چارج، مزدوروں کی گرفتاریاں اور سزائیں اور مزدوروں کے کارخانوں اور منتظمین پر حملے اکثر ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کو تھوڑی بہت مداخلت بھی کرنا پڑتی ہے بہرحال ان متحدہ کوششوں سے ان کو فائدہ پہونچ جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ متفرق مزدوروں کا ہے نہ ان کی کوئی انجمن ہے نہ رہنما، پھر یہ مختلف پیشوں میں مصروف رہتے ہیں آئے دن ان کے آقا اور مالک بدلتے رہتے ہیں، اس لئے یہ کوئی منظم کوشش کر کے اپنی اجرت نہیں بڑھوا سکتے لیکن عام حالات کے ساتھ ساتھ بتدریج ان کی اجرتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر جب تک ان کی اجرت اس معیار پر پہونچتی ہے ان کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس گروہ کے نکمے اور کام چور آدمی اس مجبوری کی وجہ سے تنگ آکر محنت سے جی چرانے لگتے ہیں اور جائز طریقوں کے بجائے ناجائز طریقے استعمال کرنے لگتے ہیں چنانچہ چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، قتل و خون اور طبقہ واری فسادات

میں اضافہ ہونے لگتا ہے جس میں بعض وقت دوسری پریشان حال اور غیر منظم جماعتیں بھی مل جاتی ہیں۔ چنانچہ بمبئی میں حال ہی میں ایک ایسا فساد ہوا جس میں ایک طبقہ کی دوکانیں اور سامان لوٹ لیا گیا اور باقی چیزوں میں آگ لگا دی۔ یہ صورتیں ملک کے امن وامان کو خطرے میں ڈال دیتی ہیں اور حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا طبقہ سرکاری ملازموں کا ہے یہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گرانی کی وجہ سے ایک طرف اس کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے۔ دوسرے نئے نئے ٹیکسوں یا چندوں کا بار بھی اس پر پڑتا ہے۔ پھر یہ نہ تو ہڑتال کر سکتا ہے اور نہ کام چھوڑ سکتا ہے اور نہ دوسرے غیر آئینی طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ البتہ درخواستوں پر درخواست دئے جاتا ہے اور جب حکومت یقین کر لیتی ہے کہ اس کی حالت قابل رحم ہے تو وہ اس کو گرانی الاونس یا بھتّہ کے نام سے کچھ رقم دینے لگتی ہے مگر جس کی مقدار عموماً کم ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گرانی کا اثر زراعت پیشہ طبقہ پر بہت اچھا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کو اپنی پیداواروں کی قیمتیں زیادہ ملنے لگتی ہیں مگر ہندوستانی کاشتکار کو گرانی سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا کیونکہ وہ خود فروشندہ نہیں ہے بلکہ اس کے اور اصل خریدار کے بیچ میں بہت سے آدمی مثلاً مہاجن بنئے، دلال آڑھتیے اور تھوک فروش بطور درمیانی آدمیوں کے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح نفع کی بڑی تعداد ان لوگوں کی جیب میں چلی جاتی ہے اور کاشتکار کو جو تھوڑا بہت فائدہ ہوتا ہے وہ عام گرانی کی نذر ہو جاتا ہے۔

گرانی کی وجہ سے حکومتیں اپنے محکموں میں، آجر اپنے کارخانوں میں تخفیف شروع کر دیتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے لوگ اس زمانہ میں گرانی کی وجہ سے اپنے مجوزہ کاموں کو ملتوی کر دیتے ہیں اس طرح ملک میں بیروزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے مگر عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ جنگ اور اس کے متعلقہ کاموں میں آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح بہت سے تخفیف شدگان اور بیروزگاروں کو کام مل جاتا ہے اور ان لوگوں کو اجرتیں بھی زیادہ ملتی ہیں۔ مگر عام گرانی کی وجہ سے ملک کی مادی خوشحالی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ جنگ کے خاتمہ پر اس عارضی چہل پہل اور رونق کے بعد بھیانک اثرات

مرتب ہوتے ہیں۔

گرانی میں حکومت بھی متاثر ہوتی ہے جنگ کے زمانہ میں حکومتوں کو طرح طرح سے مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنگی اغراض کے لئے بڑی بڑی رقمیں قرض لینا پڑتی ہیں اور چونکہ یہ رقمیں غیر پیداآور ہوتی ہیں اس لئے ان کے اصل اور سود کا بار حکومت کو برداشت کرنا پڑتا ہے، دوسرے جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے جن چیزوں کی خریداری کی ضرورت ہوتی ہے ان کی قیمت زیادہ دینا پڑتی ہے سرکاری ملازموں کو گرانی کا الاونس دینا پڑتا ہے۔ پھر ملک سے باہر جانے والی فوجوں کی تنخواہوں میں اضافہ نئی فوجوں کی بھرتی مقتولین کے وارثوں کو انعام، ناقابل کار مجروحین کو وظیفے سپاہیوں کے لئے عمدہ قسم کی غذا اور دوسری ضرورتوں کا انتظام اور سب سے بڑھ کر اسلحہ کی تیاری کا خرچ ایسا ہے جو اچھی سے اچھی حکومت کی کمر توڑ دیتا ہے۔ ایک طرف تو اخراجات بڑھتے ہیں دوسری طرف اندرونی اور بیرونی تجارت میں کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کڑور گیری اور دوسری مدوں کی آمدنی کم ہونے لگتی ہے۔ ان کثیر اخراجات کو پورا کرنے کے تین طریقے ہیں، تعمیری اور مفاد عامہ کے کاموں میں تخفیف کردی جاتی ہے نئے نئے محصول لگائے جاتے ہیں اور سب سے اہم قرضہ لے کر اپنی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ملک کے باشندوں پر گرانی کا یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک طرف ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے، دوسری طرف نئے نئے محصولوں کا بار بڑھتا ہے تیسرے ان کو مختلف فنڈوں میں چندہ یا امداد دینا پڑتی ہے۔ اس طرح ملک کا عام معیار زندگی پست ہو جاتا ہے بہت سی تعیشات اور تفریحات کم ہو جاتی ہیں اور باوجود ظاہری گرم بازاری اور رونق کے اندر ہی اندر گھن لگتا رہتا ہے جو نہ معلوم ساری مستحکم اور مضبوط عمارت کو کس وقت منہدم کردے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ جنگ میں فتح بغیر قربانی کے حاصل نہیں ہو سکتی اور قربانی جس قدر زیادہ اور بڑی ہوگی اسی قدر فتح و نصرت قریب اور آسان ہوگی لہذا حکومت سے لے کر ایک معمولی باشندہ تک کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اسی وجہ سے گرانی کے مصائب کو ہنسی خوشی سے برداشت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

محمد احمد سبزواری ایم اے

استحصال:

استحصال کا مفہوم[1] انگریزی لفظ ایکسپلائیٹیشن (Exploitation) کے لئے استحصال کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ استحصال سے مراد دوسروں کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی ساہوکار اور کاشتکاروں کو لیجئے۔ ان کے حالات ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں۔ ساہوکار بالعموم پڑھے لکھے ہوشیار معاملہ فہم اور مالدار ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے کاشتکار بالعموم ان پڑھ اور مفلس و قلاش ہوتے ہیں۔ آئے دن انہیں قرض کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور قرض لئے بغیر چارہ نہیں لہذا ساہوکار ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ شرح سود وصول کرتے ہیں۔ سود در سود کا حساب جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ حاصل کردہ اصل کی قلیل مقدار تھوڑی ہی مدت میں بڑھتے بڑھتے سود کی اجتماع کی وجہ سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کاشتکار اس کی ادائی سے قاصر رہتے ہیں اور یہیں سے ساہوکار کے ظلم و زیادتی کی ابتدا ہوتی ہے۔ کاشتکار انتہائی محنت کے ساتھ ہل چلاتے ہیں بوتے۔ پانی دیتے فصل کی نگہبانی کرتے اور جب وہ تیار ہو جاتی ہے تو اسے کاٹتے اور غلہ صاف کرتے ہیں غلہ کو ابھی مکان میں منتقل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں کہ ساہوکار یا اس کے گماشتے آ پہونچتے ہیں کاشتکار منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور سارا غلہ ساہوکار کے گھر میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ساہوکار کو اس کی پرواہ نہیں کہ کاشتکار کے بیوی بچے بھوکوں مریں گے۔ اسے تو بس اپنے اصل اور سود کی ہی فکر ہوتی ہے۔ ساہوکار کے اس طرز عمل کو عمرانی اصطلاح میں استحصال کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کاشتکاروں کے افلاس۔ شدت احتیاج اور جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود دولتمند بنتا اور انہیں مفلسی کے عمیق غار میں دھکیل دیتا ہے۔

---

[1] استحصال کے متعلق وسکانسن یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر عمرانیات ایڈورڈ السورتھ راس نے زیادہ تحقیق کی ہے استحصال کے مفہوم اور اس کی مختلف قسموں، طریقوں اور قوانین کے متعلق راس نے اپنی کتاب اصول عمرانیات میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اس مضمون کی تیاری میں مذکورہ کتاب سے مدد لی گئی ہے۔

دیہی معیشت میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی قدر خوشحال کسان بھی غریب اور نادار مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں جب کبھی کوئی مفلس اور حاجت مند مزدور ان کے ہاں جاتا ہے اور قرض کی درخواست کرتا ہے تو کسان بہت ہی معمولی رقم قرض دے کر ان سے زیادہ مدت تک کام کرنے کا وعدہ لیتے ہیں۔ مزدور چونکہ مجبور ہوتا ہے لہذا جو بھی شرائط پیش کئے جائیں قبول کر لیتا ہے۔ سو روپیہ دے کر تین یا چار سال تک کام کرنے کا وعدہ لینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ غریب مزدور بالعموم شادیوں کے لئے قرض حاصل کرتے ہیں اور نتیجہ حسب معاہدہ تین یا چار سال تک اقل ترین معاوضہ کے ساتھ ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کسانوں کا مزدوروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا بھی استحصال پر مبنی ہے۔

استحصال کا جذبہ نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک حیوانی جذبہ ہے جو انتہائی خود غرضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب انسان استحصال پر اتر آتا ہے تو وہ دوسروں کی بھلائی یا برائی اور نفع و نقصان کا یا تو خیال ہی نہیں کرتا یا خیال کرنے کے باوجود اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ جو شخص جو جماعت یا جو قوم جس قدر زیادہ خود غرض ہوگی اس میں استحصال کا مادہ بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔ ہمدردی اور ایثار کے جذبات استحصال کے بالکل منافی ہیں۔ یہ جذبات جس قدر زیادہ کارفرما ہوں گے استحصال کی قوت اسی قدر کمتر نظر آئے گی۔

استحصال کوئی نئی چیز نہیں ظلم و زیادتی اور حق تلفی (خواہ وہ معاشی ہو سیاسی ہو یا معاشرتی) کا دوسرا نام استحصال ہے۔ استحصال کی تاریخ اسی قدر قدیم ہے جس قدر کہ بنی نوع انسان کی تاریخ۔ تہذیب و تمدن کے ابتدائی دور سے کر عصر حاضر تک ہر زمانے، ہر دور، ہر خاندان، ہر قبیلہ اور ہر قوم میں اس کی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔ فرقہ واریت، طبقہ واریت، بین الاقوامی کشمکش، پست تاجرانہ ذہنیت Commercialization اور پست پیشہ ورانہ ذہنیت Professionalization جذبہ استحصال ہی کا نتیجہ ہیں۔ فرقہ وارانہ منافرت طبقہ واری کشمکش اور بین الاقوامی لڑائیاں محض اس وجہ سے نمودار ہوتی ہیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی، اور ایک قوم دوسری قوم کی حق تلفی کرنا چاہتی ہے۔ ایک فرقہ، طبقہ یا قوم کی جانب سے حق تلفی کی کوشش اور دوسرے فرقے، طبقے یا قوم کی جانب سے تحفظ اور دفاع کی جدوجہد اور بالآخر ایک

کے غالب آنے اور دوسرے کے مغلوب ہونے سے استحصال کے مواقع نکل آتے ہیں

استحصال کی قسمیں | اگر ہم استحصال کی ماہیت پر غور کریں تو اس کا دائرہ بہت وسیع نظر آئے گا چنانچہ سہولت تفہیم کی خاطر استحصال کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔

(۱) جنسی استحصال — **Sexual Exploitation**

(۲) معاشی استحصال — **Economic Exploitation**

(۳) مذہبی استحصال — **Religeous Exploitation**

(۴) انانی استحصال — **Egotic Exploitation**

۱۔جنسی استحصال :۔ جنسی استحصال، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مقصد دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی حظ اور لطف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ذاتی عیش اور آرام کی خاطر ایک سے زائد بیویاں رکھنا، ان کے آرام و آسائش کا خیال نہ کرنا اور صرف لطف اندوزی کو اپنا مقصد قرار دینا جنسی استحصال پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ مرد کا منشا عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ لونڈیاں رکھنے کا طریقہ بھی جنسی استحصال پر مبنی ہے۔ لونڈیوں سے نہ صرف محنت شاقہ لی جاتی تھی بلکہ جنسی جذبات کی تکمیل کے لئے انہیں عارضی آلہ کار بنایا جاتا تھا۔ اگرچہ غلامی کا طریقہ بہت بڑی حد تک مسدود ہو چکا ہے تاہم اب بھی روپے اور پیسہ کا لالچ دے کر مفلس و نادار۔ لیکن شریف عورتوں کی عصمت دری کا طریقہ جاری نظر آتا ہے جو کہ استحصال کے سوا کچھ نہیں۔ قدیم زمانے میں فاتح اقوام کے پیش نظر، روپیہ پیسہ کے علاوہ خوبصورت عورتیں بھی ہوا کرتی تھیں جس کا مقصد مفتوحین کی بے بسی اور بیچارگی

لے راس نے استحصال کی جو قسمیں بیان کی ہیں اس میں شک نہیں کہ ان سے استحصال کے دائرہ عمل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم جنسی۔ مذہبی اور انانی استحصال کہنے کی بجائے معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی استحصال کہیں تو یہ تقسیم زیادہ منطقی اور اصولی ہوگی اور اس سے استحصال کی اولیت کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا جنسی۔ مذہبی اور انانی استحصال کو معاشرتی استحصال کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ سیاسی استحصال سے ایسا استحصال مراد لیا جانا چاہئے جو سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر کیا جاتا ہے۔ معاشی استحصال کا مقصد معاشی مفاد ہوتا ہے اور معاشرتی استحصال معاشرتی خود غرضی کی بنا پر ہوتا ہے

جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی جذبات کی تسکین ہوتی تھی۔ اکثر مرتبہ خراج میں نہ صرف مال و اسباب بلکہ حسین اور خوبصورت عورتیں بھی طلب کی گئی ہیں۔ بعض ایسے تاریخی واقعات بھی موجود ہیں کہ بادشاہ کے حکم سے ملک کی حسین ترین عورتوں کو محل میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ عورتوں کی مرضی کے خلاف انہیں اس طرح محل میں داخل کروالینا بھی جنسی استحصال ہی کی ایک شکل ہے

۲۔ معاشی استحصال :۔ جس طرح جنسی استحصال سے مراد دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی حظ و لطف حاصل کرنا ہے۔ اسی طرح معاشی استحصال سے مراد دوسروں کی مجبوریوں سے معاشی استفادہ کرنا ہے۔ دوسروں کو ان کی محنت کے حقیقی معاوضے سے محروم رکھنا اور اس سے خود استفادہ کرنا معاشی استحصال ہے۔ معاشی استحصال کی بہترین مثال سرمایہ داری سے ملتی ہے۔ سرمایہ دار غریبوں کی ناداری اور افلاس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کی آمدنی کا مدار غریبوں کی محنت پر ہوتا ہے۔ سرمایہ دار غریب مزدوروں کو ان کی محنت کا حقیقی معاوضہ نہیں دیتے۔ وہ جس قدر محنت کرتے ہیں انہیں اس سے کم معاوضہ ادا کرکے اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔

معاشی استحصال صرف سرمایہ داروں تک محدود نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی متعدد مثالیں ملیں گی۔ اکثر خاندانوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک کماتا ہے اور دس کھاتے ہیں دیگر اراکین خاندان محض اسلئے محنت کرنا نہیں چاہتے کہ ان کی ضروریات بہ آرام پوری ہو جاتی ہیں۔ لہذا ایسی صورت میں کہا جائے گا کہ غیر پیدا آور اراکین کماؤ رکن کا استحصال کر رہے ہیں۔

اکثر اصحاب میں خاطر مدارات کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لہذا بعض خود غرض دوست احباب ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر وقت ان کی صحبت میں رہتے ہیں اور ان کی آمدنی کا قابل قدر حصہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے خرچ کروالیتے ہیں۔

نچ طبقوں کے بعض سست اور کاہل مرد محض اپنی بیویوں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ محنت کرتی ہیں اور یہ اس کا پھل کھاتے ہیں۔ وہ مصیبت اٹھاتی ہیں اور یہ آرام سے رہتے ہیں۔

افراد اور جماعتوں کے علاوہ قومیں بھی ایک دوسرے سے استحصال کرتی ہیں۔ جنگ اور لڑائی میں

ذریعہ وہ غریبوں پر کامل تسلط جما لیتے ہیں اور ان سے ہر طرح کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دولت کے ذریعہ انھیں ذلیل وخوار کیا جاتا ہے۔ ان سے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ غریب عورتوں کی عصمت دری کی جاتی ہے اور ہر طرح کی معاشی سیاسی اور معاشرتی زیادتی روا رکھی جاتی ہے۔ غریب کمزور اور بے زبان ہوتے ہیں امیروں کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور مجبوراً ان کے پنجے میں پھنس جاتے ہیں

(۴) اقلیت کا استحصال اکثریت کے ذریعہ۔ چونکہ اکثریت کی قوت زیادہ ہوتی ہے لہذا وہ اقلیت پر حاوی رہتی ہے اور اس سے استحصال کرتی ہے۔ ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ نہایت شدید ہے۔ یہاں کی اقلیتیں اکثریت سے بدگمان ہیں۔ ان کا خیال ہے اگر حکومت اکثریت کے ہاتھ میں چلی جائے تو وہ ان کی حق تلفی کرے گی اور ہر طرح کے استحصال کو روا رکھے گی۔ لہذا وہ قبل از وقت اپنے حقوق کی حفاظت چاہتی ہیں۔

(۵) محنت پسندوں کا استحصال غیر محنت پسندوں کے ذریعہ۔ فقیروں کی قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی نظر آتی ہے جو تنومند، قوی ہیکل اور کام کرنے کے قابل ہوتی ہے لیکن محض اس وجہ سے محنت کرنا پسند نہیں کرتی کہ محنتی اور جفاکش لوگ اپنی کمائی کا ایک جزو اسے بطور خیرات دیدیتے ہیں۔ فقیروں کا یہ طرز عمل استحصال ہی کی ایک نوعیت ہے۔ مشترک خاندانوں میں بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ غیر محنت پسند افراد محنت پسندوں کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں کام تو کرسکتے ہیں لیکن کام کرنا اس لئے نہیں پسند کرتے کہ ان کی ضروریات بہ آرام پوری ہوجاتی ہیں

(۶) نادانوں کا استحصال ہوشیاروں کے ذریعہ۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ نادان اور غیر تعلیم یافتہ افراد ہوشیار اور تعلیم یافتہ افراد کے پنجے میں بہ آسانی آسکتے ہیں۔ ہندوستانی کسانوں کو محض اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے بیسیوں جگہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ دیہات میں پٹیل پٹواری اور ساہوکار۔ منڈی میں دلال اور دفاتر میں منشی۔ محرر اور وکیل ان سے استحصال کرتے ہیں۔ کسان انتہائی محنت سے غلہ پیدا کر لیکن جہالت اور لاعلمی کی بنا پر حقیقی معاوضہ سے محروم رہتے ہیں۔ زندگی کے کسی شعبہ کو لیجئے ہر جگہ ہوشیار چالاک افراد نادان اور سیدھے سادے افراد سے استحصال کرتے ہوئے دکھائی دیں گے

(۷) غیر منظم افراد کا استحصال منظم افراد کے ذریعہ:۔ تنظیم قوت اور طاقت کا ایک نہایت اہم عنصر ہے۔ جو جس قدر زیادہ منظم ہوگا وہ اسی آسانی کے ساتھ غیر منظم افراد پر اقتدار اور تسلط حاصل کر سکے گا۔ تسلط اور اقتدار کے ساتھ ہی استحصال کے مواقع نکل آتے ہیں۔

(۸) مریدوں کا استحصال مرشدوں کے ذریعہ:۔ مرید اپنے مرشدوں کے بہت معتقد ہوتے ہیں۔ ان کی ہر بات کو صحیح سمجھتے اور ان کا کہا ماننا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں لہٰذا مرشد، پادری اور برہمن اپنے عقیدت مندوں کی اس خصوصیت سے ناجائز طریق پر مالی اور دیگر قسم کا فائدہ حاصل کرتے ہیں جو استحصال ہی کی ایک قسم ہے

(۹) مفتوحین کا استحصال فاتحین کے ذریعہ:۔ جنگ اور لڑائی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ جماعتوں یا اقوام سے استفادہ کیا جائے۔ ہر زمانے میں مختلف اقوام سے اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کو روا رکھا ہے۔ فاتح اقوام کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مفتوح اقوام پر ظلم و زیادتی کو ظلم و زیادتی ہی نہیں سمجھتیں۔ چونکہ مفتوحین بے بس اور کمزور ہوتے ہیں اس لئے فاتحین کو ہر طرح کی آزادی اور استحصال کا موقع حاصل رہتا ہے۔

(۱۰) محکوموں سے استحصال حاکموں کے ذریعہ:۔ قوت و اقتدار کے ذریعہ ہر ناجائز چیز بھی روا رکھی جاتی ہے۔ محکوم اپنے حاکم کا حکم ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور اس طرح حاکمین کے لئے ظلم و زیادتی۔ حق تلفی اور استحصال کے کافی مواقع نکل آتے ہیں۔

استحصال کے قوانین: طبیعت یا فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے استحصال کی طرف زیادہ یا کم رجحان ہوتا ہے۔ مثلاً (الف) جو افراد طبعاً سست، کاہل اور تن آسان ہوتے ہیں ان میں استحصال کرنے کا مادہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف استحصال کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بلکہ وہ استحصال کرنے میں نہایت مستقل مزاج ہوتے ہیں اور اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ (ب) اسی طرح جن افراد میں ہمدردی اور ایثار کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ یا تو استحصال سے قطعی پرہیز کریں گے یا بہت کم اس کی طرف مائل ہوں گے (ج) جو افراد جس قدر زیادہ خود غرض ہونگے وہ استحصال کی طرف اسی قدر زیادہ مائل ہوں گے۔ (د) جن افراد میں ظلم و زیادتی کرنے کی بجائے ظلم و زیادتی سہنے کا مادہ جس قدر زیادہ ہوگا اسی لحاظ سے وہ دوسروں کے ذریعہ استحصال روا رکھیں گے۔

(۲) شعورِ ہم جنسیت استحصال کی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ ہے۔ شعورِ ہم جنسیت سے مراد وہ احساس ہے جس کی بنا پر ہم دوسرے افراد کو اپنا ہم رتبہ اور ہم جنس سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے ساتھ ایک طرح کی ہمدردی بھی رکھتے ہیں۔ جن افراد میں شعورِ ہم جنسیت پایا جاتا ہے وہ ایک دوسرے سے مقابلتاً محدود پیمانے پر استحصال کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن افراد میں شعورِ ہم جنسیت نہیں پایا جاتا وہ ایک دوسرے سے وسیع پیمانے پر استحصال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ہم جنس افراد کے مابین غیر ہم جنس افراد کے مقابل محدود پیمانے پر استحصال ہوتا ہے۔

(۳) استحصال کی بدولت ہم جنس اور ہم شعور جماعتوں اور گروہوں کی جداجدا تشکیل عمل میں آتی ہے۔ جن جماعتوں یا گروہوں کے مفادات ایک ہوتے ہیں وہ آپس میں متفق اور متحد ہو جاتے ہیں تاکہ دوسری جماعتوں یا گروہوں سے استحصال کریں یا انہیں اپنا استحصال کرنے سے روکیں۔ آجروں یا مزدوروں کی انجمنوں کا قیام استحصال یا استحصال سے بچنے کی خاطر عمل میں آتا ہے۔ مزدور جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ آجران سے استحصال کر رہے ہیں تو وہ اپنی انجمن قائم کر لیتے ہیں تاکہ مدافعت کی جا سکے۔ جب آجر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اتحاد کی وجہ سے مزدوروں کی قوت بڑھ گئی ہے تو وہ بھی اپنے استحکام کی خاطر علیحدہ علیحدہ انجمن قائم کرتے ہیں تاکہ متفقہ طور پر مزدوروں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

(۴) استحصال اور قوت استحصال لازم و ملزوم ہیں یعنی یہ کہ جب تک کسی فرد، جماعت یا قوم میں استحصال کی قوت باقی رہتی ہے اس وقت تک استحصال کو برابر روا رکھا جاتا ہے لیکن جب یہ قوت زائل ہو جاتی ہے تو وہ استحصال سے دست بردار ہونے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب قوت اقتدار جاتا رہتا ہے تو انسان ظلم و زیادتی کو چھوڑ کر عجز و انکساری اور محبت و ملنساری کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ استحصال کے لئے استحصال کے موقعوں کا ہونا ضروری ہے۔ جب مواقع حاصل ہوں تو استحصال کنندگان اپنے فعل سے کبھی نہیں چوکتے۔ جن افراد یا جماعتوں کا وہ استحصال کرتے ہیں ان کی زبوں حالی، آفت اور مصیبت سے پورے طور پر واقف ہوتے ہیں لہٰذا ہمدردی بھی جتلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود استحصال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

(۵) بیرونی تسلط اندرونی اور مقامی استحصال کے منافی ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی ملک پر دوسری قوم کا قبضہ اور تسلط ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اندرونی اور مقامی استحصال کم ہو

والے اداروں کے مواقع مارے جاتے ہیں۔ بیرونی قوت اندرونی اور مقامی استحصال کرنے والی مختلف اکائیوں کو یا تو ختم کر دیتی ہے یا کلیتہً اپنے زیر اقتدار لے لیتی ہے۔

(۶) استحصال کی راہ میں جو افراد یا جماعتیں رکاوٹ ڈالتی ہیں اگر انہیں بھی اپنا شریک کار بنا لیا جائے تو پھر استحصال علیٰ حالہ جاری رہ سکتا ہے۔ فرض کیجئے ایک قوم دوسری قوم سے استحصال کر رہی ہے۔ اب اگر تیسری قوم مداخلت کرے اور اول الذکر کو استحصال سے روکنے کی کوشش کرے تو اس کا بہترین حل یہی ہوتا ہے کہ مخل ہونے والی قوم کو بھی شریک استحصال بنا لیا جائے۔ خاندانی زندگی سے قومی زندگی تک مختلف اداروں کے مابین اس قانون کا عمل درآمد عام نظر آئے گا۔

(۷) بیّن استحصال (Open Exploitation) کے مقابل مخفی استحصال aaked Exploitation زیادہ دیرپا اور خطرناک ہوتا ہے مخفی استحصال سے مراد ایسا استحصال ہے جس کے حقیقی مضر اثرات پورے طور پر واضح نہ ہوں۔ یہ استحصال بظاہر شدید نہیں معلوم ہوتا لیکن اس کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں مکر و فریب کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ برعکس اس کے بیّن استحصال سے مراد ایسا استحصال ہے جو علانیہ طور پر کیا جائے اور جس کے اثرات پورے طور پر واضح ہوں مثلاً بچہ سقہ کا چند روزہ راج بیّن استحصال پر مبنی تھا۔ نادر شاہ کی لوٹ اور غارت گری بھی بین استحصال ہی پر مبنی تھی۔ برعکس اس کے منجمد ریاسے جاپانیوں کا ناجائز استفادہ مخفی استحصال پر مبنی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر محکوم قوموں کی حقیقی صنعتی اور تجارتی ترقی کو روکنا اور مختلف معاہدات کے ذریعہ اپنی مصنوعات اور دیگر قسم کی پیداواروں کے لئے وہاں پر وسیع بازارات فراہم کرنا یا اپنے ممالک کے باشندوں کو قابل لحاظ تعداد میں غیر ضروری طور پر محض ان کی پرورش کی خاطر محکوم ممالک میں ملازم رکھنا۔ یا محکوم ممالک کے باشندوں کو عام اور فنی و حرفتی تعلیم سے محض اس وجہ سے محروم رکھنا کہ جاہل اور ان پڑھ محکومین سے بہت آسانی کے ساتھ استحصال کیا جا سکتا ہے ، مخفی استحصال کی مثالیں ہیں۔ کیونکہ اس تمام جد و جہد کا مقصد محکوم قوم سے مخفی طریق پر استحصال کرنا ہوتا ہے۔ استحصال کے یہ طریقے اس لئے زیادہ دیرپا ہوتے ہیں کہ ان کے مضر اثرات سے عوام پورے طور پر واقف نہیں ہوتے۔ ان طریقوں سے بیّن استحصال کے مقابل زیادہ استحصال ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود استحصال

کی شدت ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ مخفی استحصال کے لئے انگریزی میں ہاسکلڈ کیپلائیٹیشن کے جو الفاظ استعمال کیئے گئے ہیں وہ نہایت ہی موزوں اور مناسب ہیں۔

(۸) معاشرتی حالات جوں جوں پیچ در پیچ ہوتے جائیں گے اور جوں جوں ہماری زندگی کا انحصار ایک دوسرے پر بڑھتا جائے گا تو مخفی استحصال کے مواقع زیادہ نکلتے جائیں گے۔ مثلاً ابتداً باہمی جھگڑوں اور مناقشا کے تصفیوں کے لئے پنچایت کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا اور اس میں استحصال کے زیادہ مواقع نہ تھے لیکن جب عدالتیں قائم ہوئیں بڑے بڑے عملے کام کرنے لگے منشی محرر، وکیل اور بیرسٹر نمودار ہوئے اور معمولی سے جھگڑے کا فیصلہ مدتوں میں ہونے لگا تو ساتھ ہی ساتھ استحصال کے موقعوں میں بھی بہت زیادتی ہو گئی۔ غرض مندوں کی شدت احتیاج سے فائدہ اٹھانے، رشوت لینے اور طرح طرح کے ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لئے بیسیوں مواقع نکل آے۔ اگر طرز معاشرت سیدھا سادا ہوتا تو یہ سب مواقع دستیاب نہ ہوتے۔ ایک وہ زمانہ گذرا ہے جبکہ لوگ اپنی غذا آپ تیار کر لیتے تھے لیکن تقسیم عمل کی وجہ سے جب ہوٹلوں کا طریقہ مروج ہوا اور ان کی کثرت ہوئی تو پست تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے مالکان ہوٹل کے لئے استحصال کے مواقع نکل آئے۔ خالص گھی کے بجائے چربی استعمال کرنا۔ تازہ گوشت کی بجائے باسی گوشت استعمال کرنا۔ زعفران کی بجائے رنگ دینا۔ باسی اور بدبودار سالنوں کو دوبارہ گرم کر کے مرچ مسالے دینا اور پھر تازہ سالنوں کی طرح فروخت کرنا۔ چائے میں افیون کا خفیف جزو شامل کرنا تاکہ گاہک مخصوص چائے کے عادی ہو جائیں اور صرف انھیں کے چائے خانے میں آئیں تاکہ ان کے لئے زیادہ منافع کمانے کے مواقع مہیا ہو سکیں۔ یہ سب باتیں اسی لئے ممکن ہوئیں کہ ہماری اجتماعی زندگی زیادہ پیچ در پیچ ہو چکی ہے اور ہوتی جا رہی ہے تقسیم عمل کے طریق کو ہماری معاشرت میں زیادہ سے زیادہ دخل ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ ہماری معاشرت کا ناگزیر عنصر بن گیا ہے موجودہ زمانے میں اس طریق کے وسیع ترین استعمال کی بدولت ہماری معاشرت خاندانی قبیلہ داری اور قومی مدارج سے گذرتے ہوئے بین الاقوامی رتبہ حاصل کر چکی ہے۔ اب نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کا ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا یا ایک فرقہ و طبقہ دوسرے فرقے و طبقے کا

محتاج نظر آتا ہے بلکہ ایک قوم دوسری قوم کی اسی طرح محتاج ہے جس طرح معاشرہ کا ایک رکن دوسرے رکن کی امداد کا محتاج ہوتا ہے تقسیم عمل کی درجہ بدرجہ ترقی کے ساتھ ساتھ استحصال کے دائرے بھی وسیع تر ہوتے گئے حتیٰ کہ شخصی استحصال خاندانی استحصال میں۔ خاندانی استحصال قبیلہ واری استحصال میں اور قبیلہ واری استحصال قومی استحصال میں تبدیل ہو چکا ہے۔ موجودہ جنگ محض استحصال کی جنگ ہے۔ ایک قوم دوسری قوم سے استحصال کرنا چاہتی ہے لیکن دوسری قوم دفاعی تدابیر اختیار کرتی ہے نتیجہ جنگ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری عام نظر آتی ہے۔ استحصال کے یہ تمام مواقع معاشرتی زندگی کی پیچ در پیچ صورت حال کا نتیجہ ہیں۔ بالخصوص محنتی استحصال کو موجودہ نظام معاشرت سے بہت تقویت پہونچی ہے۔

(۱۰) استحصال کو کلیتہً مٹایا نہیں جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت تخریبی جذبہ ہے اور اس کی بدولت بحیثیت مجموعی عام خوش حالی متاثر ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم قطعی معنی میں اس کی بیخ کنی کرنا چاہیں تو بہ حالات حاضرہ یہ چیز نا ممکن ہے۔ کیونکہ جب تک انسان میں ذاتی مفاد، خود غرضی، جلب منفعت اور مشخت کے جذبات موجود ہیں یا جس وقت تک بڑائی اور چھوٹائی، امیری اور غریبی، قوی اور کمزور، زبردست اور زیردست، فاتح اور مفتوح اور حاکم و محکوم کے مدارج اور مراتب موجود ہیں اس وقت تک استحصال بھی باقی رہے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف تدابیر کے ذریعہ ہم استحصال کے حدود کو کم سے کم کر سکتے ہیں۔

قوتوں کا توازن استحصال کا بہترین سدِ باب ہے۔ اگر ہم استحصال کو زیادہ سے زیادہ محدود کرنا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم معاشی، معاشرتی اور سیاسی قوتوں کو متوازن کرنے کی کوشش کریں اور یہی استحصال کا موزوں ترین حل ہے۔ یہ سوال کہ مختلف قوتوں میں کیونکر توازن قائم کیا جا سکتا اور اس کے بعد کس طرح استحصال میں کمی ہو سکتی ہے نہایت وسیع ہے لہذا ہم استحصال کی ماہیت، اس کی مختلف قسموں، طریقوں اور قوانین کے تذکرے پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

محمد ناصر علی ایم۔ اے (عثمانیہ)

ربط کے نصب العین کا ارتقا

تعلیم اخلاق نشو و نما کے ساتھ ساتھ ایک خالص ساجی عمل بھی ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں اگر نئی تعلیم کا سب سے پہلا پیغمبر بھی وہی شخص ہو جو ایک گمراہ سماج اور بھٹکی ہوئی سیاست کو راستہ دکھانے اور سنوارنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں زمانے کے رخساروں سے کچھ حجاب اٹھاتا ہوں۔ لیجئے میں آپ کو آج سے ایک سو تیئیس سال پہلے کے جنیوا میں لے آیا۔ یہاں ایک گھڑی ساز رہتا ہے۔ اس کا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام ژان ژاک روسو ہے۔ دونوں باپ بیٹے رات بھر کتابیں پڑھنے میں گذار دیتے ہیں۔ روسو آوارہ فطرت واقع ہوا ہے۔ اسے جنگل کی تفریح اور پاپیادہ سفر کرنے کا عشق ہے۔ روسو پیٹ پالنے کے لئے ایک سرکاری وکیل کا محرر بنتا ہے۔ پیرس میں موسیقی کی تحریریں بیچتا ہے۔ وینس کے فرانسیسی سفیر کا سکرٹری بنتا ہے اور پھر ادیب بن جاتا ہے اور ایسا ادیب جس نے ایک پوری قوم اور اس کے ذریعے ایک پورے نظام تمدن و سیاست کا نوشتۂ عمل بدل دیا۔ روسو خود چوری کر کے ایک بے قصور لڑکی کو مجرم ثابت کر سکتا ہے وہ اپنا مذہب بدل کر ایک مالدار عورت سے صرف ضرورتاً عشق بھی کر سکتا ہے اور خود اپنے بچوں کو اپنی زندگی میں یتیم خانہ بھیج سکتا ہے لیکن یہی شخص اور یہی روسو ایک وقت سماج اور سیاست کو دعوت انقلاب دینے کے لئے ایک ہاتھ میں "معاہدۂ عمرانی" کے نام سے ایک نئی توریت اور دوسرے ہاتھ میں "ایمیل" کے عنوان سے ایک نئی تعلیمی انجیل لئے ہوئے زمانے کے سامنے آتا ہے۔ اس کی توریت کا پہلا جملہ ہے "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے" اور اس کی انجیل کی پہلی آیت کچھ یوں ہے "ہر چیز جو صانع قدرت کے ہاتھ سے آتی ہے اچھی ہوتی ہے لیکن ہر وہ چیز جو انسان کے ہاتھ میں پڑتی ہے خراب ہو جاتی ہے"

اب تک کوئی پیغمبر اپنے ساتھ بیک وقت دو الہامی کتابیں لے کر نہیں آیا تھا۔ کچھ یونہی سمجھ لیجئے کہ لوگ روسو کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کی ایمیل کو آگ میں جھونکا اور اسے خود گرفتاری سے بچنے کیلئے

فرانس سے سوئٹزرلینڈ بھاگنا پڑا لیکن ایمیل سوئٹزرلینڈ میں بھی معاہدۂ عمرانی کے ساتھ ساتھ ممنوع قرار دیدی گئی لیکن روح کی پکار نہ قانون دبا سکتا ہے اور نہ اس کا صحیفہ آگ میں جل کر فنا ہو سکتا ہے۔ ایمیل کو نذر آتش کر دیا گیا تھا لیکن ایمیل آج ہمارے پاس ہے۔ بالکل وہی جو روسو نے لکھی تھی۔

ایمیل ایک بچہ ہے روسو نے اسی عنوان سے بچپن سے لے کر بیس سال کی عمر تک اس کی تعلیم و تربیت کا حال ایک کہانی کی شکل میں لکھا ہے۔ فی الحقیقت ایمیل بچوں کا قرآن ہے۔ روسو سے پہلے بچے کو ایک چھوٹا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے اس پر ہر وہ بات جبر کی جاتی تھی جو بڑوں کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی تھی۔ روسو نے سب سے پہلے بچہ کی انفرادیت کو تسلیم کر کے اس کی زندگی، اس کی دلچسپیوں اور اس کے رجحانات پر زور دیا بالفاظ دیگر تعلیم کا خارجی اور مصنوعی عمل روسو کے ہاتھوں زندگی کا فعل اور فطرت کا عمل بنا۔ روسو نے سب سے پہلے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم فطری قوتوں کی ترقی کا نام ہے نہ کہ علم و فن کے حصول کا۔ روسو نے (۱) انسان (۲) اشیا (۳) فطرت ۔ ان تین چیزوں کو تعلیم کا سرچشمہ مانا ہے۔ فطرت سے بیشتر انسانی قوٰی کا اندرونی نشوونما، جبلتیں، صلاحیتیں اور رجحانات مراد ہیں۔ اشیا، حواس کے ذریعہ اس نشوونما میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں اور انسان، انسان کو زندگی کے تجربے سکھانے کا آلہ ہے۔

روسو تعلیم میں تصنع کا کس حد تک مخالف ہے اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ بچوں کے ہاتھ میں چاندی سونے کے جھنجھنے دیکھنے کے بجائے وہ کسی پیڑ کی ایسی شاخ دیکھنا چاہتا ہے جس میں گھنگروؤں کے بجائے سوکھے ہوئے بیج بجتے ہوں۔ روسو کے قول کے مطابق پانچ سے بارہ سال تک کی عمر کا زمانہ زندگی کا سب سے نازک زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں حواس کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے، "جو کچھ انسان کے ذہن میں داخل ہوتا ہے وہ حواس کے ذریعہ داخل ہوتا ہے۔ عقل و خرد کا پہلا روپ حواس کا روپ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے جن استادوں سے فلسفہ کا سبق ملتا ہے وہ ہمارے پاؤں ہیں، ہمارے ہاتھ ہیں اور ہماری آنکھیں ہیں" اس سے آگے کی منزل میں روسو ایک حرفے کی تعلیم بھی تجویز کرتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ روسو کا عام اصول بذریعہ تجربہ ہے "کوئی بات بچے کو اس لئے نہ جاننے دو کہ تم نے اسے بتائی ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے اسے خود سمجھا ہے۔ اسے سائنس سیکھنا نہیں ہے۔ اسے

سائنس تحقیق کرنا ہے......میں کتابوں سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ وہ ہمیں ایسی چیزوں کے متعلق بات چیت کرنا سکھا دیتی ہیں جن سے فی الحقیقت ہم واقف نہیں ہیں۔"

روسو ذہن و حواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسم سے بھی غافل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جسمانی کمزوری تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ "بچہ جتنا کمزور ہوگا اسی قدر دوسروں پر حکومت کا خواہشمند ہوگا اور جتنا مضبوط ہوگا اسی قدر فرمانبردار ہوگا۔ تمام نفسانی خواہشات کمزور جسم کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور تمام خرابیاں کمزوری کے باعث وجود میں آتی ہیں۔" روسو نے جسمانی تربیت کے لئے ورزشیں تجویز کی ہیں۔ لیکن یہ ورزشیں عموماً وہی ہیں جو کبھی اہل اسپارٹا نے وضع کی تھیں اور جنھیں فلاطون نے بھی اپنی ریاست کے فلسفیوں کے لئے قابل قبول سمجھا تھا۔

ایمیل سے جو مختصر اور ضروری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہو جانا چاہیئے کہ روسو بچوں والوں پر بچوں کو اور الفاظ پر عمل کو قابل ترجیح سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک ذہن کے ساتھ ساتھ حواس اور جسم کی تربیت بھی اتنی ہی اہم تھی۔ یہ ضرور ہے کہ روسو نے کوئی طریقہ ایسا تجویز نہیں کیا جس سے ایک ہی چیز ذہن، حواس اور جسم تینوں کی ہم آہنگ تربیت اور نشوونما کا ذریعہ بن سکے۔ اس نے حرفے کی تعلیم بھی تجویز کی ہے لیکن حرفے سے کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا اس کا مقصد نہیں تھا۔ اس نے ایمیل کو حرفہ اس لئے سکھایا تھا کہ وہ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ذلیل نہ سمجھے۔ لیکن باوجود اس کے اس کی پیغمبرانہ اور مجتہدانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس نے فضا میں ایک آواز پیدا تو کی اور اس کی بدولت ہم نے۔

جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے!

ابھی میں نے عرض کیا کہ روسو کا سب سے بڑا کام یہی تھا کہ اس نے فضا میں ایک آواز تو پیدا کی۔ اب اگر آواز میں خلوص و صداقت ہے تو اس آواز کو نئی قوتیں دے کر اسے پھیلانے والے بھی پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ گو خود روسو کے وطن میں روسو کی آواز نہ سنے جانے کے برابر سنی گئی اور انگلستان میں بھی عقیدتمندوں کی کثرت کے باوجود کوئی صحیح نتیجہ مرتب نہ ہو سکا لیکن جرمنی میں روسو کے نئے تعلیمی اصولوں کو جامہ پہنانے کی کوشش ضرور کی گئی۔ بیڈو نے (۱۷۲۳ء تا ۱۷۹۰ء) جہاں روسو سے متاثر ہو کر صحیح مذہب اور

صحیح اخلاق کے لئے جہاد کیا وہاں اس نے تعلیمی اصلاح کو بھی اپنا فرض سمجھا۔ بیسڈو نے نہ صرف تعلیمی معاملات میں اختیار رکھنے والے لوگوں اور اُن باپوں کے لئے بچوں کی تعلیم سے متعلق پوری چار جلدیں لکھ ڈالیں، بلکہ اس نے تعلیم بذریعہ عمل کے اصول پر بچوں کو مادری زبان اور لاطینی پڑھا کر تجربہ بھی کیا اور پہلی مرتبہ ثابت کیا کہ اس طریقہ سے بچے کم وقت میں اور بغیر گرانی محسوس کئے ضروری تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ بیسڈو نے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے بچوں کا ادب پیدا کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر روسو نے اصول کی بنیاد ڈالی تھی تو بیسڈو نے اسی اصول کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ بیسڈو کی کوشش کہاں تک کامیاب تھی اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ ۱۷۷۴ء میں جرمنی میں ایک مدرسہ فلن تھروپی نم کے نام سے کھلا اور اس کی مثال میں اور بہت سے مدرسے بھی کھلے۔ ان تمام مدرسوں کا نصب العین اصلاحی تھا۔ ان مدرسوں میں بچوں کو بچہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ زبان کی تعلیم قواعد کے ذریعہ سے نہیں بلکہ بول چال کے طور پر دی جاتی تھی ساتھ ہی ساتھ جسمانی تربیت کی اہمیت بھی تسلیم کی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم میں جسمانی فعالی کے ساتھ تال سُر کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ حرفہ بھی تعلیمی اور سماجی اغراض کی بنا پر شریک تعلیم تھا۔ تصویروں اور چیزوں کے ذریعے اسباق پر زور دیا جاتا تھا اور مدرسہ اور مدرسہ کی چہار دیواری سے باہر کی زندگی میں ربط اور تطبیق کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ ایک بڑی تصویر کا پہلا خاکہ ہی تھا۔ ابھی رنگ کاری سے پہلے اصلی خطوط ہی کو زیادہ نمایاں اور روشن کرنے کی ضرورت تھی یہ کام سوستان کے ایک مصلح پستالوزی (۱۷۴۶ء تا ۱۸۲۷ء) کے ہاتھوں ہونا تھا۔ پستالوزی کی ساری اہمیت یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری عمر اور اپنی ساری قوتیں تعلیم کے تجربے پر صرف کیں۔ اس نے بننا تو چاہا تھا پادری، وکیل، کسان اور نہ جانے کیا کیا لیکن قدرت کو اسے مدرس بنانا مقصود تھا۔ اس نے خود اپنے بچہ کا مطالعہ کیا اور اس پر تعلیمی تجربے کئے۔ اس کے بعد غریبوں اور مفلسوں کے بچوں کے لئے ایک صنعتی مدرسہ چلایا۔ اس مدرسہ میں زراعت اور کاتنے بننے کی قسم کے کام سکھائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی جاری رہتا تھا لیکن اس مدرسے میں دستکاری ذریعہ تعلیم نہ تھی اگر ایسا ہوتا تو ہمارا مقصد پستالوزی کے ہاتھوں ہی پورا ہو جاتا۔ اس کمی کو چھوڑ کر پستالوزی ہمارے نئے

نصب العین سے سب سے زیادہ قریب لے آتا ہے۔ یہی نہیں کہ اس نے تعلیم کو سماج کی اصلاح کا آلہ سمجھا ہو اور مدرسہ کو بچے کے لیئے دوسرا گھر بنانے کی کوشش کی ہو بلکہ اس نے مشاہدہ کو تدریس کی بنیاد بنا دیا اور اشیا کے ذریعہ تعلیم عام کر دی اس طرح اس نے ذہن اور حواس کی ہم آہنگ تربیت کا پورا پورا التزام کر دیا۔

حواس اور ذہن کی نشو و نما میں جسم برابر کا حصہ دار فروبل (۱۷۸۲ء تا ۱۸۵۲ء) کے ہاتھوں بنا فروبل نے سب سے پہلے ذہن اور حواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں کی زندگی عضلاتی یا جسمانی فعالی کو بھی جگہ دی اور اسی چیز کو حواس کی نشو و نما اور ذہنی تعلیم دونوں کا ذریعہ بنایا۔ فروبل نے نجی طور پر بچوں کو پڑھانا تو ۲۳ سال کی عمر ہی سے شروع کر دیا تھا اور اس ابتدائی تجربے کی کامیابی سے متاثر ہو کر اس نے ۳۴ سال کی عمر سے باقاعدہ تعلیمی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے ایک کسان کی جھونپڑی میں پانچ بچوں کے سہارے سے ایک مدرسہ کھولا۔ اس مدرسے کا نام سنیں گے آپ؟ بہت شاندار نام ہے۔ "یونیورسل جرمن ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن" کسان کی اس جھونپڑی۔ نہیں میں نے غلط کہا اسی "یونیورسل جرمن ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن" میں فروبل نے اس طریقۂ تعلیم کی بنیاد ڈالی جو "بالک گھر" کے نام سے مشہور ہے۔ فروبل کے نزدیک تعلیم کا پورا عمل بچوں کی ذہنی نشو و نما اور ان کی شخصیت کے آزادانہ اظہار کا عمل ہے۔ وہ ہر بچہ کو ایک دیوتا کی حیثیت میں رکھنا چاہتا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق اپنی دنیا بنائے اور دیکھے کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ ہر بچہ کو صحیح معنی میں ایک خالق کا درجہ دینا چاہتا ہے اور اس کی قسمت کو اسی کے افعال و اعمال سے معنون کرنا چاہتا ہے۔ اس مدعا کو ذہن میں لئے ہوئے فروبل نے اُن کی رنگین گیندوں، لکڑی کے استوانوں، مکعبوں گولوں اور دوسری شکلوں کے ٹکڑوں سے بچوں کے لئے کچھ مشغلے تجویز کئے ہیں۔ یہ مشغلے تبدریج آسان سے مشکل ہوتے جاتے ہیں اور بچے اپنی خود فعالی ہی میں اپنے ذہن کے نشو و نما کے ذریعے ڈھونڈتے ہیں اور انہیں وہ ذریعے مل بھی جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی زندگی کا اصول جمود نہیں حرکت ہے۔ بچہ کو اگر آپ کچھ سکھانا چاہتے ہیں تو اسے خوش رکھنا ضروری ہے اور خوش رکھنا کیا معنی رکھتا ہے یہ مسٹر بے اے جیکین کے الفاظ میں سمجھئے۔ ان کے الفاظ اس قدر خوبصورت ہیں کہ میں ترجمہ کر کے آپ کو ان کے صحیح لطف سے محروم

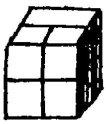
کرنا نہیں چاہتا۔ وہ پہلے خود پوچھتے ہیں :۔

What is happiness for the child ?

اور پھر خود جواب دیتے ہیں :۔

It is the free functioning of all faculties. It is action. It is expression. It is finding one's self. It is coming into one's own. It is the flight of the arrow winging its way to the mark.

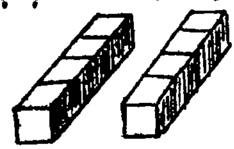
زدبل کے بچے کو وہ خوشی پوری طرح حاصل ہے جن کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے۔ وہ کسی وقت



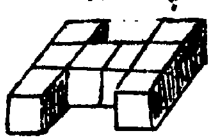
لکڑی کے یہ آٹھ ٹکڑے لے کر بیٹھتا ہے اور ایک معصوم فرشتہ کی طرح دیکھنا چاہتا ہے کہ ان سے کچھ بن بھی سکتا ہے یا نہیں۔ دو لکڑی کے ٹکڑوں کو مختلف صورتوں میں لگا کر رکھتا ہے۔ اس نے آٹھوں ٹکڑے پہلے ایک قطار میں لگائے۔



لیکن یہ چیز کچھ اسے جچی نہیں۔ اس نے پھر ترتیب بدلی۔ اس نے چار چار ٹکڑوں کی دو قطاریں بنائیں۔



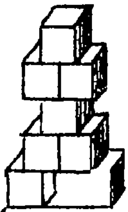
یہ کچھ بہتر صورت معلوم ہوئی۔ اس نے اور سوچا۔ اس مرتبہ اس نے تین تین ٹکڑوں کی دو قطاریں بنا کر باقی کے دو ٹکڑے ان کے بیچ میں رکھ دیے



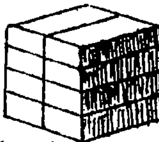
ذہن ہنوز مصروف ہے نگاہیں ہنوز نئے خاکے کی متلاشی ہیں اور ہاتھ ہنوز مضطرب ہیں۔ اس نے اس دفعہ تین ٹکڑے ایک قطار میں رکھے اور چار اس کے نیچے لگا دیئے۔



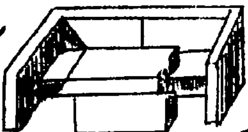
لیکن اس مرتبہ ایک ٹکڑا بچ رہا یہ اس کا کیا کرے؛ قوتِ تخلیق نے پھر ایک نئی شکل اختیار کی۔



یہ شکل نئی تو ہے اور اس کے بنانے والے کو پسند بھی آئی لیکن یہ چیز آخر ہوئی کیا؟ اس الجھن سے وہ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے فوراً لکڑی کے



یہ ٹکڑے لئے اور ذہن کو واقعاتاً دو ایک پیچ ذرا زور کے دے ڈالے۔ ایک خاکہ بنایا بگاڑ دیا، دوسرا بنایا اور بگاڑ دیا۔ بالآخر ایک اور نئی چیز بن ہی گئی۔ اور یہیں اس کی جنت مکمل ہو گئی —— یہ ایک بادشاہ کے بیٹھنے کا تخت



ہے۔ اب یا تو وہ اس بادشاہ کی کہانی اپنے ذہن سے نکالے گا یا کسی سے سنے گا وہ خود بادشاہ بنے گا، خود تلوار ہاتھ میں لیکر جنگ کرے گا۔ خود شکست کا خوف اور فتح کا غرور محسوس کرے گا۔ امیری اور غریبی ظلم اور انصاف، بھلائی اور برائی کے سارے خاکے اسے اسی تصویر میں نظر آئیں گے۔ پھر کسی فرصت میں وہ کاغذ سے اس بادشاہ کے کپڑے بنائے گا اور مٹی سے اس کے کھانے پینے کے برتن بنائے گا۔ الغرض جب تک وہ اس بادشاہ کی زندگی اپنی زندگی نہیں بنالے گا اس وقت اسے چین نہیں آسکتا۔

بعض لوگ کہیں گے کہ واہ صاحب اب بچوں کو انہیں چوچلوں میں بہلائے رکھیئے اور پڑھنا لکھنا خاک بھی نہیں لیکن ذرا ٹھہریئے۔ کیا اس کے آٹھ لکڑی کے ٹکڑوں کا حساب چار اور چار آٹھ تین اور تین چھ اور دو آٹھ اس کے لئے حساب کا پہلا سبق نہیں ہے؟ وہ بادشاہ کی کہانی سن کر اسے اپنے دوستوں کو سنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا یہ کہانی اس کے لئے زبان کا پہلا سبق نہیں ہو سکتی؟ وہ مٹی کے برتن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اور کیا ہے اگر سائنس کی بنیاد نہیں ہے —— ہاں یہ ضرور ہے کہ بچہ یہاں اپنی اپج کا بادشاہ ہے وہ آپ کے احکام کا غلام نہیں، وہ ایسا ہے اپنا ذہن اور اپنے ہاتھ پاؤں کا استعمال کرسکتا

ہے اور جس وقت وہ معروف ہوتا ہے اس وقت اس کا پورا وجدان ــ جسم، حواس اور ذہن سب ہی مصروف ہوتے ہیں اور مکمل انسان، اسی طرح پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح پیدا کیا جاتا ہے۔

ہاں آپ یہ کہہ سکتے کہ یہاں بچے کے مشاغل اور مصروفیتیں صرف اشارتی (Symbolic) حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم یہ کیونکر سمجھ لیں کہ جو بچہ اُون کی گیندوں، ریشم کے فیتوں اور پالش کئے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے اپنی دنیا بنا سکتا ہے وہ اینٹ پتھر اور بغیر صاف کی ہوئی لکڑی سے بھی کوئی عالم پیدا کر سکے گا۔ ہم یہ کیونکر سمجھ لیں کہ جو بچہ ایک صاف ستھرے کمرے میں اُجلے کپڑے پہنے لکڑی کے رنگین شلنوں کو ترتیب دے کر کوئی ڈیزائن بنا سکتا ہے وہ دنیا میں ــ گرد و غبار اور چیتھڑوں کی دنیا میں بھی ــ اپنا اور دوسروں کا مقام پہچان سکے گا۔ یہ خواب کی دنیا ہے، یہ تصورات کا عالم ہے اور اس لئے کیوں نہ ہم بچوں کے مشغلوں اور ان کی مصروفیتوں کو دنیا، سماج اور زندگی سے براہ راست وابستہ کر دیں۔ بچے کٹے کٹائے پالش کئے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے ایک وہمی مکان کیوں بنائیں۔ وہ سچ مچ اینٹ مٹی اور لکڑی سے چھوٹا ہی سا سہی لیکن اصل مکان کیوں نہ بنائیں۔ زندگی میں بے شمار خدا کے بندوں کو اینٹیں اٹھانی پڑتی ہیں اس لئے ہمارے بچے بھی اینٹیں اٹھانے میں کیوں تکلف محسوس کریں۔ دنیا میں لاتعداد انسانوں کو مٹی میں ہاتھ پاؤں ڈالنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کیا ہوا اگر ہمارے بچوں کے ہاتھ پاؤں بھی گارے میں بھر جائیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ لکڑی کاٹ کر اسے صاف کرتے ہیں اس لئے کوئی حرج نہیں اگر ہمارے بچے بھی یہ کام کریں۔ انہیں مدرسے سے نکل کر بہرحال دنیا میں جانا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس بزم کہ رونا زمیں کس کو کہاں جگہ ملے گی۔ اس لئے بچوں کے کردار کی ایسی داغ بیل کیوں نہ ڈالیں جو انہیں ہر مرکز پر کامیاب انسان بنا سکے۔

بالکل مگر یہ کچھ ہی تنقید ہمارے زمانے کے سب سے بڑے ماہر تعلیم جان ڈیوی کی بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو شکر چڑھی ہوئی کونین کی گولی کھلانے سے بہتر یہ ہے کہ اسے کونین کی سادہ گولی دی جائے تاکہ کھانے والے کو معلوم تو ہو کہ کونین کا ذائقہ بالآخر ہوتا کیا ہے۔ اسی لئے تعلیم کے سلسلے میں ڈیوی ان مشغلوں کو ترجیح دیتے ہیں جو ترقی زندگی کے بڑے بڑے شعبوں اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ تمدن کی بنیادیں اس وقت سے پڑنی ہیں جس وقت سے انسان نے آگ جلانا، گھر بنانا، کاشت کرنا، کپڑا بننا وغیرہ شروع کیا

سبب اس لئے مدرسے میں اسی قسم کے مشغلوں کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔ اس طرح ہر اس بچے کے لئے جو اس راہ پر کام کرے گا۔ جگ بیتی آپ بیتی بن جائے گی۔ پھر تاریخ بتاتی ہے کہ علم ان نتائج ہی کی منظم صورت ہے جو انسان کو عمل کے دوران میں حاصل ہوتے ہیں۔ زراعت کو ایک مرتب و مدون علم کی صورت اختیار کئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا ہے لیکن بہ حیثیت ایک اہم ترین عملی مشغلے کے وہ ابتدائے تمدن سے جاری ہے۔ اس لئے ہمارے طلبہ بھی وہی راستہ کیوں نہ اختیار کریں جس پر نسل انسانی چل چکی ہے۔

اس اصول کے ماتحت جو طریقہ تعلیم وضع کیا گیا ہے وہ منصوبے کا طریقہ تعلیم ہے۔ بچے اپنی پسند سے کوئی منصوبہ منتخب کر لیتے ہیں۔ وہ مدرسہ میں میلاد کرنا چاہیں یا دوکان کھولنا چاہیں یا میلہ کرنا چاہیں انہیں اپنی راہ میں لکھنے پڑھنے، حساب لگانے تاریخی اور جغرافیائی معلومات فراہم کرنے کی جہاں جہاں بھی ضرورت پڑتی ہے وہ بڑے شوق سے اپنے کام میں سہولت پیدا کرنے کے لئے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور کسی ضرورت کا سامنے آنا اور شوق کے ساتھ اس کا حل سوچنا ہی ذہنی تربیت اور باقی رہنے والی تعلیم کی بنیاد ہے۔ علم فی الحقیقت بچوں کے لئے کبھی شعوری مقصد نہیں بن سکتا ہے۔ ان کے لئے علم کو انہیں کے مرغوب مشغلوں کا نتیجہ ہونا چاہئے۔

لیکن منصوبے کے طریقہ میں تین باتیں ذرا کھٹکنے والی ہیں۔ اول یہ کہ سال بھر ایک منصوبہ چلانا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے ایک دشواری تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ نصاب بعض وقت صفائی کے ساتھ منصوبی مشاغل سے مربوط نہیں ہو پاتا۔ یہ دشواری ہندوستانی مدرسوں کے لئے خاص دشواری ہے کیونکہ یہاں منصوبہ نصاب کے لئے ہے نصاب منصوبے کے لئے نہیں۔ بلکہ ایک منصوبے کے بعد دوسرا منصوبہ اور دوسرے منصوبے کے بعد تیسرا منصوبہ منتخب کرنا ممکن ہے بچوں کی توجہ کے انتشار کا باعث ہو اور اس دوسری مشکل سے ایک اور تیسری خامی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ بچہ متعدد قسم کے کام کرتے رہنے کے باوجود کسی ایک کام میں مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔

منصوبے میں اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہندوستانی ماہرین تعلیم نے منصوبے کی حدود کو اتنا وسیع کیا کہ ایک طرف تو وہ پورے سات سال کا منصوبہ بن جائے اور دوسری طرف اس کے ذریعہ دیا جا

نصاب بھی زیادہ سے زیادہ پڑھایا جا سکے اور سب سے زیادہ یہ کہ طالب علم فارغ التحصیل ہونے تک کسی ایک ایسی دستکاری میں اتنی مہارت حاصل کرے جو اس کے لئے اگر ضرورت پڑے تو ذریعہ معاش بھی بن سکے اور یہ بات حاصل کی گئی ہے مختلف مشغلوں کو تعلیم کا ذریعہ بنانے کے بجائے حرفے کو تعلیم کا ذریعہ یا مرکز بنا کر لیکن دیکھنا ہے کہ کیا کوئی ایک حرفہ مکمل طور پر ذریعہ تعلیم بن سکتا ہے اور کیا ہمیں خود کسی ایک حرفے کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہئے۔

حرفوں کی اضافی اہمیت اور ان سے ربط کا مسئلہ ۔ حرفوں کو سب سے پہلے نصاب میں داخل کرنے کا سہرا فن لینڈ کے سر ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی سوئیڈن، جرمنی، امریکہ وغیرہ ممالک نے بھی حرفے کی تعلیم کو بچوں کے مدرسوں اور استادوں کے مدرسوں دونوں میں شامل کیا لیکن حرفے سے بچوں کے جبلی رجحانات کی تسکین کے علاوہ اسے اقتصادی اور خالص تعلیمی غرض سے اختیار کرنا بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم بنانے والوں کا امتیاز ہے۔ بنیادی قومی تعلیم نے یوں تو ہر اس حرفے کی اجازت دی ہے جو تعلیمی صلاحیت رکھتا ہو اور زندگی کے زیادہ سے زیادہ دائروں کو چھو کر گذرتا ہو لیکن تین حرفے بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی نے خود بھی تجویز کئے ہیں۔ وہ تین حرفے ہیں۔ باغبانی و زراعت، کاتنے بننے کا کام اور لکڑی گتے کا کام۔ ان حرفوں کو تجویز کرتے وقت یقیناً ان کمیٹی کے سامنے کل ہندوستان کا ماحول اور سماجی نظام تھا باغبانی پہلی پانچ جماعتوں کے لئے لازمی حرفے کے طور پر نصاب میں داخل ہے اور اسے عام سائنس کے نصاب میں بھی پوری جگہ دی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی برما کو چھوڑ کر چھتیس کروڑ کی آبادی کا ۹۰ فیصدی دیہاتوں میں رہتا ہے اور اس حصہ کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ ہندوستان کی کل قابل کاشت زمین ۲۲۷،۸۶۰،۹۷۲ ایکڑ ہے یعنی ایک فرد کے لئے ایک ایکڑ سے بھی کم ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر ہندوستان کو بھوکوں مرنے سے بچانا ہے تو اسے اپنی زمین کو زیادہ سے زیادہ احتیاط اور بہتر سے بہتر طریقوں پر جوتنے بونے کی کس قدر ضرورت ہے۔

کاتنے بننے کی اہمیت ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ ہے کہ ہم اندازاً ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف کپڑے کی خرید کے سلسلے میں باہر بھیجتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمارا نقصان ہے اور دوسری طرف یہ بھیانک

حقیقت ہے کہ ہماری آمدنی کا اوسط پینتالیس روپیہ سالانہ یعنی ایک آنہ گیارہ پائی یومیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کل ہندوستانیوں کی آمدنی ہم سب پر یکساں بانٹ دی جائے تو مشکل سے چنے اور صرف چنے کھانے کو مل سکتے ہیں۔ انہیں بھی جو کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور موٹروں میں چڑھتے ہیں اور انھیں بھی جو جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور پاپیادہ چلتے ہیں۔ وہ تو یوں کہئے کہ دولت کی تقسیم کے غلط ہنگاموں میں نہ ہمیں مفلسی نظر آتی ہے نہ اس کی چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ یہ قومی افلاس کسی حد تک دور ہو سکتا ہے اگر ہم کم از کم وہ ساٹھ کروڑ روپیہ ہی اپنے اس مزدور اور اپنے اس غریب کے لئے روک لیں جو کام کرنا چاہتا ہے اور جسے کام نہیں ملتا ہی نہیں بلکہ ہمارا وہ کسان بھی جس کا خون ہمارے تمدن کے خاکے میں رنگ و نور پیدا کرتا ہے۔ وہ کسان بھی فاقوں سے بچنے کے لئے تکلی کا سہارا لے سکتا ہے۔ اس لئے کاتنے بننے کا کام ہماری دیہی زندگی کو بھی زیادہ خوشگوار بنا سکتا ہے اور فی الحقیقت اسی میں ہماری نجات ہے۔

ٹیگور نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "دیہات عورتوں کی مانند ہیں جن کی بدولت قوم کی گود آباد رہتی ہے"

باغبانی وزراعت اور کتابی بنائی کے حرفوں کی قومی ضرورت مسلم لیکن لکڑی گتے کے کام کی کوئی اتنی وسیع اہمیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہاں ان لوگوں کے بچے جنھیں باغبانی اور زراعت سے کوئی واسطہ نہ پڑ سکے اور جنھیں کاتنے بننے کے کام میں کوئی سیاسی یا اعتقادی تکلف محسوس ہوتا ہو وہ ضرور اس حرفے کو اختیار کر سکتے ہیں۔ اقتصادی اور قومی حیثیت سے نہ سہی لیکن اس حرفے میں کاتنے بننے کے کام کے مقابلہ میں ایک بڑی برکت پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے تنوع پسند طبیعتوں کے لئے اس حرفے میں تسکین کا بہت سامان موجود ہے۔ کاتنے بننے کے کام کی یکرنگی شاید بعض وقت تکلیف دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اور ممکن ہے بچوں کو روز وہی تکلی۔ وہ ہی روئی۔ وہ ہی دھاگا۔ وہ ہی انداز نشست وہ ہی ہاتھ کا ایک مخصوص سمت میں نپی ہوئی اونچائی تک اٹھنا اور تکلی کی گھوں گھوں کی آواز گراں اور بہت گراں گزرے ممکن ہے آپ یہ سوچیں کہ بچے اس کام کا مقصد سمجھ لیں گے اور اس لئے اگر کبھی تلخی محسوس ہوئی بھی تو وہ اسے دوا کے گھونٹ کی طرح برداشت کر لیں گے لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ بچہ جب تک کم از کم نو سال کا نہ ہو جائے اس وقت تک اس سے کسی مقصد کے سمجھنے یا کسی مقصد کو حاصل کرنے کے شوق کی امید

نہیں کی جا سکتی۔ یہ اندیشہ گاؤں کے بچوں کی زندگی میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گاؤں میں بچے سادہ زندگی اور تنوع سے ایک حد تک بے نیاز ماحول کے عادی ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے عملی کام کی یکرنگی کو بھی اسی طرح برداشت کر لیتے ہیں جس طرح کوئی شخص گردش روز و شب کا عادی ہو جائے۔ شہر کے بچے البتہ تنوع کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے گھر میں۔ ان کے ماحول میں نئے نئے خاکے ذرا جلدی جلدی بنتے رہتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ اس حرفے کو بھی پسند نہ کریں جو انہیں بس ایک ڈگر پہ لے جائے۔ ہر روز ہر مہینے اور ہر سال۔ اسی لئے کاتنے بننے کے حرفے میں بچوں کو اپنی شخصیت کے اظہار کا بھی زیادہ موقع نہیں مل سکتا ہے۔ باغبانی کرنے والا بچہ ہر مرتبہ نئی قسم کی کیاریاں بناتا ہے۔ لکڑی، گتے کا کام کرنے والا ہر مرتبہ نئی چیز پیدا کرتا ہے اور نئے ڈھنگ سے لیکن کاتنے میں سوائے اس کے کہ کوئی بچہ اپنے سوت کا نمبر گھٹا بڑھا لے اور تو کچھ نہیں کر سکتا بدقسمتی سے سوت کا نمبر گھٹانا بڑھانا بھی اکثر بچوں کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے تنوع اور اظہار شخصیت کے موقعوں کے اعتبار سے کاتنے دُھننے کا حرفہ ذرا گھٹیا درجے کا حرفہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بننے کے کام میں خود فعالی، اظہار شخصیت اور اعلیٰ تخیلی قوتوں کے استعمال اور نشو و نما کا بدرجہ اتم موقع موجود ہے۔ لیکن بننے کے کام کے لئے ایک بچے کو صرف دو سال اور وہ بھی مدرسے کی زندگی کے آخری دو سال ملتے ہیں۔ ایک اور بات جو باغبانی اور گتے لکڑی کے کام کی حمایت میں اور کاتنے کے خلاف کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اول الذکر حرفوں کے مقابلے میں آخر الذکر حرفہ حواس کی تربیت اور جسمانی اعضا کی نشو و نما کے اتنے زیادہ امکانات نہیں رکھتا۔ باغبانی میں حواس کی تربیت کے لئے نہ صرف ہر وقت رنگ و نور اور نغمہ و ترنم کی ایک جنت موجود ہے بلکہ اس میں عضلاتی اور جسمانی فعالی کا ہر مناسب و متوازن موقع ہے۔ کیاری کے کنارے بیٹھے بیٹھے سوکھی پتیاں چننے سے لے کر پھاوڑے سے زمین کو کھودنے کا سخت کام تک کیا جا سکتا ہے۔ گتے لکڑی کے کام میں بھی یہ تمام برکتیں موجود ہیں لیکن وہ اس جمالیاتی لطافت سے محروم ہیں جو باغبانی کو ہر اعتبار اور ہر پہلو سے ممتاز بناتی ہے۔ ہاں تکلی ذہن کو گیان دھیان کا عادی بنا سکتی ہے۔ جہاں خیال چوکا اور دھاگا ڈوٹا اور کائنات ہاتھوں سے گئی امیں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر عبد المجید صاحب (مصنف پستالوزی) سے پونہ میں پوچھا "آپ کا تکلی کے متعلق کیا خیال ہے؟" فرمانے لگے "مجھے مزے

کی چیز ہے۔ دماغ کو کتنی ہی پریشانی کیوں نہ ہو لیکن جہاں تکلی نے دو ایک چکر کھائے اور معلوم ہوا کہ کائنات نظر کے سامنے گھوم رہی ہے! لیکن یہ ایک بالغ ذہن ہی کی صلاحیت ہو سکتی ہے اور اگر مان بھی لیا جائے کہ تکلی کائنات اور دھاگا نور ازل کی ایک کرن بن سکتا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمیں مستقبل کے ہندوستان کے لئے ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھے جلووں کا انتظار کیا کریں یا ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو کارگہ حیات میں پھاوڑے سنبھالے اپنے حصے کی ایک ایکڑ زمین جوتنے بونے پر مستعد نظر آتے ہوں؟

یہی نہیں بلکہ جہاں تک خالص تعلیم کا معاملہ ہے۔ یعنی حرفے کے ذریعہ نصاب کے مضامین پڑھانا وہاں بھی کاتنا بننا باغبانی کے معیار کو نہیں پہونچتا۔ لکڑی گتے کے کام میں بھی ربط کے امکانات محدود ہیں اس حرفے کے ذریعہ حساب بآسانی پڑھایا جا سکتا ہے لیکن اس سے اونچی جماعتوں میں حساب کے ربط کے زیادہ موقعے نکلتے ہیں۔ حالانکہ گتے کے کام سے ہمیں پہلی دو جماعتوں کا نصاب پڑھانا ہے۔ براہ راست گتے سے حساب میں، وزن پیمانے، سکے، رقبہ، جیومیٹری کی شکلیں وغیرہ۔ سماجی علم اور عام سائنس میں آمد و رفت کے ذرائع، چینیوں کا تمدن رنگوں کی بناوٹ، پانی، زہر وغیرہ قسم کے موضوع پڑھانے کا اچھا موقع ہے لیکن کاتنے بننے کے کام میں ابتدائی جماعتوں کے حساب پڑھانے کا زیادہ بہتر موقع ملتا ہے مگر آگے چل کر کھینچ تان کو زیادہ دخل دینا پڑے گا۔ عام سائنس بآسانی پڑھائی جا سکتی ہے اگر کپاس بونے کا کام بھی شامل ہو لیکن شہر کے مدرسوں میں یہ انتظام ناممکن ہوگا۔ سماجی علم کا ربط کاتنے بننے کے اعلیٰ علم سے زیادہ کپڑے کی تجارت کی ترقی اور اس کی تاریخ سے ہوگا اور یہی اس حرفے کا سب سے بڑا عیب ہے۔ باغبانی بے شک ان کوتاہیوں سے بڑی حد تک بے نیاز ہے۔ اس کی افضلیت اس میں ہے کہ عمل اور حد درجے متنوع قسم کے عمل کا موقع ہے چنانچہ یہاں بیشتر مضمونوں کا ربط باغبانی کی تاریخ سے نہیں بلکہ باغبانی کے کام سے ہوتا ہے اور یہی ربط کی بہترین صورت ہے۔ باغبانی نباتاتی دنیا، حیوانی دنیا، تمدنی دنیا اور قدرتی مظاہرات — سب پر بیک وقت ہمارے لئے دروازے کھول دیتی ہے، لیکن باغبانی کے حق میں یہ سب کچھ کہہ دینے کے باوجود یا کسی اور حرفے کے حق میں اس سے بھی

ریادہ کہہ سکنے کے باوجود ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ایک حرفہ ربط کے تمام مقاصد پورے کرنے کے لئے فی ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ذاکر حسین کمیٹی نے خود ربط کے دو اور مرکز۔ یعنی بچے کا سماجی ماحول ور طبعی ماحول بھی تجویز کئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ حرفے کے ساتھ ساتھ ان دو مرکزوں کے اضافے سے ربط کی نجائشیں لامحدود ہو جاتی ہیں۔ اور سمجھ بوجھ رکھنے والے استاد کو ربط کا صحیح موقع نکالنے میں کبھی اور کہیں ناکامی نہیں ہو سکتی۔ بالآخر ہم نصاب میں بچوں کو پڑھاتے بھی کیا ہیں؟ یقیناً وہی چیزیں جو سماج اور قدرت ہمارے چاروں طرف پھیلائے ہوئے ہے اور اس لئے نصاب کا کوئی موضوع ان دو مرکزوں سے الگ کوئی چیز نہیں سکتا لیکن افسوس یہ ہے کہ جہاں عمل کا سوال پیدا ہوتا ہے، وہاں بعض استاد یہ بات بھول جاتے ہیں دروہ نہ صرف نصاب کے تمام مضمونوں کو ایک اور صرف ایک حرفے سے مربوط کرکے پڑھانے کی کوشش تے ہیں بلکہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم بنیادی قومی تعلیم کا تمام نصاب کاتنے دھننے کے کام سے یا لکڑی گھڑنے کے کام سے مربوط کرکے پڑھا سکتے ہیں۔ میں ایک کے متعلق نہیں متعدد مدرسوں کے متعلق کہہ سکتا ہوں ہ وہ ایسا کرتے ہیں اور اپنی اس کوشش پر نازاں ہیں۔ یہ کوشش تو بری نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے ہ اس کوشش سے کوئی اچھا تعلیمی نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو آپ کو بھی جواب فی میں دینا ہوگا۔ جہاں تک حساب کا تعلق ہے یہ چیز تو بلا تکلف ہر تعلیمی اور غیر تعلیمی شغل سے مربوط ہو سکتی ہے۔

ابتدائی جماعتوں میں زبان کے سبق بھی چاہے جس حرفے اور چاہے جس شغل سے مربوط ہو سکتے ہیں لیکن ام سائنس اور سماجی علم کے مضمونوں کے لئے ربط کا ایک اور صرف ایک مرکز ڈھونڈنا بہت ناروا کوشش ہے۔ ٹریننگ کے دوران میں ہماری جماعت ایک مدرسے میں نمونے کے کچھ سبق دیکھنے گئی۔ یہاں ایک سبق دیکھا۔ استاد کو زبان کے سبق میں ایک چینی بچے کی کہانی پڑھانی تھی۔ استاد نے بچوں سے سوال کیا، سب سے پہلے کس ملک میں کاغذ بنا؟ "چین میں" بچوں کا جواب تھا۔ اس کے بعد استاد نے اہل چین کے رہن سہن کے طریقوں پر، ان کے لباس پر، ان کے تفریحی مشاغل، ان کے قانون فوجداری، ان کے مذہب پر اور ان کے زبان و ادب پر گفتگو کرنے کے بعد وہ سبق شروع کیا۔ سبق زبان کا تھا۔ زبان کے سبق کا مقصد و مدعا معلوم۔ ن یہ استاد زبان کے سبق کے مقصد کو کس حد تک حاصل کر سکے ہوں گے۔ اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے

کہ انھوں نے ۴۵ منٹ ربط کے شوق میں تمہیدی گفتگو پر صرف کیے اور صرف ۵ منٹ اس سبق پر۔ ایسا ہوا کیوں اس کی وجہ صاف ہے۔ استاد کو مدرسہ کے نگراں کی جانب سے اس سبق کو گنتے کے کام سے مربوط کرکے پڑھانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ہدایت! — آپ کو تعجب ہوگا یہ سبق خود اپنی جگہ سماجی ماحول سے مربوط تھا۔ اس سبق کے ابتدائی حصے میں ذکر تھا کہ کس طرح ان بچوں ہی کے شہر میں ایک چینی ڈاکٹر ہیں اور ان کا ایک بچہ ہے؛ وغیرہ وغیرہ۔ اگر اصل سبق میں یہ تمہید موجود نہ ہوتی تو بھی اس سبق کا ربط سماجی ماحول سے ہو سکتا تھا۔ گلیوں میں چھری چاقوؤں پر پینی دھار رکھنے والوں کا منظر چینی بچوں کا تماشہ کرتے ہوئے کبھی کبھی نظر آتا چینیوں کا بڑی سی گٹھری میں ریشم لادے لادے بیچتے پھرنا ایسی باتیں نہیں جنھیں شہر کے بچوں اور بالخصوص اس شہر کے بچوں نے جہاں یہ سبق پڑھایا جا رہا تھا نہ دیکھا ہو۔ ایک اور مدرسے میں استاد کو دیکھا کہ اس نے بچوں کو روئی دکھا کر پوچھا "روئی کا رنگ کیسا ہے؟" سوال کی صحت اور عدم صحت کو چھوڑیے دیکھنا یہ ہے کہ جب بچوں نے جواب دیا "سفید" تو پھر استاد نے پوچھا "برف کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟" بچوں کا جواب پھر وہی تھا یعنی "سفید" اب کیا تھا استاد جس نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے وہ انھیں مل گئی بس "تو آج ہم تمھیں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا حال پڑھائیں گے"۔ اور بچوں نے کتاب سے وہ سبق پڑھنا شروع کر دیا

جہاں تک میری معلومات اور ذاتی تجربے کا دخل ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط فہمی لوگوں میں اور عام قسم کے استادوں میں تین مرکزوں سے پھیلتی ہے۔ وہ مرکز ہیں ٹریننگ اسکول، مہاتما گاندھی کی ذات، اور ربط کی وہ مثال جو ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ہے۔ ٹریننگ اسکولوں میں حرفوں سے ربط کے متعلق طلبا کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے کیونکہ جو استاد انھیں ربط پڑھاتا ہے وہ حرفے کا عمل نہیں جانتا اور جو استاد حرفہ سکھاتا ہے وہ نہ ربط کے نظری پہلو سے واقف ہوتا ہے، نہ نصاب اس کے سامنے ہوتا ہے اور نہ اس حرفے کی نشو و نما اور اس کی تاریخ اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ نظری اور عملی کام کے اس فرق کو صاف طور پر اس حقیقی مثال سے سمجھ لیجیے کہ ایک ٹریننگ اسکول میں طریقہ تعلیم پڑھانے والا استاد مڈل پاس ہے۔ ربط پڑھانے والا استاد ایک ایم اے ہے۔ حرفہ سکھلانے والا استاد ایک منشی پاس ہے اور مشقی سبقوں کی جانچ کرنے والوں میں ایک چوتھا درجہ پاس پی ٹی سی ہے۔ پھر طالب علم کے سامنے

بعض وقت یہ مجبوری ہوتی ہے کہ اس کو اپنے سبق کی مخصوص حرفے سے مربوط کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس ٹریننگ اسکول کا میں نے ابھی حوالہ دیا ہے اس میں باقاعدہ مشقی سبقوں کے پروگرام میں ربط کا مرکز وضع کر دیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کے کسی حصے کو یہاں نقل کرنے کا موقع نہیں ورنہ پیش کر دیتا۔ ایک اور گمراہ کن چیز یہ ہے کہ بعض ٹریننگ اسکولوں میں حرفہ پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ ان کی تعلیمی اہمیت کچھ خود بخود دب جاتی ہے۔ میری ایک عزیزہ مارچ کے شروع میں ایک بیسک ٹریننگ سنٹر دیکھنے گئیں اور اس کے بعد انھوں نے مجھے خط میں جو کچھ لکھا اس کا ترجمہ یہ ہے:-

"ہم پچھلے ہفتہ بیسک ٹریننگ کالج دیکھنے گئے۔ ہم نے وہاں دیکھا کہ یہ کام کس طرح ہوتا ہے ہم سب نے وہاں ابری بنانا سیکھا۔ میں اپنی بنائی ہوئی ابری کے دو نمونے بھیجتی ہوں کہئے یہ ٹھیک ہیں نا؟ یہ میری پہلی کوشش ہے ...... اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سال بھر دہلی (جامعہ) میں کیا کرتے رہے۔"

یہ آخری ٹکڑا "اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سال بھر دہلی (جامعہ) میں کیا کرتے رہے" سنا آپ نے؟

پھر مہاتما گاندھی نے اکثر و بیشتر جب بھی اس تعلیم کا ذکر کیا تو انھوں نے وہی حرفوں کے کسی اور تعلیمی شغل کا حوالہ ہی نہیں دیا۔ انھوں نے بار بار (ہریجن کے متعدد مضمونوں میں، ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ پر پیش لفظ میں، پونہ کانفرنس کے موقع پر اپنے پیغام میں) یہی کہا ہے کہ تعلیم دیہی دستکاریوں کے ذریعہ ہونی چاہئے۔ عقیدت چونکہ ہندوستان کے ذہن پر اب بھی غلبہ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر بعض لوگ مہاتما گاندھی کے الفاظ سے متاثر ہو کر تعلیمی معاملے کو بھی جسے حد درجہ سائنٹفک ہونا چاہئے محض اعتقادی معاملہ بنا لیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے پونہ کانفرنس میں فرمایا تھا کہ "میں بنیادی تعلیم کا سند یافتہ استاد نہیں ہوں میرے پاس ایک ہی سند ہے اور وہ اعتقاد کی ہے" آگے چل کر ان صاحب نے فرمایا کہ کس طرح دستکاری اور تخلیقی مشاغل کے ذریعہ تعلیم کا اصول سمجھنے ... بعد انھوں نے کاتنا سیکھا اور پھر تعلیم دینا شروع کر دیا۔ اعتقاد کا سوال تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیجئے تو یہ چیز آپ کو اصولاً غلط اور مضر معلوم ہوگی۔ بنیادی قومی تعلیم ہمارا بہت زیادہ قیمتی تجربہ ہے اس لئے ابھی اسے زیادہ سے

زیادہ محتاط ہاتھوں میں رہنے کی ضرورت ہے۔

ذاکر حسین کمیٹی نے حرفے کے ساتھ ساتھ سماجی اور طبعی ماحول کو بھی ربط کے مرکز قرار دے کر اپنا پورا پورا حق ادا کر دیا لیکن جب عام استاد اسی رپورٹ میں کاتنے بننے کے کام سے پورے سات سال کے نصاب کے ربط کے امکانات دیکھتے ہیں تو وہ یا تو سماجی احوال کو بالکل بھول جاتے ہیں یا انھیں اتنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ذاکر حسین کمیٹی نے ربط کے یہ امکانات محض اس لئے تجویز کئے تھے کہ ہر مدرس اپنی جگہ سمجھ بوجھ سے کام لے کر آزادانہ حیثیت سے مگر صحیح کام کرے گا۔ ہوا بدقسمتی سے یہ کہ عقیدت نے سمجھ بوجھ کو یہاں بھی تھپکیاں دے کر سلا دیا۔ حالانکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو تعلیمی حیثیت سے اس تجویز کئے ہوئے ربط میں کہیں کہیں جھول نظر آئے گا۔ چند مثالیں آپ خود ملاحظہ فرمائیے۔

جماعت اول :- افریقہ میں اہرام بنانے والے غلام کا حال۔ ربط مختلف ممالک میں مردوں اور عورتوں کا لباس۔

جماعت دوم :حضرت موسیٰؑ کی کہانی۔ ربط :- قدیم زمانے کا لباس۔

جماعت سوم :- تھرما پلی کی جنگ۔ سقراط وغیرہ۔ ربط :- قدیم زمانے کے لباس کی سادگی اور خوبصورتی

جماعت چہارم :- سمندر گپت، کالیداس، آریہ بھٹ۔ ربط :- زمانہ قدیم میں کپڑے کی تجارت۔

جماعت پنجم :- پیغمبر اسلام کی سوانح حیات۔ ربط :- آنحضرت کا سادہ لباس۔ وغیرہ وغیرہ

ان چند مثالوں سے بخوبی واضح ہو جانا چاہئے کہ ربط اور کھینچ تان میں کیا فرق ہے۔ اہرام بنانے والے غلاموں کی زندگی میں ان کا لباس کوئی حیثیت نہیں رکھ سکتا۔ ان کی زندگی کا عنوان "غلامی" اور "مشقت" ہو سکتا ہے اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور پیغمبر اسلام پر ہر گفتگو میں ان کے پیغام کی اہمیت باقی تمام دوسری چیزوں پر حاوی رہے گی۔ تھرما پلی کی جنگ میں اس لباس کی کیا حقیقت جو اسپارٹا اور ایران کے سپاہی پہنتے تھے۔ ہاں ایک طرف ملک گیری کی ہوس اور دوسری طرف حب وطن کا جوش — یہ اس جنگ سے متعلق زیادہ قریب حقیقتیں ہیں۔ سمندر گپت کے لئے حکمرانی کالیداس کے لئے شعر و ادب اور آریہ بھٹ کے لئے علم و تحقیق طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ انھیں اپنے زمانے میں کپڑے کی تجارت سے کیا واسطہ؟

اہرام اور اہرام بنانے والوں کا ذکر کیا ان شاہی عمارتوں کے ذکر سے مربوط نہیں ہو سکتا، جو بچوں کے ماحول میں ہوں یا جنہیں بچے جانتے ہوں؟ ایک طرف اہرام بنانے والوں کو پیاز کھانے کو ملتی تھی، دوسری طرف تاج محل بنانے والے کاریگروں کو زندگی کی ہر سہولت میسر تھی۔ اہل یہود اور اہل اسلام کے بانیان مذہب کا رشتہ بڑی آسانی سے جوڑا جا سکتا ہے۔ ان بے شمار مذہبی تہواروں سے جو سال میں ایک نہیں کئی واقع ہوتے ہیں۔ تھراپلی کی جنگ موجودہ جنگ سے کس قدر ملی ہوئی چیز ہے۔ اسی طرح سمندر گپت، کالیداس اور آریہ بھٹ ہم سے کچھ دور نہیں ہیں۔ حکمرانی، شعر و ادب اور علم و تحقیق زندگی میں روز کا شغل ہیں۔

کچھ غلطی دراصل یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے ربط کو عام تعلیمی طریقوں سے الگ کوئی چیز سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ربط کا مسئلہ صاف صاف سبق کو پیش کرنے کا مسئلہ ہے اور اس اعتبار سے ربط کا طریقہ چند نقطوں سے محدود و محصور طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کی وسعتیں دائرہ در دائرہ اور اس کے امکانات گنجائش در گنجائش ہیں۔ ربط فی الحقیقت کوئی خارجی اصول نہیں ہے، وہ فی الحقیقت سبق کی بنیاد ہے اور سبق کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ جماعت کے سامنے کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ سبق سبق ہوگا اگر بچوں میں اس کے لئے صحیح شوق پیدا کر دیا گیا ہو اور بچوں میں شوق اسی وقت پیدا ہوگا جبکہ انھیں اپنے پچھلے تجربوں سے منسلک اپنی زندگی سے ہم رشتہ اور اپنے مشاغل سے متصل سبق میں ایسی معلومات کی امید ہو جو انھیں کسی نہ کسی اعتبار سے آگے بڑھا سکے۔

ایک استاد اپنی جماعت میں جاتا ہے اور کہتا ہے "نکالو سورج کی روشنی والا سبق" استاد یہ سبق اس لئے پڑھانے کہ مختار ہے، اور بچے یہ سبق اس لئے پڑھ لیں کہ وہ مجبور ہیں تو بات دوسری ہے۔ لیکن اگر کوئی بچہ کھڑا ہو کر استاد سے پوچھ بیٹھے کہ "ہم یہ سبق اس وقت کیوں پڑھیں؟" تو استاد کے سامنے جو نازک صورت ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ ایک استاد کے بچے صبح مدرسے کے پھولوں کی کیاریاں اور گملے وغیرہ صاف کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ بچے دیکھتے ہیں کہ ایک کونے میں جو گملا رکھا ہوا ہے اس کی پتیوں اور پھولوں کے رنگ میں وہ تیزی اور خوبصورتی نہیں جو باہر کیاریوں میں لگے ہوئے پھولوں میں ہے۔ یہاں استاد کے لئے سورج کی روشنی پر بچوں کو معلومات دینے کا کتنا اچھا موقع ہے

فرض کیجئے کہ ایک مدرسے کا استاد خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس میں اجمیر جاتا ہے جب وہ لوٹ کر آتا ہے تو ایک جماعت کے بچے اسے درجے میں بلا کر عرس کے حالات سنتے ہیں۔ وہ استاد اسی موقع پر انھیں خواجہ معین الدین چشتیؒ کا وہ سبق بھی پڑھا دیتا ہے جو ان کے نصاب میں داخل ہے۔

ایک استاد اپنے بچوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کا کمرہ کچھ ویران سا ہے۔ بچے کمرہ کو سجانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ استاد بچوں کے سامنے کاغذ کی پٹی پر ابری کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے کئی ڈیزائن پیش کرتا ہے ایک ڈیزائن مربعوں سے بنا ہوا ہے، ایک دائروں سے اور ایک مثلثوں سے بچے آخری ڈیزائن پسند کر لیتے ہیں۔ اب بچوں کو یہ مثلث خود کاٹنے ہیں بچے خود ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ مثلث ایسا ہے جس کا ہر ایک ضلع برابر ہے۔ وہ استاد سے اسے آسانی سے بنانے کا طریقہ پوچھتے ہیں۔ استاد انھیں متساوی الاضلاع بنانا سکھا دیتا ہے۔ بچوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کمرہ سجانے کے لئے حاشیہ بنا رہے ہیں یا مثلث متساوی الاضلاع بنانا سیکھ رہے ہیں۔

یہ مثالیں میرے خیال میں ربط کی اچھی اور صحیح مثالیں ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ذہین استاد بچوں کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے کہ بچوں کو یہ بالکل احساس نہیں ہوتا کہ ان پر کوئی چیز جبر کی جا رہی ہے۔ بلکہ بچے اس نئی چیز کو اپنی ذاتی کوشش اور کھوج کا نتیجہ سمجھتے ہیں چنانچہ انھیں وہی خوشی ہوتی ہے جو کولمبس کو امریکہ دریافت کر کے ہوئی ہو گی مربوط سبق بچوں کے شوق کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔

<u>ربط کی کچھ اور صورتیں</u> تعلیم میں ربط کا مسئلہ تخلیقی مشاغل کے ذریعہ یا بچوں کے سماجی اور طبعی ماحول کے ذریعہ تعلیم دینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ ربط کا مسئلہ ہر جہتی مسئلہ ہے چنانچہ یہاں سبق کا ربط سبق سے نکل سکتا ہے روزمرہ کی زندگی میں جب بھی کسی مدرسہ کا ٹائم ٹیبل ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مختلف مضمونوں کا اوپر سے نیچے تو کوئی رشتہ ہے مثلاً تیسرے گھنٹے میں روز انگریزی یا دوسرے میں روز حساب لیکن ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ٹائم ٹیبل میں مضمونوں کا رشتہ دائیں بائیں سے بھی ہے یعنی اگر تیسرے گھنٹے میں انگریزی ہے چوتھے میں تاریخ، پانچویں میں جغرافیہ چھٹے میں ڈرائنگ اور ساتویں میں اردو ہے تو اس کے باوجود کہ یہ گھنٹے

ٹائم ٹیبل میں الگ الگ ہیں۔ نہ تیسرے کا کام چوتھے سے الگ ہے نہ چوتھے کا پانچویں سے، نہ پانچویں کا چھٹے سے جن مدرسوں میں ہر مضمون کے استاد الگ الگ ہوتے ہیں وہاں تو البتہ ہر مضمون ایک دوسرے سے بے تعلق ہو جاتا ہے لیکن جہاں جماعت کے استاد موجود ہوں وہاں تو پہلے گھنٹے سے لے آخری گھنٹے تک کام میں کوئی مصنوعی تقسیم ہوتی ہی نہیں چاہیے مضمون خود اپنی جگہ الگ الگ ہونے کے باوجود مجموعی حیثیت سے ایک وحدت ہیں اور ہم زندگی میں خود ان مضمونوں کو وحدت کی حیثیت سے استعمال بھی کرتے ہیں جس وقت میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اسوقت مجھے تاریخ تعلیم، نفسیات تعلیم، اصول تعلیم، طریقہ حصول تعلیم، اقتصادیات زبان، ڈرائنگ اور حساب سب سے یکجائی طور پر کام لینا پڑ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ مختلف مضمونوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی۔ ادب کی تعلیم کے ساتھ مصوری، موسیقی، تاریخ جغرافیہ اور سائنس غرض وہ کونسی چیز ہے جو وابستہ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اس خیال کے بھی گذرے ہیں کہ مختلف مضمونوں میں سے کسی ایک مضمون کو مرکز بنا کر بقیہ تمام مضمونوں کو اس ایک مضمون سے مربوط کرکے پڑھایا جائے ہربرٹ جو تعلیم کا مقصد و مدعا سیرت کی تعمیر سمجھتے تھے (اور ہمیں ان سے اختلاف کرنے کی زیادہ گنجائش بھی نہیں ہے) تاریخ کو مرکزی حیثیت دے کر ادب، ریاضی، جغرافیہ، ڈرائنگ اور سائنس سب ہی کچھ اس کے ذریعہ پڑھا دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگر کسی جماعت میں اکبر کی شخصیت کو مرکز بنایا گیا ہے تو اکبر سے متعلق زبان کے نظم و نثر میں سبق، ہندوستان کے ان حصوں کا جغرافیہ جن پر اکبر نے حکمرانی کی، گجرات پر فوج کشی کے سلسلے میں سمندر اور اس کے ساتھ سائنس کے مسائل اور اکبر کے زمانے کے ملازموں کی تنخواہوں اور تعداد سے مربوط سوالات، اکبر کے زمانے کے لباس عمارتوں اور ہتھیاروں وغیرہ کی تصویریں۔ سب ہی کچھ پڑھایا جائیگا۔ ہمارے ایک اور بزرگ کرنل پارکر مطالعۂ قدرت کو مرکزی حیثیت دے کر ربط کی کچھ یہی صورت تجویز کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کے لئے یہ طریقہ بہت اچھا طریقہ ہے۔

ربط کی اس صورت کو نفسیاتی حمایت بھی حاصل ہے۔ بچہ دنیا کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھتا جن آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں۔ اس کے لئے انسان اور فطرت، دنیا اور دنیا کی مختلف چیزیں الگ الگ کوئی معنی نہیں رکھتیں تا آنکہ بالغ ہو کر وہ چیزوں میں امتیاز کر سکتا ہے اور ان کی اضافی اہمیت سمجھ سکتا ہے۔ وہ کرسی کو میز

سے اور ان دونوں کو ٹیبل لیمپ سے اپنے شعور کی ابتدائی زندگی میں الگ الگ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جس کمرہ میں رہتا ہے اس کی کتابیں، اس کی تصویریں، اس کی کرسی، اس کی میز، اس کا لیمپ سب ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں اور پورا کمرہ کا کمرہ اس تمام سامان کے ساتھ ایک وحدت کا درجہ رکھتا ہے۔ بڑا ہو کر وہ ضرور میز کو میز اور کرسی کو کرسی سمجھنے لگتا ہے گویا یہاں ربط کا مسئلہ امتیاز کا مسئلہ ہے اور تجزیے میں تحلیل کا رشتہ نکلتا ہے۔

ہربارٹ اور پارکر نے ربط کی جو صورت تجویز کی ہے اس کو سامنے رکھکر ہم جماعت میں ربط کی یہ صورت اختیار کر سکتے ہیں کہ ہم کسی مضمون کے کسی سبق کو کسی مضمون کے کسی موضوع سے مربوط کرلیں۔
ایک استاد ایک جماعت کو دوسرے گھنٹے میں شہد کی مکھیوں پر بچوں کو سبق پڑھانے جاتا ہے۔ استاد کو معلوم ہے کہ یہ بچے گھر کی مکھی کا حال پڑھ چکے ہیں۔ استاد اپنا سبق اس طرح پیش کرتا ہے۔

گھر کی مکھی کہاں پیدا ہوتی ہے ؟
گندگی میں
گھر کی مکھی کس چیز پر زندگی بسر کرتی ہے ؟
گندگی پر
گھر کی مکھی ہماری دوست ہے یا دشمن ؟
دشمن

لیکن آج ہم ایک ایسی مکھی کا حال پڑھیں گے جو گندگی میں پیدا ہونے کے بجائے صاف ستھری جگہ میں پیدا ہوتی ہے جو گندگی پر پرورش پانے کے بجائے رنگ و نور کی دنیا میں ملتی ہے اور انسان کو تکلیف پہونچانے کے بجائے اس کے لئے دنیا کی سب سے اچھی نعمتوں میں سے ایک نعمت مہیا کرتی ہے۔ بچے ایک دم پکار اٹھے "شہد کی مکھی ! ماسٹر صاحب !!" ربط کا حق اسی منزل پر پورا نہیں ہوجاتا بلکہ اس پورے سبق میں یہی التزام تھا کہ نئی معلومات کی ساری عمارت منزل بہ منزل انہیں بنیادوں پر بنی تھی جو بچوں کی پچھلی معلومات نے تیار کی تھی۔

ایک استاد نے دوسرے گھنٹے میں ایک جماعت کو دارائے اعظم کی کہانی پڑھائی اور اسے بغیر بچوں کے شوق کو تکلیف پہونچائے گھنٹے کے ساتھ ختم کر دیا تیسرے گھنٹے میں استاد کو شہد کی مکھیوں کی رانی کا حال پڑھانا تھا۔ استاد نے بچوں سے کہا کہ "اب تک تو ہم نے انسانوں کی دنیا میں راج کرنے والے ایک راجہ کا حال پڑھا۔ اب جانوروں کی دنیا میں حکومت کرنے والی ایک رانی کا حال پڑھیں گے۔" استاد کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے تھے کہ بچوں کے شوق میں تازہ جان پڑ گئی۔

بعض اسباق میں خود بخود دوسرے اسباق سے ربط کے عناصر موجود ہوتے ہیں ایک جماعت کے بچوں نے حالی کی یہ نظم پڑھی (مجھے پوری نظم یاد نہیں۔ یادداشت سے نقل کرتا ہوں)

جھٹپٹے کے وقت سرِ شام ایک مٹی کا دیا ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے اُن فانوس اور اُس لیمپ سے روشنی محلوں کے اندر ہی رہے جن کی سدا

....

سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اس نظم کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ "روشنی کا مینار" سبق بچوں کو نہ پڑھایا جائے اور اس کے ساتھ "ہفت عجائبات عالم"۔ "تمدن کے نمونے" وغیرہ دوسرے زبان، معلومات اور سماجی علم کے سبق۔

بلجیم کے مدرسۂ جدیدہ کے بانی واسکونسلو کی نظر میں ایک ہی دن میں ریاضی، لکھنا، پڑھنا، تاریخ جغرافیہ طبیعات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ممکن ہے ایک جرأت آزما سعی کہی جا سکے لیکن اس کا تعلیمی نتیجہ صفر ہوگا۔ کیونکہ ان مضامین کے موضوع میں کوئی ربط یا تعلق نہیں۔ واسکونسلو نے مضمونوں کی تقسیم کچھ اس طرح کی تھی کہ ایک مضمون سے متعلق کل سبق ایک جگہ مربوط سلسلے میں اکٹھے ہو جائیں اور اس طرح کہ انھیں طبعی ماحول و حالات سے بھی ہم رشتہ کیا جا سکے چنانچہ وہ اپنے طلبہ کے لئے گرمی کے موسم میں حیوانات اور نباتات وغیرہ کا مطالعہ تجویز کرتے ہیں اور سردی کے موسم میں طبیعیات و کیمیا کا مطالعہ۔ ان کے طلبہ جب موضوع

کو لیتے ہیں اس پر صبر اور استقلال سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ہمیں بھی نصاب میں اکثر ایسے مضامین ملیں گے جن کی ترتیب کو نظرانداز کرکے ہم انھیں بآسانی ایک سلسلے میں اور بہتر طریقے سے پڑھا سکتے ہیں۔ بعض مصنفین بھی مدرسین کا کام آسان کرنے کے لئے اب ایک موضوع سے متعلق مضمونوں کو کتابوں میں ایک ساتھ درج کرنے لگے ہیں۔

بنیادی قومی تعلیم کو تنگ نظر سے دیکھنے والے استاد ممکن ہے ربط کی ان صورتوں کو قابل قبول نہ سمجھیں لیکن میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ خود ہمیں ربط کی ان صورتوں سے بھی فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتی ہے اس میں سماجی علم کے بعض عنوانوں کو زبان کے سبقوں کے لئے بھی تجویز کیا گیا ہے۔ چنانچہ افریقہ کے بدوؤں، آسٹریلیا کے وحشیوں، عہد قدیم کے عبرانیوں، رومیوں اور ہندوستانیوں کی زندگی سماجی علم کے ساتھ ساتھ زبان کے نصاب میں بھی شامل ہے (صفحہ ۱۵۸[1]) اور وہ بات جس کی تحریک واسکونسلو نے کی ہے پورے نصاب کی جان ہے۔ عہد قدیم کا مصر، عہد قدیم کا چین، عہد قدیم کا ہندوستان ایک دوسرے سے ہم تعلق موضوع ہیں۔ چنانچہ یہ تمام موضوع نصاب میں اجتماعی حیثیت سے ایک ہی جگہ موجود ہیں اور ان میں باہمی ربط کا جو موقع ہے۔ وہ بھی تشریح و توضیح کا محتاج نہیں (صفحہ ۱۵۸)

فضل الدین اثر

---

[1] حوالہ صفحہ نصاب بنیادی قومی تعلیم انگریزی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۸ء

نئی تعلیم کے پڑھانے والے کیسے ہوں؟

اس کا ایک جواب تو وہ ہے جو گاندھی جی نے کانفرنس میں لوگوں کو دیا تھا کہ پڑھانے والے وہ لوگ ہوں جو میٹرک فیل ہوں۔ اس میں ملک کے مختلف پڑھے لکھے لوگوں کے معیار کے مطابق ایک بات کہدی ہے اس سے اسکیم کے پڑھنے والوں اور چلانے والوں کو معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو مڈل پاس، میٹرک پاس اور ایف۔ اے۔ بی۔ اے پاس کے معیار کو سمجھتے ہیں انہیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معیار کے پڑھے لکھے لوگ اس اسکیم کو چلا سکتے ہیں اگر ان کی خاطر خواہ تربیت ہو جائے۔ اس وقت نئی تعلیم کی ابتدا تھی گاندھی جی کا یہ جواب کافی تھا لیکن اب جبکہ کام کرنے اور کرانے والوں نے نئی تعلیم کے کام کو شروع کر کے کچھ تجربہ کیا ہے تو استاد کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا جا رہا ہے۔ کام کرنے اور کرانے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ استاد کو موجودہ تعلیمی معیار کے علاوہ کیا کیا باتیں آنی چاہئیں۔ اس میں کیا کیا استعداد ہونی چاہئے اور کن کن امور میں اس کی تربیت ہونی چاہئے۔ نئی تعلیم کے بسیط نصاب کے لئے جس میں دنیا کے ابتدائی دور سے لیکر موجودہ زمانے کے حالات اور واقعات کو معہ ان کے اسباب کے ترتیب دیا گیا ہے۔ صرف میٹرک فیل پاس استاد کافی نہیں ہو سکتا۔ اس نصاب کو پڑھانے کے لئے بی۔ اے پاس استاد بھی دقت محسوس کرتے ہیں۔ نئی تعلیم کا نصاب پرانی تعلیم سے بہت مختلف ہے۔ اس کے انداز اور اٹھان کی بنیاد ہی بالکل الگ ہے وہ تو موجودہ تعلیمی حالت میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو استادوں شاگردوں اور سرپرستوں میں نئی زندگی اور نئی روح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس نصاب میں نفس مضمون سے واقفیت بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے اس میں بہت سی باتیں نئی ہیں۔ میٹرک تک ان میں سے کئی باتیں نہیں بتلائی جاتی ہیں پہلی اور دوسری ہی جماعت میں کئی باتیں ایسی ہیں جن کو پڑھانے والے نہیں جانتے اس میں تو سبھی کو دقت ہوتی ہے کہ ان باتوں کو چھوٹے چھوٹے بچوں کے سامنے کس طرح پیش کیا جائے اور ان کا سلسلہ کس طرح شروع کیا جائے۔ دوسری طرف اس تمام نصاب کے پڑھانے میں ان تمام

باتوں کا خیال رکھنا ہے جن پر نصاب میں زور دیا گیا ہے اگر پڑھانے کے دوران میں نصاب کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا گیا تو محض واقعات اور حالات کا بچوں کو بتلا دینا بالکل بے سود ہوگا۔ نصاب میں جو باتیں رکھی گئی ہیں وہ چند مقاصد کے ماتحت رکھی گئی ہیں۔ اگر نفس مضمون کے پیش کرنے کے دوران میں یا اس کے بعد وہ مقاصد نہیں حاصل ہوئے تو محض مجوزہ باتوں کا پیش کر دینا بالکل بے سود ہوگا۔ لہذا پڑھانے والے ان مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔

مربوط پڑھائی کا خیال تو ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بالکل نیا ہے پہلی دونوں صورتوں میں تو کچھ نہ کچھ کامیابی ہو جاتی ہے لیکن ربط کے تصور ہی سے بڑی پریشانی ہوتی ہے بعض لوگ تو اس کو بالکل مہمل سی بات سمجھتے ہیں اور نہ جاننے والوں کے لئے واقعی بالکل مہمل بات ہے جن لوگوں نے بالکل سیدھے سادے طریقہ سے تعلیم حاصل کی ہے اُن کے لئے یہ بات بالکل نئی ہے۔ تمام نصاب کو حرفہ، سماجی ماحول اور قدرتی ماحول میں سمو دیا جائے بالکل نیا خیال ہے (صرف ہندوستان میں) ہم جو دوسروں کے کئے ہوئے تجربہ پر انحصار کرتے ہیں اور اپنا کوئی تجربہ نہیں کرتے محض عقلی دلائل کی طاقت پر ہر نئی بات کو مہمل ہی خیال کرتے ہیں۔ یا مان تو لیتے ہیں لیکن بغیر سمجھے بوجھے کرتے ہیں۔ نئی تعلیم کے کام کرنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو قدرتی ماحول، اور سماجی ماحول کو نہیں سمجھتے اور سمجھیں کیسے جبکہ ہمارے ذہن تاریخ جغرافیہ، مدنیات مطالعہ قدرت، مطالعہ اشیاء اور حفظان صحت کے عنوانات میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہمیں یہ نام نامانوس سے معلوم ہوتے ہیں اور پھر ان سے ربط دے کر کسی مضمون کو پڑھانا بالکل عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اخبارات، رسالوں، جلسوں اور ٹریننگ اسکولوں میں بار بار اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ پھر بھی اس بات میں بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی دو اُستاد اس کو ایک طریقہ پر نہیں سمجھتے اور نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہے؟ جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کی تعلیم و تربیت بالکل مختلف ہے اور اس طریقہ کے سمجھنے کے لئے کمزور ہے اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ میں ہر تعلیمی تحریک میں کم و بیش ایک قسم کی یکسانیت ضرور پائی جاتی ہے اور کام کرنے والے اس طریقہ کے تمام اصولوں کی ایک حد تک پابندی کرتے ہیں اور تجربہ کے بعد اختلاف پیش کرتے ہیں اور پہلے اصولوں کو تجربہ کی روشنی میں بدلتے ہیں لیکن ہم اصولوں کو بدل بدل کر

تجربہ کرتے ہیں کسی ایک اصول کو پیش نظر رکھکر تجربہ نہیں کرتے۔ ہم پہلے سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اصول صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اپنے وضع کئے ہوئے اصولوں کے مطابق تجربہ کرتے ہیں اور جب ناکام ہوتے ہیں تو سارا الزام اسکیم کو دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں پڑھانے والوں میں چند خاص خوبیوں کا ہونا ضروری ہے ورنہ ہمارا کام ہر پھر کر موجودہ مدارس کے طریقہ کار کی طرح ہو کر رہ جائے گا۔ سب سے ضروری بات یہ ہونا چاہئیے کہ جو استاد نئی تعلیم کا کام کر رہے ہوں وہ یہ سمجھیں کہ وہ ایک قومی کام کر رہے ہیں جس میں ذاتی مفاد کو بڑی حد تک قربان کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس خیال سے وہ قومی تعلیم کا کام نہیں کر رہے تو اُن کے کام میں وہ خوبی اور وہ زور نہیں ہوگا جو ہونا چاہئے۔ نئی تعلیم کی روح کو قائم رکھنے کے لئے بھی اس بات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہی وہ بنیادی خوبی ہے جس سے طلبا میں وہ ذہنیت نہیں پیدا ہوگی جو آج کل کی مروجہ تعلیم سے پیدا ہو رہی ہے اور جس سے قوم کا ہر طرح نقصان ہو رہا ہے۔ جو استاد اس خیال سے کام کریں گے ان کے کام میں بیدلی نہیں پائی جائے گی اور خاص امنگ کے ساتھ کام ہوگا اور اگر کام کرتے کرتے کبھی ناکامیابی ہوگی تو استاد کبھی ہمت نہیں ہارے گا۔ اکثر کام کرنے والوں کو میں تنخواہ کی کمی کی شکایت کرتے سنتا ہوں۔ قومی کام کرنے والوں کو یہ شکایت نہیں کرنی چاہئے۔ ہندوستان میں جب تک تعلیم کے لئے حکومت کافی روپیہ خرچ نہیں کرتی اور قومی مدارس میں اس کے لئے کافی روپیہ فراہم نہیں ہوتا استادوں کا تنخواہ کی کمی کی شکایت کرنا فضول ہے اس سے کام بھی خراب ہوتا ہے اور کوئی نتیجہ بھی نہیں نکلتا یعنی تنخواہ کے معیار بڑھنے کی کوئی سبیل نہیں نکلتی اور کام برائے نام ہوتا ہے ہیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ ہمارے ملک میں اب سے پچاس ساٹھ سال پیشتر جو لوگ مکتبوں، مسجدوں اور پاٹشالوں میں درس اور تدریس کا کام کرتے تھے ان کو صرف دو وقت کا کھانا محلہ کے لوگوں سے ملتا تھا۔ اور سال میں محلہ کے لوگ ہی کچھ کپڑے بنوا دیا کرتے تھے۔ انعام و اکرام عیدی، تہواری سے ان کے پاس تھوڑی سی رقم جمع ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں کو بھیج دیا کرتے تھے۔ جس ملک میں استاد کے گذارے کی یہ صورت رہی ہو۔ وہاں تنخواہ کا معیار بڑھتے بڑھتے بڑھے گا۔ ابھی تو استاد کی تنخواہوں کی طرف لوگوں کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور بعض بعض صوبوں میں پرائمری اسکول کے پڑھانے

والوں کو صرف تین روپے ماہوار ملتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اپنے تعلیمی کام کو تنخواہ کی کمی بیشی سے ناپنا کچھ بیجا سا ہے اور ایسی حالت کی شکایت کرنا ہے جو اپنے بس میں نہیں ہے۔ اگر نئی تعلیم کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کا خیال ہے اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی کچھ تعلیمی تجربے ہوں اور دوسروں کی تقلید ہی تقلید نہ ہو تو قومی اسپرٹ سے کام کئے جائیے اور اس اسکیم کو کامیابی کی طرف بڑھانے میں نمایاں حیثیت حاصل کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جن مدارس میں استاد تنخواہوں کا خیال کئے بغیر نئی تعلیم کے کام کو کر رہے ہیں۔ ان میں اس اسکیم کو کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ناکامیوں پر قابو پانے کے لئے نئی نئی ترکیبیں سوچی گئی ہیں اور اس طرح نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ ان کے کام میں زندگی پائی جاتی ہے بے دلی نہیں ان مدرسوں کے استادوں نے اس اسکیم کو اچھی طرح چلانے کے کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ گو ایسے مدرسے ملک میں ابھی کم ہی ہیں لیکن ایسے مدرسوں ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نئی اسکیم کی ہر خوبی اپنے اندر پیدا کر سکیں گے اور ہر بات کے ممکن ہونے یا نہ ہونے کا صحیح ثبوت پیش کر سکیں گے جس خیال کو میں نے پیش کیا ہے۔ اس خیال کے استاد ملک میں بہت تھوڑے ملیں گے اور ان کی خاطر خواہ ہمت افزائی بھی نہیں ہو رہی ہوگی جو تنخواہ کا بدل ہو سکتی تھی لیکن نئی اسکیم کو کامیابی سے چلانے کے لئے ایسے ہی استادوں کی ضرورت ہے جو تمام حادثات کو برداشت کر سکیں اور کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا ہونے دیں۔ نئی اسکیم کے استادوں کے لئے یہ ایک بنیادی خوبی ہے۔

اس کے علاوہ استادوں میں تعلیمی سوجھ بوجھ کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ تعلیمی کام سے پڑھانے والے کی طبیعت کو قدرتی لگاؤ ہو۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں بھی تعلیمی مسائل پر غور کرتے ہوں اور ان کے حل کے متعلق سوچتے ہوں تعلیمی سوجھ بوجھ کا ملکہ بعض استادوں میں بالکل قدرتی ہوتا ہے اور ٹریننگ سے اس میں خاص جلا ہو جاتی ہے لیکن جن لوگوں کو تعلیمی کام کاج سے قدرتی لگاؤ نہیں ہوتا ٹریننگ سے ایک حد تک اس کمی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وہ بات پیدا نہیں ہوتی جن لوگوں کی طبیعتوں کو تعلیمی کام کاج سے بالکل مناسبت نہیں ہے ان کا اس اسکیم کے چلانے کی ذمہ داری لینا محض اس خیال سے کہ اس بیکاری کے زمانہ میں کوئی اور کام نہیں ملتا تو تعلیمی کام کرنے لگیں مفید نہ ہوگا۔ ٹریننگ لیکر بھی کوئی خاص

بات پیدا نہیں ہوگی خواہ ایسے استاد ایثار و قربانی کے مجسمہ ہی کیوں نہ ہوں ان کے ایثار اور قربانی سے اس اسکیم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا جہاں تک درس و تدریس کا تعلق ہے ایسے استادوں کو اپنے کام میں کوئی لطف نہیں آئے گا بلکہ بیدلی ہی بیدلی نظر آئے گی بالکل بے نتیجہ کام ہو رہا ہوگا۔

تیسری اہم بات استادوں کے لئے یہ ہے کہ وہ نئی اسکیم کے نصاب سے پوری طرح واقف ہوں خواہ وہ نصاب پہلی جماعت کا ہی کیوں نہ ہو۔ نہ صرف نصاب سے واقف ہوں بلکہ نصاب کے پڑھانے اور پیش کرنے کے دوران میں جن ضروری مسائل کے پیدا ہونے کا امکان ہو ان سے بھی واقف ہوں پڑھاتے پڑھاتے کہیں سیر کا پروگرام آجاتا ہے یا مشاہدہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے اور بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو نصاب میں نہیں دیے جاتے ہیں لیکن استاد کی معلومات اس قدر وسیع ہو کہ وہ طلبا کے سوالات سے گھبرا نہ جائے۔ لاچار اور مجبور نہ ہو جائے بلکہ ان کی صحیح رہنمائی کرے۔ انھیں صحیح طریقہ پر مشاہدہ اور سیر کرائے اور پوری طرح فائدہ اٹھانے دے۔ استاد نہ صرف واقف ہوں بلکہ اسے پڑھانے کے گر بھی اچھی طرح جانتے ہوں۔ بعض ایسے استاد دیکھنے میں آئے ہیں جو نصاب کے متعلق بہت وسیع معلومات رکھتے ہیں لیکن وہ طلبا کو بتلانے اور سمجھانے سے واقف نہیں ہوتے۔ کبھی ڈسپلن خراب ہوتا ہے کبھی اس قدر وسیع معلومات دیتے ہیں کہ طلبا سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کبھی معلومات اس قدر خشک طریقہ سے پیش کی جاتی ہے کہ طلبا بددل ہو جاتے ہیں اور استاد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے وسیع معلومات سے ایسے اچھے نوٹ ترتیب دے کر طلبا کو لکھاتے ہیں کہ طلبا لکھتے لکھتے اور انہیں دوبارہ نقل کرتے کرتے اُکتا جاتے ہیں اور امتحان کے موقع پر انہیں ایک مصیبت سمجھ کر یاد کرتے ہیں لیکن پھر بھی یاد نہیں ہوتے۔ یہ سب طریقۂ تعلیم کے نہ جاننے کے نتائج ہیں۔ ایسے استاد بھی ہیں جو نصاب سے تو تھوڑی واقفیت رکھتے ہیں مگر پڑھانے کے گر سے ایسے واقف ہوتے ہیں کہ طلبا میں سمجھ پیدا کر دیتے ہیں انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کر دیتے ہیں طلبا سے مشورہ کر کے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں کہ طلبا تمام پڑھائی میں جان محسوس کرتے ہیں۔ وہ مضمون زیر بحث کے متعلق مواد فراہم کرنے کا شوق پیدا کر دیتے وہ اپنے طریقہ سے پڑھائی کو با مقصد بنا دیتے ہیں۔

بہرحال نفس مضمون سے واقفیت کے ساتھ ساتھ طریقۂ تعلیم سے بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہئے کیونکہ تعلیمی میدان میں یہ بات زیادہ ضروری ہے۔ اس سے نصاب کی دشواریاں بھی حل کی جا سکتی ہیں اور طلبا کو صحیح رہنمائی بھی دی جا سکتی ہے۔ نئی تعلیم میں تعلیم کے گروں کا جاننا اور استعمال کرنا اتنا ہی ضروری ہو جتنا پرانے طریقوں میں اس کا نہ جاننا اور نہ استعمال کرنا، پرانے طریقۂ تعلیم میں امتحان، مار دھاڑ، سرپرستوں کے خوف و تنبیہ سے کچھ نہیں تو چالیس فی صدی نتیجے تو نکل ہی آتے ہیں لیکن نئی تعلیم میں اس قسم کی سرزنش اور لگاؤ کی اجازت نہ ہوگی۔ یہاں تو سرپرست اس کی شکایت کریں تو انھیں سمجھانے کی ضرورت ہوگی کہ وہ تعلیمی معاملات میں مار پیٹ کو روا نہ رکھیں اس سے بچے کی ساری اپج ختم ہو جاتی ہے۔ نئی تعلیم میں تو طریقۂ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی ضرورت ہوگی۔ اس میں تعلیم کے نئے نئے گروں کو استعمال کر کے اور پرانے تمام طریقوں سے قطع نظر کر کے سو فی صدی نتائج کی توقع کی جائے گی اس لئے یہ کام پہلے سے زیادہ کٹھن ہوگا۔

تعلیم کے اچھے طریقے اور گر ٹریننگ اسکولوں میں ہی نہیں سیکھے جاتے۔ یہ طریقے طلبا میں اٹھنے بیٹھنے اور ان سے گفتگو کرنے ان کے مسائل سمجھنے تعلیم کو ان کی طبیعتوں کے مطابق بنانے، ان کی دقتوں کو رفع کرنے اور طلبا کے ہو رہنے میں ہی حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم نے کبھی کسی ٹریننگ اسکول میں تعلیم نہیں پائی۔ زیادہ لوگ ایسے ہوئے جنھوں نے خود طلبا کے لئے مدارس کھولے۔ ان میں تعلیم دی تجربے حاصل کئے اور ان تجربوں کا ریکارڈ رکھا اس طرح تعلیمی اصول ترتیب دیئے جن سے ہم آج فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں استادوں کی تربیت کا مخالف ہوں لیکن اس کی اہمیت اس تجربہ کے آگے کچھ بھی نہیں ہے جو پڑھانے والے مدرسہ میں اپنی لگاتار محنت سے حاصل کرتے ہیں استاد کی ٹریننگ تو صرف اس بات کی سند ہے کہ آپ کو تعلیمی تجربے کرنے کے گر ایک حد تک بتلا دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا ٹرینڈ مدرسین اگر اپنے کام کا ریکارڈ نہیں رکھتے، اپنے تجربوں کو قلم بند نہیں کرتے اپنے سوچے ہوئے طریقۂ تعلیم کو لکھتے نہیں تو وہ نئی تعلیم کے لئے مفید نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کام کرنے کے لئے اس کی ضرورت اور بھی مسلم ہے۔ ہندوستان میں تعلیمی تحریک کا آغاز ابھی چند سال ہوئے ہوا ہے۔ اس لئے پہلے

پہلے ہمارا تقلیدی دور تھا۔ دوسروں کا ہر تجربہ پسند آتا تھا اور اپنی ہر بات بے اصول معلوم ہوتی تھی۔ لہذا اگر ہمیں دوسرے ممالک کے مدارس کے برابر کوئی اہمیت حاصل کرنی ہے تو اپنا کوئی سرمایہ جمع کرنا چاہئے خواہ وہ کتنا ہی نامکمل کیوں نہ ہو۔

تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے بچوں کی طبیعتوں اور ان کی عادتوں سے واقف ہونا بھی بہت ضروری ہے اور حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینے کے لئے اس کی ضرورت اور بھی مسلّم ہے۔ حرفوں کے کرانے کے دوران میں جو جوش اور یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اُس سے بہتر طریقہ پر فائدہ اٹھانے کے لئے استاذ کو بچوں کی طبیعتوں میں کافی دخل ہونا چاہئے۔ وہ اس سے بخوبی آگاہ ہو ورنہ دقت پر اس سے فائدہ نہ اٹھانے سے تمام جوش اور دلچسپی کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس بات کے سمجھنے اور استعمال کرنے سے نہ صرف تعلیم بہتر طریقہ پر دی جاسکتی ہے بلکہ بچوں کی انفرادی نشو ونما صحیح اور بہتر طریقہ پر ہوسکتی ہے۔ جو استاد بچوں کے کام کا ریکارڈ برابر رکھتے ہیں، بچوں کے رجحانات کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور اپنے طریقوں کو اُن کی طبیعتوں کے مطابق استعمال کرتے رہتے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ بچوں کی طبیعتوں سے واقف ہو جاتے ہیں ٹریننگ اسکولوں میں اس بات پر کافی زور دینا چاہئے۔ وہاں اس کو مرکزی جگہ ملنی چاہئے۔ اس کے لئے کتابیں اور عملی طور پر مشاہدہ کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے بیشتر استادوں میں اس فن کی کمی ہے۔ جانتے ہیں لیکن استعمال نہیں کرسکتے۔ طریقۂ تعلیم کے موثر طریقہ پر استعمال ہونے کی صورت جب ہی ہوسکتی ہے جب استاد بچوں کی طبیعت سے بخوبی واقف ہو۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ استاد اپنے طریقہ سے اسباق کو بہتر طریقہ پر ترتیب دیں۔ مواد جمع کریں (Teaching Aids.) بنالیں لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بچے اسباق کے سیکھنے کی طرف مائل نہ ہوں اور اس طرح استاد کی تمام کوششیں بیکار جائیں لہذا استاد کو بچوں کی طبیعت سے بخوبی واقفیت ہونی چاہئے۔

میں نے چند نہایت ضروری باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اُن خوبیوں کو بیان کیا ہے جو نئی تعلیم کے پڑھانے والوں میں ہونی چاہئیں میں نے عمداً ان خامیوں کو نہیں بیان کیا ہے جو اس قسم کی تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے استادوں میں ہوتی ہیں۔ آخری خوبی صرف یہ ہے۔ جو استاد نئی تعلیم کا کام کر رہے

ہیں وہ کئی حرفے جانتے ہوں۔ حرفوں کو اس طرح جانتے ہوں کہ بچوں کو اچھی طرح سکھلا سکتے ہوں۔ اگر استاد کئی حرفے جانتے ہیں لیکن ایک جماعت کے تیس پینتیس لڑکوں کو سکھلانے میں انھیں بڑی دقت ہوتی ہے اور اس اسکیم میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ کہ اتنے بچوں کو بیک وقت کوئی دستکاری کس طرح سکھائی جائے اس کے متعلق تجربہ کے بعد ہی کوئی صورت تجویز کی جا سکتی ہے لیکن جو استاد نئی تعلیم کا کام کر رہے ہیں انھیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ بچوں کو حرفہ کس طرح سکھلانا چاہیئے اس لئے کہ بڑے طلبا کو کوئی دستکاری سکھانے کے مقابلہ میں بچوں کو سکھلانا بہت دشوار کام ہے اور اس صورت میں جبکہ اس سے تعلیمی فائدہ بھی حاصل کرنا ہو۔ اگر تعداد کا مسئلہ نہ بھی ہو پھر بھی بچوں کو سکھلانے کا مسئلہ اپنی جگہ پر خود بھی بہت اہم ہے۔ دستکاری جاننے اور بچوں کو سکھلانے کے ساتھ ساتھ اُستاد حرفوں سے جہاں تک ممکن ہو تمام مضامین کے پڑھانے میں مدد بھی لے سکتا ہو۔ حرفوں کے کرانے میں جتنا تعلیمی کام ہو سکتا ہو اسے کرا سکتا ہو۔ حرفوں کے ذریعہ تعلیم بامعنی اور بامقصد بنا سکتا ہو طلبا کو جتنی خوشی، جتنا حوصلہ اور جتنا جوش حرفہ کرنے میں ہوتا ہے وہی خوشی وہی حوصلہ اور وہی جوش تعلیم کے حصول میں بھی پیدا کر سکتا ہو۔ حرفہ علیحدہ اور تعلیم علیحدہ کی صورت نہ پیدا ہونے دے بلکہ حرفوں کو تعلیم کا ذریعہ بنا سکتا ہو۔ وہ محض تصورات کی دنیا میں نہ ہو کہ تمام تعلیم حرفہ کے ذریعہ ہو رہی ہے حالانکہ دراصل ایسا نہ ہو۔

سید احمد علی

جامِ صہبائی

(۱)
جب ظلمت غم سے روشنی ملتی ہے
جب درد و الم سے بےخودی ملتی ہے
اک یہ بھی مقام عشق ہے اے ہمدم!
جب موت سے صبح زندگی ملتی ہے

(۲)
یہ گردش صبح و شام ہے میرے لئے
یہ محفل خوش نظام ہے میرے لئے
گلہائے بہار ا مہر و ماہ و انجم!
اے دوست یہ اہتمام ہے میرے لئے

(۳)
دشت دو جہاں ہے میرے بڑھنے کیلئے
ہے عرش کا بام میرے چڑھنے کیلئے
فطرت کا صحیفۂ مقدس اے دوست!
ہر وقت کھلا ہے میرے پڑھنے کیلئے

(۴)
حق کوش ہوں حق کی راہ پر جاتا ہوں
دشوار گزار ہے، گر جاتا ہوں
ہر گام پہ روکتا ہے باطل مجھ کو
ٹھکرا کے اسے اثرؔ گزر جاتا ہوں

(۵)
ہر گام پہ سنگ رہ پاتا ہوں اسے
ٹھکرا کے مگر پرے ہٹاتا ہوں اسے
کر دیتا ہوں پاش پاش باطل کی چٹان
یا ہو کے بلند پھاند جاتا ہوں اسے

(۶)
اغیار سے بے نیاز کر دے یارب!
کاسہ مرا تو آپ ہی بھر دے یارب!
بار غم دو جہاں اٹھا لوں ہنس کر
وہ عزم وہ ہمتِ جگر دے یارب!

(۷)
ہے تیزیٔ راہرو کو منزل کی تلاش
بے تابی موج کو ہے ساحل کی تلاش!
ہر نقش کو کیوں مٹا رہی ہے؟ شاید
فطرت کو ابھی ہے نقش کامل کی تلاش

(۸)
مستی میں یم وجد دلنشیں آتا ہے!
تنکے کو گماں ہے۔ اس سے ٹکراتا ہے!
فطرت کا تو کھیل ہے، مگر انساں کو
فکر و غم ہست و بود کھا جاتا ہے!

آثرؔ صہبائی

پیامِ زندگی

اُٹھ کہ پھر تاریکیٔ شب سے سحر پیدا کریں
موت کے سینہ سے ہستی کے شرر پیدا کریں

تلخیوں میں لذتِ شہد و شکر پیدا کریں
زہر میں پھر آبِ حیواں کا اثر پیدا کریں

پھر خس و خاشاک سے گلہائے تر پیدا کریں
خاکِ بے مایہ سے پھر لعل و گہر پیدا کریں

دل تو ہے یک قطرۂ خوں گرم، دل کی اصل کیا
رنگِ خارا میں در آئے وہ نظر پیدا کریں

جس کی ضو سے جگمگا اٹھے شبِ تارِ حیات
توڑ کر مہر و ستارے وہ قمر پیدا کریں

جو نہ ہو منزل پہ قائم جو نہ ہو سمتوں سے قید
کارواں میں وہ نئی روحِ سفر پیدا کریں

نرم اور سنگین راہوں سے گذرنے کے لئے
آنکھ شبنم کی تو ہیرے کا جگر پیدا کریں

کوہ ٹکرا دیں جو حائل ہوں کشت و کار میں
اس طلسمی گنبدِ بے در میں در پیدا کریں

لوچ میں موجِ نسیم اور کاٹ میں تیغِ اصیل
مکتبِ نو سے وہ طفلِ باخبر پیدا کریں

دے سکے انسان کو ہر قید و غلامی سے نجات
ذہن کی پکی ایسی اک نوعِ بشر پیدا کریں

زندگانی کی مسلسل چلچلاتی دھوپ ہیں
نزہت و رنگینیٔ موجِ گہر پیدا کریں

دم میں یہ سارا طلسمِ عہدِ حاضر ٹوٹ جائے
پنجۂ فولاد و ضربِ کارگر پیدا کریں

سست بنیادوں کو ڈھا کر اس جہانِ خام کو
اک جہانِ دیگر و پائندہ تر پیدا کریں

سروشؔ عسکری طباطبائی بی۔اے لکھنوی

خوابِ ہستی

وہ زمانے اور تھے جب تیرا غم سہتا تھا میں
جب ترے ہونٹوں کی رنگینی سے کچھ کہتا تھا میں
جب ترے بالوں سے گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا میں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

یک بیک بجلی سی چمکی اور نشیمن لٹ گیا
تو نے برسوں جس کو سینچا تھا وہ گلشن لٹ گیا
تو نے موتی جس میں ٹانکے تھے وہ دامن لٹ گیا
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

تجھ کو جس دل سے محبت تھی وہ اب دل ہی نہیں
رقص جس کا تجھ کو بھاتا تھا وہ بسمل ہی نہیں
رنگِ محفل تجھ سے کیا کہیئے وہ محفل ہی نہیں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

اب نہ وہ شوقِ تصور، اب نہ وہ ذوقِ فغاں
مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ عہدِ رفتہ کے نشاں
دھندلی دھندلی سی نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

یہ جوانی، یہ پریشانی، یہ پیہم اضطراب
بارہا انجمن میں دوڑتا ہوں سوئے جامِ شراب
بارہا گھبرا کے چھیڑا ہے گناہوں کا رباب
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

رنگِ صہبا اور ہے صہبا کی مستی اور ہے
ذکرِ ہستی اور ہے، احساسِ ہستی اور ہے
خوابِ ہستی اور ہے تعبیرِ ہستی اور ہے
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

معین احسن جذبی

غزل

آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی جگا کر چلے گئے

حسن ازل کی شان دکھا کر چلے گئے
اک واقعہ سا یاد دلا کر چلے گئے

چہرے تک آستین وہ لا کر چلے گئے
کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

دے کر خود اپنے ہاتھ سے اک درد لا دوا
میری خودی کو ہوش میں لا کر چلے گئے

سمجھا کے پستیاں مرے اوج کمال کی
اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

اپنے فروغ حسن کی دکھلا کے وسعتیں
میری حدود شوق بڑھا کر چلے گئے

شکر کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول
اپنا سا مجھ کو کیوں نہ بنا کر چلے گئے

آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کے واسطے
اک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے

آئے تھے چشم شوق کی حسرت نکالنے
سر تا قدم نگاہ بنا کر چلے گئے

اب کاروبار عشق سے فرصت مجھے کہاں
کونین کا وہ درد بڑھا کر چلے گئے

میری حیات عشق کو دے کر جنون شوق
مجھ کو تمام ہوش بنا کر چلے گئے

لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگرؔ
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے

جگر مرادآبادی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سازو آہنگ :- از مولنا سیاب اکبر آبادی۔ ملنے کا پتہ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ سائز ۱۷x۲۷/۸ صفحات ۲۰۴ یمت مجلد سے روپے۔ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ مولنا سیاب کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ کل نظمیں پانچ حصوں میں منقسم ہیں (۱) قومیت سیاست، وطنیت، مذہب، اخلاق، معاشرت (۲) شعر و حکم (۴) معتقدات (۵) بچوں کے لئے۔

اب تک ہم مولنا سیاب کو محض غزلگو شاعر کی حیثیت سے جانتے رہے ہیں اور وہ بھی پرانے اسکول کے یعنی جہاں الفاظ ہمیشہ معانی پر فوقیت اور برتری رکھتے ہیں۔ سیاب صاحب کے یہاں ان کی غزلیات میں یہ چیز بہت ملتی ہے۔ ان نظموں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر پرانے اسکول کا کوئی شاعر نظم گو ہو جائے تو اس کا کیا رنگ ہوگا۔ جہاں تک قادر الکلامی، الفاظ کی نشست، قوافی کی درستگی، صناعی کا تعلق ہے مولنا سیاب اپنی مشق سخن کے باعث کافی اونچے درجوں پر پہنچ چکے ہیں۔ نظمیں انھوں نے زمانے کا رنگ دیکھکر لکھنا شروع کیں۔ اس میں انھوں نے پیامات بھی دیئے ہیں اپنے احساسات کی تیزی بھی دکھائی ہے۔ ہر قسم کی اور ہر رنگ کی نظمیں لکھی ہیں لیکن ابھی معانی پر سے وہ الفاظ کی چادر نہیں اٹھی ہے اقبال کی نقل ہے لیکن قابلیت نہیں پیدا ہوئی ہے۔ پھر بھی ہم مولنا سیاب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے یہ رنگ اختیار کیا۔ نظمیں ان کی غزلوں سے یقیناً بہتر ہیں۔ آئندہ بھی اگر آپ نظمیں لکھتے رہے تو امید ہے سوز و گداز بھی پیدا ہو جائے گا۔ کچھ کام کی باتیں بھی کہہ سکیں گے اور ان کا وہ غزلوں والا تصنع اور خالی لفظی سجاوٹ بھلے کو دور ہو جائے گی۔ پیش نظر نظموں میں بعض بعض بہت اچھی ہیں۔ امید ہے شائقین اس مجموعہ سے لطف اٹھائیں گے۔

حیات و غزلیات غالب (بہ زبان انگریزی) از عبداللہ انور بیگ ایم۔ اے ایل ایل بی مطبوعہ اردو اکاڈمی لاہور۔ سائز ۲۲x۱۸/۸ صفحات ۱۸۰ قیمت ۱ روپیہ کاغذ و طباعت بہت عمدہ مع سہ تصاویر غالب

کے اشعار سے متعلق ہیں،

اردو اکاڈمی لاہور نے غالب کی زندگی اور کلام کو انگریزی داں طبقے میں اس کتاب کے ذریعہ روشناس کرانے کی کوشش کی ہے مقصد یہ ہے کہ ہمارے شاعری کے بہترین خوش گو شاعر سے غیر زبان والے بھی لطف لے سکیں۔ شروع میں جان کلایو روسے کا دیباچہ ہے۔ موصوف غالب کے کلام سے متاثر یا واقف نہیں معلوم ہوتے اکاڈمی مذکور کے خلوص نیت سے تو ہرگز انکار نہیں ہو سکتا لیکن افسوس ہے کہ انور بیگ صاحب اس کار عظیم میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جہاں تک حیات غالب کے حصے کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ غالب نامہ کی بدولت انھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور غالب کی زندگی اور ان کا زمانہ خاصی اچھی طرح پیش نظر ہو جاتا ہے۔ کلام کے انتخاب اور ترجمے میں البتہ خامیاں ہیں۔ اول تو انتخاب میں صرف ان اشعار کو لینا چاہئے تھا جن میں مطالب کی خوبی ہے اور جن میں الفاظ کی صناعی ہے یا لفظی دروبست کی خوبی ہے یا وہ اشعار جو انھوں نے فارسی نما اردو میں لکھے ہیں انھیں ہاتھ نہ لگانا چاہئے تھا اور اگر ایسا کیا بھی تھا تو بالکل لفظی ترجمہ نہ ہوتا جس سے نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آتا بلکہ غالب کی طرف سے سوء ظنی پیدا ہونے لگتی ہے۔ انتخاب میں اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے تھا کہ ہم ترجمہ جن لوگوں کے لئے کر رہے ہیں ان کا مذاق شعری کیا ہے اور کس رنگ میں وہ چیزیں دیکھنے کے عادی ہیں۔ پھر غالب کے تخیل کو انھیں کے رنگ میں پیش کرنا چاہئے تھا تاکہ وہ غالب سے لطف اندوز ہو سکیں مثال کے طور پر اس قسم کے اشعار نہ ہونا چاہئے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پاؤں ۔۔۔ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب ۔۔۔ تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

دوسری خرابی لفظی ترجمہ کی ہے۔ اول تو اس سے لطف آنا تو درکنار غالب کے معانی کا اندازہ ہی نہیں ہوتا شعر محض ایک چیستان معلوم ہوتا ہے اور بجائے حظ کے دردسر حاصل ہوتا ہے۔ ترجمہ اگر ایسا ہوتا کہ اچھی انگریزی کے ساتھ معانی کا لطف بھی خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والے پر کھل سکتا تو غالب کی صناعی اور معنوی خوبیاں انگریزی داں طبقہ پر خوب روشن ہو سکتی تھیں اور غالب کی قدر و قیمت بھی بڑھ سکتی تھی۔ بالکل لفظی ترجمہ کر دینے سے نہ تو غالب کے معانی کی خوبی ظاہر ہو سکی ہے نہ اس کی فن کاری۔ مثلاً ذیل کے اشعار کے معانی جو کچھ

انگریزی ترجمہ سے ظاہر ہوئے وہ محض صفر ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا　　یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

تیسری بات یہ کہ صرف یہی نہیں کہ ترجمہ اور انگریزی اچھی اور شاعرانہ نہیں ہے بلکہ بعض جگہ ترجمہ صحیح نہیں ہو سکا ہے کہیں الفاظ کا اور کہیں پورے مصرعہ یا شعر کا۔ مثلاً درج ذیل مصرعے اور اشعار کا ترجمہ مبہم اور غلط ہے۔

صـ ۸۵　کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

صـ ۸۶　سادگی و پرکاری، بیخودی وہشیاری

صـ ۸۸　دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھکو داغوں کی بہار

صـ ۱۳۰　تیری فرصت کے مقابل اے عمر

صـ ۱۳۴　گرم تماشا......................

صـ ۱۳۵　وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو　　وغیرہ

غرضکہ اغلاط بہت کافی ہیں اور بالکل لفظی ترجمے نے غالب کی اسپرٹ پر پانی پھیر دیا ہے۔ امید ہے اردو اکاڈمی آئندہ اڈیشن میں اس ظاہری خوبی کے ساتھ صحت اور ترجمہ کی خوبی کی طرف بھی بہت احتیاط برتیگی تاکہ غیروں کے ہاتھ میں ہماری جو چیز جائے وہ بہتر سے بہتر صورت میں ہو۔

متاع حرم:- از زیب عثمانیہ ملنے کا پتہ کریمی دواخانہ۔ بازار شیخوپورہ لودیانہ (پنجاب) سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۳۴۳، قیمت ایک روپیہ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

زیب عثمانیہ صاحبہ لودیانوی کی نظمیں عرصہ سے رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ آپ کی نظمیں اپنی سادہ بیانی اور پاکیزگی خیال کے باعث خاص اثر رکھتی ہیں۔ پوری کتاب باعتبار موضوع تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے (۱) چمن گل (۲) نیستان نالہ (۳) خمخانہ۔ پہلے حصے میں چھوٹی چھوٹی ادبی نظمیں ہیں مثلاً پھولوانہ، سرو، لالہ، غنچہ وغیرہ دوسرے حصے میں اصلاحی نظمیں ہیں جو قوم کی خاطر لکھی گئی ہیں تیسرے حصے میں

عام تغزل کے رنگ کا کلام ہے۔ محترمہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا شعر کوئی نہ کوئی نکتہ اپنے اندر ضرور لئے ہوئے ہوتا ہے کوئی نہ کوئی پیغام وہ ضرور دینا چاہتی ہیں۔ اقبال کا اثر اور تقلید ہر جگہ کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کلام تفریح یا دلچسپی کی خاطر نہیں لکھا گیا ہے۔ ہمیشہ اصلاح پیش نظر رکھتی ہیں۔ ان کا آرٹ ہمیشہ مقصد کے زیر تحت رہتا ہے اسی لئے زیادہ تر ان کا اسلوب ناصحانہ رہتا ہے۔ یہ چیز ایک شاعر کے لئے ناقص اور ایک معلم کے لئے قابل تعریف ہے۔ اقبال کے آخری دور کے کلام کا اثر زیب صاحبہ نے زیادہ لیا ہے بہ نسبت ان کے ابتدائی کلام کے۔ اسی لئے شعریت ان کے یہاں کم ہے نصیحت زیادہ ہے۔ پھر بھی پختگی اور روانی کلام کو بلندی پر رکھتی ہے۔ جو قابل ستائش چیز ہے

کملا:۔ مترجمہ راجہ مہدی علی خاں۔ ملنے کا پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔ سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ صفحات ۲۳۱، قیمت مجلد عہ، کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ بنگالی زبان کے ایک مشہور ناول "بارواری" کا اردو ترجمہ ہے۔ 'بارواری' کی تیاری میں بارہ مختلف مصنفوں نے حصہ لیا تھا۔ ترجمہ آزاد صاف اور شگفتہ ہے۔ ناول کا پلاٹ ذرا پیچیدہ ہے اور کوئی ندرت نہیں لیکن جب زیادہ لکھنے والے ہوں تو عموماً ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ پھر بھی بنگالی ہندو سماج کے بعض بعض اچھے مرقعے ملتے ہیں۔

ضیغم ایران رضا شاہ پہلوی:۔ مرتبہ انعام اللہ خاں ناصر۔ ملنے کا پتہ کامل بکڈپو لاہور، سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ صفحات ۱۰۴، قیمت مجلد عہ، کاغذ کتابت اور طباعت معمولی۔

افسوس ہے کہ رضا شاہی دور ایران میں ختم ہو گیا اور حکومت کی بے بسی اور بے چارگی تمام دنیا نے دیکھ لی۔ کہاں تک یہ بے چارگی بد انتظامی کا نتیجہ تھی یہ ابھی صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ مسلم ہے کہ رضا شاہ نے موجودہ ہوا کا رخ نہ پہچانا جس کی بدولت ملک کو غیروں کے سپرد کر کے گوشہ نشین ہونا پڑا حالانکہ موجودہ واقعات اس کتاب میں نہیں آسکے ہیں پھر بھی ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانے سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کے حالات مختصراً دیئے گئے ہیں۔ ترتیب خاصی ہے عام معلومات کے لئے اچھی کتاب ہے

دوسری جنگ عظیم:۔ مرتبہ محمد مرزا دہلوی۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی، سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۱۲}$

صفحات ۳۰۴، قیمت مجلد عہ کاغذ کتابت اچھی، طباعت معمولی۔

محمد مرزا صاحب نے اس کتاب میں صرف موجودہ جنگ عظیم کے حالات ہی نہیں پیش کئے ہیں بلکہ پہلی جنگ عظیم کے اسباب اور اس کے بعد کے اثرات کی بدولت یورپ کی سیاست کی جو حالت ہو گئی اور جن کے باعث موجودہ جنگ وقوع میں آئی۔ ان سب کا محاکمہ بڑی لیاقت سے کیا ہے جنگ اور اس کا پس منظر سمجھنے سے حالیہ حقیقتیں تمام روشن ہو جاتی ہیں۔ زبان و بیان کی پختگی اس کے علاوہ ہے

خطوط غالب :۔ مرتبہ مہیش پرشاد صاحب۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد۔ سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ صفحات ۴۸۴ قیمت للعہ مجلد صہ کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

اب تک غالب کے خطوط محض دو جلدوں یعنی عود ہندی اور اردوئے معلیٰ کے نام سے چھپے تھے لیکن ان میں بہت سے اغلاط تھے نیز ان میں تاریخیں موجود نہیں تھیں منشی مہیش پرشاد صاحب نے تمام وہ خطوط نیز نواب رامپور کے خطوط اس کے علاوہ جو مستند رسالوں میں نکل چکے ہیں اور جو کچھ اب تک شائع نہیں ہو سکے ان سب کو بڑی سعی اور کاوش سے تلاش کر کے مرتب کیا ہے۔ ہندوستانی اکاڈمی انھیں دو جلدوں میں شائع کر رہی ہے۔ یہ پہلی جلد ہے اس پر نظر ثانی عبدالستار صدیقی صاحب نے کی ہے اور انھوں نے بہت سے مفید حواشی اس پر اضافہ کئے ہیں۔ غالب کے خطوط اور لفافے کی عکسی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں مکاتیب غالب عرشی کے بعد غالب کے خطوط پر یہ دوسری مستند کتاب شائع ہوئی ہے جس پر مصنف اور ناشرین دونوں لائق مبارکباد ہیں۔

آزادی ہند :۔ از مہاتما گاندھی ملنے کا پتہ شری گاندھی سیوا آشرم بکڈپو۔ ۴ کورٹ اسٹریٹ لاہور سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۴۴ قیمت ۶ر کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ کتاب دراصل انڈین ہوم رول کا ترجمہ ہے یعنی وہ مضامین ہیں جو گاندھی جی نے افریقہ میں لکھے تھے اور جب وہاں ستیہ گرہ کی تحریک میں مصروف تھے۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے حالانکہ اسے لکھے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ پھر بھی سیاسیات ہند کے مطالعہ کرنے والوں کو اس میں اپنے مطلب کی بہت سی چیزیں ملیں گی اور بہت اچھی چیزیں ملیں گی

دکھی دنیا:۔ از راجگوپال صاحب اچاریہ۔ ملنے کا پتہ شری گاندھی سیوا آشرم بکڈپو، نمبر ۱۲ کورٹ اسٹریٹ لاہور۔ صفحات ۱۴۴ قیمت ۸؍ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

گاندھی سیوا آشرم کی یہ دوسری اشاعت ہے راجگوپال صاحب اچاریہ صرف سیاست ہی کے مرد میدان نہ تھے بلکہ اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تصنیف سے بھی شوق ہے۔ دکھی دنیا دراصل سات چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا مجموعہ ہے جو کانگریس کے تعمیری پروگرام کی اہمیت اور ان کا اثر دکھانے اور پھیلانے کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ حالانکہ مصنف کا اسلوب تو ان میں نہیں آسکا پھر بھی اثر اور درد سے یہ ہماری زندگی کی کہانیاں خالی نہیں۔

کیا خوب آدمی تھا:۔ ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی۔ سائز ۲۲×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۰ قیمت ۸؍ کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے "یادِ رفتگاں" کے سلسلے میں متعدد تقریریں مختلف لوگوں سے کرائی تھیں۔ اسی سلسلہ کی گیارہ تقریروں کو حالی پبلشنگ ہاؤس نے زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے۔ جن مرحومین پر تقریریں کی گئی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا راشد الخیری، حالی، نذیر احمد، چکبست، داغ، پریم چند، حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری، اقبال، سر راس مسعود۔ مولانا محمد علی۔ جن لوگوں نے تقریریں کیں ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ ملا واحدی۔ خواجہ عبدالمجید دہلوی۔ مولوی عبدالرحمٰن۔ پنڈت کیفی۔ بیخود دہلوی بے نندر کمار حکیم ذکی محمد غالب دہلوی۔ ممتاز حسین۔ خواجہ غلام السیدین اور مولانا عبدالماجد۔

یہ تمام تقریریں باوجود یکہ مختصر ہیں لیکن مرحومین کی زندگی اور سیرت پر بڑی اچھی روشنی ڈالتی ہیں ناشرین کتاب گھر لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے یہ مفید و دلچسپ چیز طبع کردی۔ اگر دوسرے ایڈیشن میں ان ہی حضرات سے ان ہی مرحومین پر ذرا تفصیل سے یادگاریں لکھوانے کا التزام کیا جاسکے تو وہ اور بھی دلچسپ ہوگا کیونکہ ریڈیو پر وقت کا اختصار ہی کھول کر کہنے نہیں دیتا۔ دنیا فانی ہے کون کس وقت چل بسے کچھ اعتبار نہیں جبتک یہ بزرگ حیات ہیں ان کی یادداشت سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

یادِ رفتگاں:۔ از خواجہ عبدالمجید دہلوی۔ ملنے کا پتہ ضیا محل دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۲؍

نہیں۔ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

خواجہ عبدالمجید صاحب دلی کے پرانے مشہور اور مستند صاحب قلم ہیں۔ آپ کی زبان خصوصاً ٹکسالی زبان ہے جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں انشاپردازی اور دہلی کے محاورہ اور سلاست سے ایک عجیب رنگ دیدیتے ہیں آپ کی عمر چونکہ مختلف زمانوں سے گذر چکی ہے اور بڑے بڑے لوگوں کی صحبت اٹھائے ہوئے ہیں اس لئے آپ نے اپنی یادداشت سے یہ مختلف لوگوں کے حالات کا مجموعہ لکھا ہے یہ نہ صرف اپنی جگہ پر بہت دلچسپ اور مفید ہے بلکہ گذرے ہوئے لوگوں اور زمانہ کو ہم سے قریب کردیتا ہے خواجہ صاحب کا انداز بیان طرفہ لذت دیتا ہے۔

فہرست نہیں دی گئی ہے لیکن عنوانات حسب ذیل ہیں، میر محبوب علی پاشا شاہ، رکن سرسالار جنگ اول۔ سرسالار جنگ ثانی۔ سر سید شبلی۔ داغ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ حالی۔ شرر۔ عزیز۔ حکیم محمود خاں حکیم واصل خاں محسن الملک۔ وقار الملک وغیرہ۔

شرح درد: ۔ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی۔ ملنے کا پتہ ٹیا محل دہلی سائز ۲۲×۲۹/۱۶ صفحات ۲۱۴ قیمت عہ کاغذ، کتابت اور طباعت بہت اچھی۔

کلیات درد کی صحیح طباعت کی اشد ضرورت تھی۔ خواجہ محمد شفیع صاحب نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ درد کے مشکل اشعار کی شرح بھی لکھدی ہے کیونکہ درد کا کلام زیادہ تر تصوف سے بھرا ہوا ہے اور اب تصوف کے سمجھنے اور سمجھانے والے لوگ کم ہیں امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف طالب علموں کے لئے مفید ہوگی بلکہ اردو ادب سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لئے ایک تحفہ ہوگی۔ خواجہ محمد شفیع صاحب کی زبان نے بھی شرح کو بہت شگفتہ بنا دیا ہے قابل مطالعہ چیز ہے۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست: ۔ از عبدالسلام خورشید صاحب بی۔ اے۔ ناشر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور۔ سائز ـــــ صفحات ۲۹۳ قیمت عہ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

عبدالسلام صاحب نے ممالک اسلامیہ کی سیاست پر یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے [illegible]

[illegible]

[illegible] کہا جا سکتا ہے نہ کسی قسم کا محاکمہ ہو سکتا ہے۔ ویسے عام معلومات کے لئے یہ کتاب بہت اچھی [illegible]

[illegible]ئے آرزو:- از میرزا ادیب بی۔ اے (آنرز) ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری [illegible] دروازہ لاہور، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۲۲۸ قیمت عہ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ تین افسانوں کا مجموعہ تعلیم یافتہ بیکار نوجوانوں سے متعلق ہے جس میں ان کے درد بھری زندگی کے حالات ڈائری کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ میرزا صاحب کے قلم میں زور ہے اس لئے ان کے یہ افسانے بغیر اثر کئے نہیں چھوڑتے۔ سرمایہ داری کی لعنتوں کے خلاف آج کل اردو کے جتنے ادیب قلمی بغاوت کر رہے ہیں ان میں میرزا صاحب کا بھی نام لیا جائے گا۔ باوجود میرزا کی ادیبانہ شگفتگی کے حقائق کی تلخی پوری طرح نمایاں رہتی ہے اور بعض بعض جگہ نفسیاتی مطالعے اچھے نظر آتے ہیں۔

سر سید احمد پاشا یا قاف کی پری:- از علی عباس حسینی ملنے کا پتہ بھارگو ابکڈپو۔ امین آباد لکھنؤ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۸۸، قیمت عمر دوسرا اڈیشن۔ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ

یہ حسینی صاحب کا ایک تخئیلی اور رومانی ناول ہے جو ۱۹۱۱ء میں پہلی دفعہ نکلا تھا۔ گذارش میں خود حسینی صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ اس میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو ۱۹۱۹ء میں میرے سن کے اقتضا سے ہونا چاہئیں یعنی اس کا ہیرو پرانے قسم کا ہیرو ہے جو ہر جگہ اپنی جان دیدینے اور دوسروں کو بچانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ خود غرضیوں کا پتلا ہے۔ شجاعت اس کی کمزوری ہے۔ ایک حسینہ یا قاف کی پری کے عشق میں فرہاد کی طرح ناممکن سے ناممکن کام کے لئے تیار رہتا ہے آخر میں کامیاب ہوتا ہے۔

زبان، جملوں کی ساخت اور طرز بیان حسینی صاحب کا محتاج تعارف نہیں۔

رسید کتب

غریبوں کی گائے (تجارتی بکری خانہ) مرتبہ محمود مرزا صاحب قیمت ۴ر صفحات [illegible] ادارہ [illegible]

ہندو مسلم اتحاد:- از ستیہ بھگت ستیہ آشرم وردھا صفحات ۲۳ قیمت ۱ر

[illegible]

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر کلایو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب عالیجناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ............ساٹھ لاکھ روپئے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ........پچیس لاکھ روپئے	۲۵۰۰۰۰۰
اداشدہ سرمایہ........دس لاکھ پچیس ہزار نوسو پانچ	۱۰۲۵۹۰۵

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل و رسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے

ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن)،

اور

احمد آباد

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خاص چیز پیش کی جو زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیار کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں، جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر تیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے، بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوتی ہے،

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی، ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ

قرآن

حمائل کادیانی مطبع شرکت کادیانی برلن کی حمائل شریف. کاغذ و طباعت وغیرہ دیدہ زیب سائز نسبتاً چھوٹا. چند سال قبل اسی حمائل کا ہدیہ ۶ تھا. اور اب عام فائدے کے خیال سے صرف عہ

تاریخ القرآن ازمولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری قرآن کے جمع و ترتیب اور اس کی حفاظت نزول کی مکمل و دلکش تاریخ. (طبع دوم) قیمت عہ

تعلیمات قرآن اس کتاب میں جملہ اصول و عقائد اسلامی کی تفصیل خود قرآن کریم کی آیات ہی سے کی گئی ہے. دراصل یہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں سوائے قرآن کے کسی دوسری کتاب یا کسی انسانی خیال سے مدد نہیں لی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کس قدر مکمل کتاب ہے جو اپنی تشریح کے لئے بالکل کافی ہے. قیمت دو روپے (عار)

عقیدہ اعجاز القرآن ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب احراری. ایم. اے پی ایچ، ڈی کا وہ مقالہ جو انھوں نے اردو اکاڈمی کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا اس مقالہ میں اس عقیدہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تاریخ بیان کی گئی ہے کہ قرآن کریم ہی رسول مقبول کا معجزہ تھا. قیمت ۵ر

اقسام القرآن مصنفہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ. اس میں مولانا نے دکھلایا ہے کہ قرآن میں قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں. اس کا جواب اپنے اپنے انداز میں امام رازیؒ اور حافظ ابن قیمؒ وغیرہ نے بھی دئے ہیں، مگر مولانا نے ان کے جوابات کی کمزوریاں ظاہر کر کے اصل حقیقت بے نقاب کی ہے. اس سلسلہ میں قسم کی صورت، اس کی تاریخ، قسم کا ابتدائی مفہوم، اس کے طریقے وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے. قیمت ۸ر

مکتبہ جامعہ قرول باغ. نئی دہلی

مقدمۂ زندگانی محمدؐ

عہدِ حاضر کی ایک بے مثال کتاب

زندگانی محمدؐ علامہ محمد حسین ہیکل وزیرِ تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے۔ اس کتاب کی قدر و عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہو گئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں صرف تین ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئیں۔ پھر ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوا۔ اب دفتر امت مسلمہ امرتسر نے زندگانی محمدؐ کے مقدمے کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبر اسلامؐ کی مقدس زندگی پر اہلِ مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلل اور معقول جواب دئے گئے ہیں۔ اس کے متعلق مشاہیر و جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ زندگانی محمدؐ ایک قابلِ قدر تالیف ہے (اعلیٰ حضرت فرمانروائے مانگرول)

۲۔ زندگانی محمدؐ کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے پُر ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا۔ (سر عبدالقادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب ہے اور بہت اچھا ترجمہ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے۔ مصنف کی کوششیں مستحقِ اجر اور قابلِ داد ہیں۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی)

۵۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (زندگانی محمدؐ) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے (طلوعِ اسلام)

۶۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہو گا۔ (سب رس)

۷۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔ (شاعر)

۸۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ از بس مفید ہے۔ (جامعہ)

۹۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو اہلِ مغرب کی نظر سے دیکھتے ہوں، ان کے لئے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (حمایتِ اسلام)

۱۰۔ ہندوستان کے اسلامی لٹریچر میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے، جو اس جامعیت اور اختصار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے (پیامِ نسواں)

لکھائی، چھپائی اور کاغذ صاف ستھرا صفحات ۱۲۸ ۱۲؍ کے ٹکٹ بھیجکر ایک نسخہ طلب کیجیے۔

ملنے کا پتہ۔ **دفتر امتِ مسلمہ امرتسر (پنجاب)**

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

اگست ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ سائنس
۲۔ حیوانوں کی گرمائی اور سرمائی نیند
۳۔ ہمارے دانت
۴۔ دوران خون
۵۔ اوزان اور پیمانوں کی معیار بندی

ستمبر ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ حیدرآباد میں سلفیورک ترشہ اور دوسری اہم کیمیائی اشیاء کی صنعتی تیاری کے امکانات۔
۲۔ ہنسی (حیاتیات کی روشنی میں)
۳۔ ہماری آنکھیں۔
۴۔ جابر ابن حیان
۵۔ ہوائی حملہ اور زہریلی گیسیں۔

رسالہ ہندوستانی

رسالہ ہندوستانی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے حکومت صوبجات متحدہ کی سرپرستی میں گیارہ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ ہے، جو اکیڈمی کا آرگن ہے۔ اس میں قدیم و جدید علوم و فنون کے اہم موضوعات پر، ماہرین فن اور کہنہ مشق اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس استناد کی وجہ سے یہ رسالہ رسالہ نہیں ہے۔ بلکہ حوالے کی ایک کتاب ہے، ہر کتب خانے میں اس کی جلدوں کا موجود رہنا نہایت ضروری ہے۔ رسالے نے ۱۰، ۱۱ سال کے عرصہ میں علم و ادب کے بڑا اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں، ان کی وجہ سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہو گیا ہے کہ اب وہ اردو زبان کے دو تین سب سے ممتاز رسالوں میں سے ایک ہے جناب کی علم دوستی سے امید ہے کہ اس کے معاونین میں شامل ہو کر علم و ادب کی خدمت کا اس کو موقع عطا فرمائیں گے۔ اسی سلسلے میں اس کی توسیع اشاعت کی طرف بھی جناب کو توجہ دلاتا ہوں۔ جو حضرات اس کی خریداری منظور فرمائیں گے، یا جو پانچ خریدار بہم پہنچائیں گے، ان کی خدمت میں اکیڈمی کی بعض مطبوعات رعایتی قیمت پر پیش کی جائیں گی۔ ان مطبوعات کی تفصیل دفتر سے معلوم ہو سکے گی

رسالہ کا سالانہ چندہ للعہ ہے۔

ترسیل زر اور اس سلسلے کی خط و کتابت کے لئے ذیل کے پتے سے یاد فرمایا جائے۔

دفتر رسالہ ہندوستانی ہندوستانی اکیڈمی صوبجات متحدہ

(الہ آباد)

ہفتہ میں دو بار

جدت مُراد آباد

ہندوستان کا بہترین ستا اور کثیر الاشاعت اخبار ہے

کی خریداری کیلئے مسٹر محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال۔ آنریبل سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب۔ راجہ صاحب محمود آباد و دیگر لیڈران مسلم لیگ نے زبردست اپلیں شائع کی ہیں

جدت دلکش نظموں بہترین جنگی تبصروں بلند پایہ افسانوں کا مجموعہ

اعلیٰ سیاسی مضامین کا گنجینہ اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کا خزینہ ہے!

یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا۔ یہ اخبار نیا نہیں ہے۔ بلکہ پرانا ہے اسکی تیرھویں جلد ہے اس اخبار کی ایڈیٹری کیلئے ملک کے ایک ایسے مایۂ ناز اہل قلم و انشا پرداز گریجوئٹ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو کئی روزانہ اخبارات کو ایڈٹ کر چکے ہیں۔



جدت کی قیمت ہم نے باوجود گرانی کاغذ وغیرہ کے بجائے چھ روپیہ کے صرف پانچ روپیہ سالانہ اور چھ شش ماہی اور عہ سہ ماہی مقرر کی ہے۔ شائقین اصحاب فوراً قیمت روانہ فرما کر جاری کرالیں ایجنٹ صاحبان کو پچیس فیصدی کمیشن دیا جاویگا چونکہ یہ اخبار بوجہ علمبرداری لیگ کے کثیر الاشاعت ہے اسلئے مشتہرین کیلئے بہت منفعت بخش ہے

مینیجر

اخبار جدت مُراد آباد پرنس روڈ

مملکت دکن کا واحد کثیر الاشاعت ہفت روزہ اخبار

زیر نگرانی محمد حسام الدین خان غوری

اقبال

زیر ادارت سرمست خاں آزاد

کنگس وے سکندرآباد

جو ہر جمعہ کو وقت کی پابندی سے شائع ہوتا ہے

جس میں

عالم اسلام کے تازہ ترین حالات، موجودہ جنگ کے تفصیلی واقعات۔ سیاسی، اصلاحی تعمیری وادبی مضامین، دلچسپ معیاری افسانے، اردو، پر در نظمیں، ایجادات وحیرت انگیز واقعات، ہندوستان اور بلدہ حیدرآباد و اضلاع مکمل خبریں نہایت اہتمام سے شائع ہوتی ہیں۔

اقبال کے معیار کا اندازہ صرف اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کے معتمد انشا پرداز و شعراء اس کی قلمی اعانت کرتے ہیں۔

اقبال کا اولین مقصد

نوجوانان ملت میں تحریک عمل پیدا کر کے انکو صحیح راستہ پر گامزن کرنا ہے

اس لئے

ملت کے ہر فرد کا عموماً اور نوجوانوں کا خصوصاً یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس کا مطالعہ کریں اور احباب کو بھی اس طرف توجہ دلائیں۔

سالانہ چندہ ۳ نمونے کے لئے ۲ کے ٹکٹ ارسال فرمائیے ششماہی چندہ ۲

اقبال ہفت روزہ کنگس وے سکندرآباد دکن

تفاسیر

بیان یہ سورہ آل عمران کی تفسیر ہے۔ اس میں الوہیت مسیح، معجزات ابن مریمؑ اور وفات و حیات عیسیٰ علیہ السلام پر حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ ہدیہ ۱۲/

صراط المستقیم اس میں سورہ انفال و توبہ کے حقائق و معارف کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے موجودہ ضروریات و احتیاجات کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے اور ان حقائق و معارف کی وضاحت و صراحت پر خاص طور سے زور دیا ہے جس سے مسلمان دور جا پڑے ہیں۔ ہدیہ عہ

سبیل الرشاد تفسیر سورہ حجرات اس کی ابتدا میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں مجلس شوریٰ کی ترتیب، ارکان کے انتخاب اور صدر جمہوریہ اسلام کے شرائط و لوازمات پر بحث کی گئی ہے۔ خلفائے راشدین کا نظام حکومت کیا تھا؟ ان کی مجالس شوریٰ کا انعقاد کن اغراض و مقاصد کے ماتحت ہوتا تھا؟ اور کس طریق سے یہ امور طے ہوتے تھے؟ ان سب کی اطلاع سبیل الرشاد سے ملے گی۔ ہدیہ ۱۰/

عبرت احسن القصص یعنی سورہ یوسف کی تفسیر نہایت ہی خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے نصیحت آمیز اور عبرت انگیز نتائج کو بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہدیہ ۱۲/ مجلد عمر

برہان تفسیر سورہ نور مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلامیہ کو دعوت دی ہے۔ علمی مسائل کی تشریح عقل کی روشنی میں بڑی وضاحت سے کی گئی ہے۔ ہدیہ ۱۲/ مجلد عمر

سبل السلام اٹھائیسویں پارے کی تفسیر اہل ذوق حضرات میں بڑی مقبول ہو رہی ہے۔ ہدیہ غیر مجلد ۱۲/

ذکریٰ تفسیر پارہ عم تمام چھوٹی بڑی سورتوں کا ترجمہ اور تفسیر ہے جنہیں ہم روز مرہ نماز میں پڑھتے ہیں زمانہ موجودہ کے مسلمانوں کی ضروریات اور شبہات کو مدنظر رکھ کر یہ تفسیر مرتب کی گئی ہے۔ ہدیہ غیر مجلد ۱۲؍ مجلد ۱۴؍

بصائر اس رسالے میں بنی اسرائیل کے ان واقعات و حوادث کو جن کا قرآن کریم میں بیان ہے۔ نہایت دلکش رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ (طبع جدید) بڑا سائز قیمت ۸؍

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفاسیر

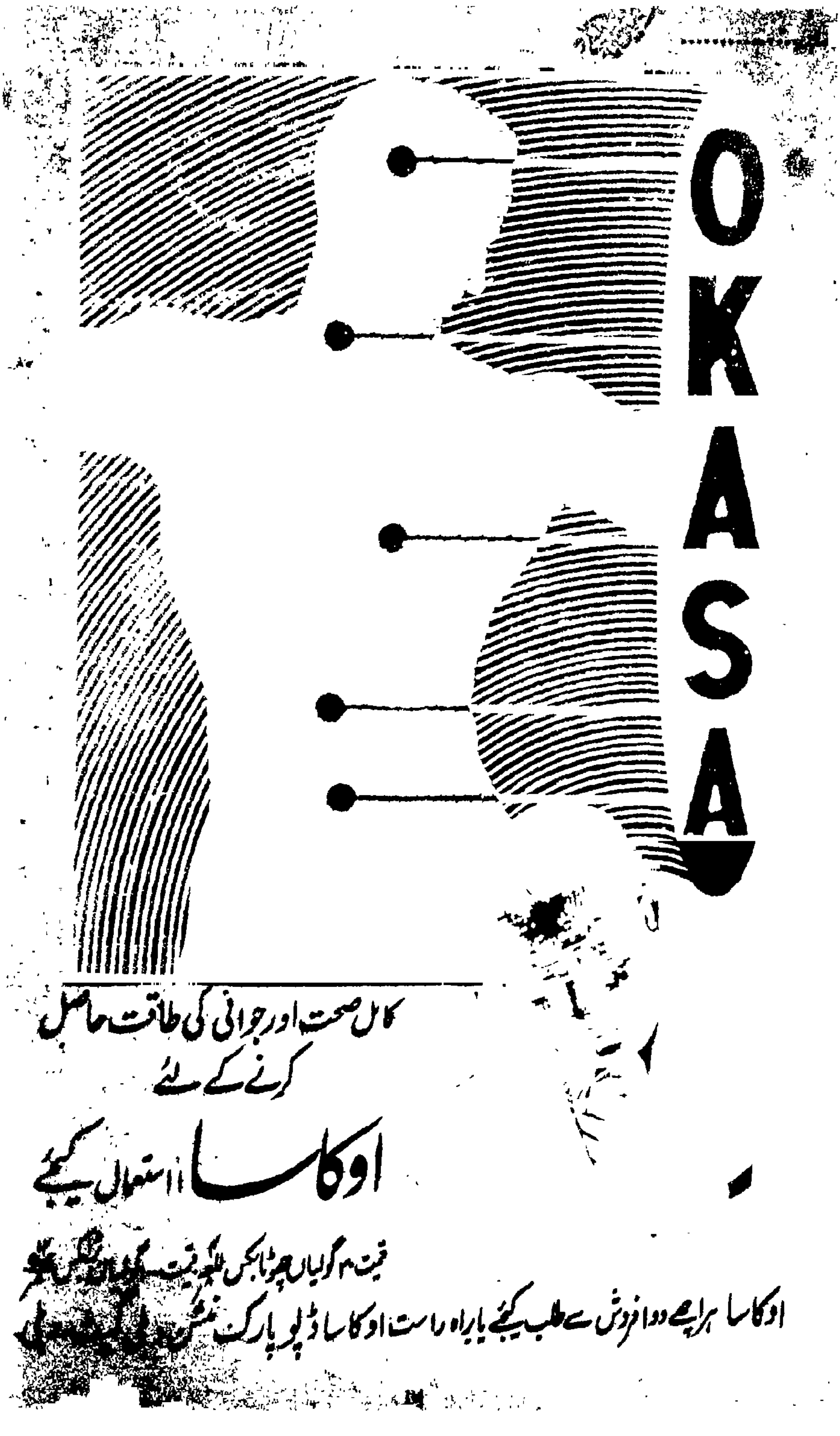
مولانا کی تفسیر نظام القرآن تاویل الفرقان بالقرآن کے جو حصے چھپ چکے ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔ ان کے نام اور قیمت حسب ذیل ہے۔

۱۔ تفاسیر ارہ کوثر	قیمت ۸؍	۵۔ تفسیر سورہٴ عصر	قیمت ۶؍
۲۔ تفسیر " لہب	" ۶؍	۶۔ " " عبس	" ۶؍
۳۔ " " اخلاص	" ۵؍	۷۔ " " والتین	" ۶؍
۴۔ " " کافرون	" ۵؍	۸۔ " " الفیل	" ۸؍

۹۔ تفسیر سورہ والشمس قیمت ۸؍

میلاد شریف

ہماری میلاد مبارک کی محفلیں نہایت مستحسن مجالس ہیں۔ لیکن زمانہ ترقی کر گیا ہے اور ہمارے میلاد خواں بدقسمتی سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے ہیں یہ میلاد شریف نہایت پُر اثر زبان میں لکھا گیا ہے۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ یا غیر تعلیم یافتہ طبقہ مرد ہوں یا عورتیں سب کے لئے یکساں طور پر کشش رکھتا ہے۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی حکومت نے اس کی ایک ہزار جلدیں خرید کر صوبہ کے دیہاتوں میں مفت تقسیم کی ہیں۔ یہ میلاد شریف اب تک جن محفلوں میں پڑھا گیا ہے بے حد پسند کیا گیا۔ قیمت قسم اول ۲؍ قسم دوم ۱۲؍


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک

جامعہ

زیر ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۴۳۔ نمبر ۵	بابتہ ماہ نومبر ۱۹۴۱ء	چندہ سالانہ صرف فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

[illegible] پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

مطبوعاتِ جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے اس فہرست میں
آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئینگی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں
کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی
ہیں۔ ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

ربط کا طریقہ تعلیم

نفسیاتی بنیاد | ہر تعلیمی نظام کے دو بڑے حصے ہوتے ہیں۔ اول نصاب۔ دوم طریقہ۔ نصاب کا تعلق ماضی کی روایات، حال کی ضرورتوں اور مستقبل کے تقاضوں سے ہوتا ہے اور طریقہ تعلیم کا انحصار نصاب کی نوعیت کے ساتھ نفسیاتی تحقیق و انکشاف پر۔ چنانچہ جب بھی زمانہ کے ہاتھوں زندگی کا خاکہ بدلا تو بیدار قوموں نے نصاب میں بھی ترمیم و تنسیخ لازمی سمجھی اور اسی طرح جیسے جیسے انسانی ذہن کے متعلق ہماری معلومات حقیقت سے قریب پہنچتی گئیں ہمارا طریقہ تعلیم بھی بدلتا گیا۔ نصاب چونکہ ایک قوم کی تاریخ سے وابستہ ہوتا ہے اس لیے اس میں حدود کو بعض اوقات کافی تنگ رکھنا پڑتا ہے لیکن طریقہ تعلیم کا تعلق انسانی فطرت سے ہے اور انسانی فطرت ہر جگہ ایک واقع ہوئی ہے۔ اس لیے تعلیمی طریقے بنیادی طور پر زمان و مکان کی قید سے بے نیاز عالمگیر اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک وہ وقت تھا کہ انسان کے جسم اور ذہن میں وہی رشتہ تصور کیا جاتا تھا جو انسان کے لباس اور جسم میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ نہ لباس جسم کی حالت پر دلالت کر سکتا ہے اور نہ جسمانی حالت لباس کا تعین کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تپ دق کے ایک مریض کو ریشم کے کپڑے میسر ہوں اور ہو سکتا ہے کہ ایک اچھی صحت رکھنے والے جسم کو ڈھانکنے کے لیے چیتھڑے بھی نہ مل سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جسم اور ذہن دونوں کی تربیت کے لیے الگ الگ تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ اور ان تدابیر کی نوعیت خواہ وہ جسم کے لیے ہوں یا ذہن کے لیے ورزشی نوعیت ہوتی تھی۔ ذہنی تعلیم کے لیے جو نصاب تھا۔ وہ زندگی کی کسی غرض کو پورا نہیں کرتا تھا۔ اس کا مقصد ذہنی تربیت تھا۔ شعر و ادب کی تعلیم کا مدعا قوت متخیلہ و حافظہ کو اجاگر کرنا تھا اور ریاضی کا مقصد قوت استدلال کی نشو و نما۔ گویا طالب علم ان مضامین کو اسی طرح اختیار کرتا تھا جس طرح آپ اپنے جبڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے ربڑ چبانا اختیار کر لیں۔

جسمانی تعلیم کا مقصد و مدعا وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے پھر بھی ہمارے وقت سے پہلے اسے

ذہنی نشوونما میں مدد دینے کے خیال سے کبھی اختیار نہیں کیا گیا۔ چینیوں کے یہاں تو ساری تعلیم ذہنی تربیت کے لیے تھی اور وہ بھی یوں ادا ہوتی کہ بچے بغیر سمجھے بوجھے عبارتیں ازبر کر لیتے تھے اور پھر کتاب بند کر کے استاد کے سامنے تیزی کے ساتھ دہرا دینا ہی اپنا بڑا ذہنی کمال سمجھتے تھے گویا قوت حافظہ ان کے یہاں ذہانت و فراست کا پیمانہ تھی۔ یونانیوں کے یہاں البتہ نہ صرف ذہنی اور جسمانی تعلیم پر کسی قدر مساوی زور دیا جاتا تھا بلکہ ذہن اور جسم کے درمیان جو خلیج تھی اسے بھی بعض وقت پُر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ رقص کی ساری اہمیت یہ تھی کہ اس میں ظاہری حرکات کو اندرونی احساسات اور کیفیات کا ترجمان بنانے کا امکان تھا۔ لیکن ذرا آگے چل کر انھیں یونانیوں نے جسمانی تربیت کو ایک خالص جمالیاتی رُخ دیدیا۔ یونانی نوجوان جسمانی تربیت سے "اخلاقی خوبیاں" پیدا کرنے کے بجائے یہ کوشش کرنے لگے کہ ان کے جسم ظاہری حسن و تناسب میں بس سانچے میں ڈھلی ہوئی چیزیں بن جائیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں تعلیم کی غرض و غایت "روحانی تربیت" تھی اور گو اس کے ساتھ سینٹ بینیڈکٹ کے احکام کے مطابق سات گھنٹے روزانہ ہاتھ کے کام کا التزام تھا لیکن اس ہاتھ کے کام سے جسمانی نشوونما کے بجائے ذہن کو برائیوں سے محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ نشاۃ ثانیہ میں جسمانی تربیت پر زور دیا جانے لگا۔ پوپ ثانی کا فرمان تھا۔ "تمہاری تعلیم کا یہ لازمی جزو ہوگا کہ تم کمان اور نیزے کا استعمال سیکھو، گھوڑے کی سواری، کودنا اور تیرنا جانو۔ یہ چیزیں نہایت باعزت ہیں اور معلم کے دائرہ عمل سے باہر نہیں۔ چھوٹے بچوں کو کھیل بھی سکھائے جائیں اور یہ ان کے روزمرہ کے کام کا جزو ہونا چاہییں۔" ہمارے زمانے سے قریب تر جان لاک یہ عقیدہ لے کر پیدا ہوئے تھے کہ "ایک صحیح ذہن ایک سالم جسم کے اندر اس دنیا میں سب سے بہتر زندگی بسر کرنے کا مختصر مگر جامع اصول ہے۔" لاک کا یہ عقیدہ یقیناً مستحسن تھا اگر وہ جسم اور ذہن کو ایک دوسرے سے اتنا بے تعلق نہ سمجھتے جتنا انھوں نے خود سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا۔ ان کے پاس دونوں چیزوں کے لیے الگ الگ نسخے تھے۔ لاک کا خیال تھا کہ جسمانی طاقت سختیاں برداشت کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور ذہن کی تربیت کا انحصار قوت استدلال پر ہے اور قوت استدلال کی تربیت کے لیے صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے ریاضی۔ خود لاک کے الفاظ ہیں۔ "میں نے ریاضی کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اس سے ذہن میں قوت استدلال پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک کو عام طور پر ریاضی داں بنانا

ہے۔ اس طرح اپنی قوت استدلال کو بڑھا کر جو اس مضمون سے پیدا ہوتی ہے وہ طلبہ دوسرے علوم میں بھی جب جب اس کا موقع آئے اسے منتقل کر سکتے ہیں۔ لاک کو آج ہم سے رخصت ہوئے دو سو چھتیس سال گزر چکے۔ اس وقت سے اب تک زمانہ نہ جانے کتنی کروٹیں لے چکا۔ علم کی نہ جانے کتنی نئی شاہراہیں ہم پر کھل چکیں لیکن یہ لاک کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ اس کے معتقدین نہ صرف آج تک زندہ ہیں بلکہ بعض جگہ بااثر حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک ٹریننگ اسکول میں "انجاح طریقۂ تعلیم" اب بھی یہی پڑھاتا ہے کہ حساب کا مقصد قوت مدرکہ و متخیلہ و استدلالیہ کی نشوونما ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ ٹریننگ اسکول ایک ریاست میں واقع ہے اور یہاں کا "انجاح طریقۂ تعلیم" آج سے پچیس تیس سال پہلے کا نارمل پاس ہے۔

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ ابھی ابھی جو حوالے دیے گئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدما کے نزدیک جسم اور ذہن الگ الگ چیزیں تھیں چنانچہ تعلیم میں ایسے طریقوں کا فقدان نظر آتا ہے جو بیک وقت جسم اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کے ضامن ثابت ہو سکیں۔ اس کے علاوہ ذہن کو مختلف قوتوں کا مجموعہ مانا گیا تھا جس کی رو سے نصاب کے مضامین کی تقسیم و تخصیص پیدا ہوئی اور سب سے زیادہ خطرناک وہم جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ انسان کا ذہن پیدائش کے وقت ایک ورق سادہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تعلیم ہر اعتبار سے باہر سے ایک خارجی اور مصنوعی عمل تھا اور ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ انسان کی ذہنی تربیت اور اس کی معقول پسندی کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کسی شخص کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ شریف النفس انسان پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے کیونکہ ہر وہ شخص جو ریاضی کی مشق کے بعد قوت استدلال بڑھا لیتا معقول پسند اور شریف النفس بن جایا کرتا اور اس لیے نہ کبھی میں آپ کو ستاتا نہ آپ کو شکوہ ہوتا نہ فرشتے میرا اعمالنامہ سیاہ کرتے، نہ حشر ہوتا، نہ آپ دادخواہی کرتے نہ مجھ کو ندامت ہوتی!

انسانی ذہن سے متعلق اس نفسیات کے مقابلے میں جدید نفسیاتی تحقیق بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا موجودہ ماہر نفسیات بتاتا ہے کہ انسانی ذہن بنی بنائی قوتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک سالم قوت ہے جو جسم کے ہر رگ و ریشے سے ظاہر ہو کر کام کرتی ہے۔ ہمارے جسم کی بالائی منزل میں اس قوت کا مرکز ضرور ہے لیکن اس کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے [illegible] جسم اور ذہن کا رشتہ [illegible]

کی صحت دوسرے کی صحت اور ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی مانی جاتی ہے۔ وہ چیز جو ہمارے سر میں قریب تین پاؤنڈ کا وزن رکھ کر قایم ہے اور جو دماغ کہلاتی ہے وہ چیز ذہن کی مشین ہے اور ذہن اسی مشین کے ذریعہ اپنا کام کرتا ہے۔ بجلی کو آپ دیکھ نہیں سکتے لیکن اس کی جلوہ گری ہر جگہ بے حجاب ہے۔ اسی طرح ذہن دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اس کا عمل ہر وقت ہمارے سامنے ہے۔ بجلی کے نظام کے لئے مشین ضروری ہے۔ خراب مشین سے بجلی کی پیداوار اور اس کے نظام میں رکاوٹ اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دماغ کی کمزوری ذہن کی کارکردگی پر اثرانداز ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وراثتی اثرات سے ماورا دماغ کی بہتر نشوونما کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو دماغ کی نشوونما کے لیے ضروری ہے وہ تو وہی ہے جو تمام جسم کے لیے ضروری ہے۔ یعنی غذا۔ جس طرح پالے کے مارے ہوئے درخت سے اچھے پھل حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اس جسم میں ذہن کی نا بالیدگی فضول ہے جس پر غذا کی کمی کے صدمے گزر چکے ہوں یا گزرتے رہتے ہوں ایسے ذہن کی تربیت کے لیے خواہ کتنے ہی اچھے مواقع فراہم کیوں نہ کیے جائیں لیکن وہ کسی صحیح معیار تک نہیں پہنچ سکتا۔ دو اور چیزیں جو ذہنی نشوونما کے لیے ضروری ہیں وہ بھی سامنے کی باتیں ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹینس کھیلنے والوں کا دایاں ہاتھ ان کے بائیں ہاتھ سے کچھ زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اچھا اس معنی میں کہ اس میں طاقت تو زیادہ ہوتی ہی ہے لیکن بناوٹ کے اعتبار سے بھی وہ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر نشوونما کے لیے استعمال لازمی شرط ہے۔ بالکل اسی طرح دماغ بھی اپنی نشوونما کے لیے استعمال کا محتاج ہے۔ دماغ کے مختلف مرکز مختلف حواس اور جسم کے مختلف حصوں کی فعالی کا نظام قایم رکھتے ہیں۔



اس لیے مکمل طور پر نشوونما پایا ہوا دماغ وہ ہی ہو سکتا ہے جس پر حواس نے بے روک ٹوک کام کیا ہو اور جس نے جسمانی اعضاء سے بھرپور مکمل کام لیا ہو۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی آنکھوں نے زمین کے پامال ذروں سے لے کر آسمان پر چمکنے والے ستاروں تک ہر اس چیز کا جائزہ لیا ہو جو نگاہ کو دعوت رنگ و نور دے سکتی ہو۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کے کان فطرت کے سایے میں مدھم سے مدھم ترنم پیدا کرنے والے آبشاروں سے لے کر سمندر پر ہیبت ناک انداز میں کروٹیں لینے والی موجوں کے سامعہ پاش شور سے آشنا ہوں۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی حس شامہ زیادہ سے زیادہ مختلف القسم خوشبوؤں اور بدبوؤں سے دوچار ہوتی رہی ہو۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہی ہو سکتا ہے جس کی زبان نے بے شمار چیزوں کا ذائقہ لیا ہو اور دماغ کے یہ مختلف مرکز ہی مل کر اچھا ذہن پیدا کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل شکل میں دماغ کے مختلف مرکزوں کا تعلق دیکھا جا سکتا ہے۔

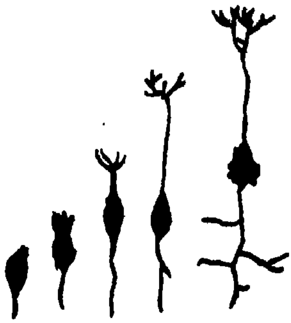


مادی دنیا اور انسانی دماغ کے درمیان حواس ایک کڑی کا کام کرتے ہیں جس قدر مادی دنیا کے اثرات حواس کے ذریعہ دماغ پر پڑتے رہیں گے اسی قدر دماغ کی نشوونما کے امکانات زیادہ ہوں گے دماغ کی مکمل نشوونما میں اسی قدر اہمیت آزاد جسمانی فعالی کی بھی ہے۔

انسانی دماغ کا وہ حصہ جو تمام شعور کا مرکز ہے کارٹیکس Cortex کہلاتا ہے

اوپری حصہ ہے اور رنگ میں راکھ کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس کی تہہ ½ انچ سے ¼ انچ تک دبیز ہوتی ہے۔ ایک مکمل اور اچھے دماغ میں یہ تہہ پوری لمبائی چوڑائی میں یکساں دبیز ہوتی ہے لیکن اگر ہم کسی ایسے شخص کے دماغ کا معائنہ کریں جو زندگی میں کسی ایک حس یا جسمانی فعالی کے کسی ایک مرکز کو استعمال نہ کر سکا ہو تو ہمیں اس کی کورٹیکس کا وہ حصہ جس کا تعلق اس حس یا جسمانی فعالی سے تھا باقی کورٹیکس کے مقابلہ میں کم دبیز ملے گا یہ دماغ نامکمل اور ناقص دماغ ہے اور اس کے ذریعے کام کرنے والا ذہن بھی ناقص ذہن ہے۔ پروفیسر ڈونلڈسن نے لورا برجمین ایک خاتون کے دماغ کا معائنہ کیا تھا۔ لورا عام بچوں کی طرح پیدا ہوئی تھی اور قریب تین سال کی عمر تک اس نے عام بچوں کی طرح زندگی بسر کی۔ اس کے بعد وہ ایک خطرناک بیماری کے باعث سماعت سے بالکل محروم ہو گئی اور اس کی بائیں آنکھ بھی جاتی رہی۔ بیماری کا اثر دائیں آنکھ پر بھی پڑا تھا اور آٹھ سال کی عمر میں اس کی یہ آنکھ بھی بے نور ہو گئی۔ لورا نے اس حالت میں زندگی کے ساٹھ سال گزارے۔ اس کی وفات کے بعد ڈونلڈسن نے اس کے دماغ کا معائنہ کیا تو اول تو اسے لورا کی پوری کورٹیکس عام دماغوں کی کورٹیکس کے مقابلے میں بہت پتلی ملی اور اس میں بائیں آنکھ سے متعلق کورٹیکس کا حصہ اس حصے سے اور بھی زیادہ پتلا ملا جس کا تعلق دائیں آنکھ سے تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مادی دنیا اور حواس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ بچے کو ان حرکات و سکنات کی آزادی ہو جو وہ حواس کے سلسلے میں بطور جوابی عمل کرنا چاہتا ہے۔ بچوں کی زندگی میں قسم قسم کے رنگین کھلونوں کی، سیر و تفریح کی، میلوں تماشوں کی اور کھیل کود کی اہمیت صحت دماغی کی پہلی لیکن سب سے مضبوط بنیاد ہے۔ دماغ کے مختلف حصے ریڈیو سٹ کے والوز (valves) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر آپ کے ریڈیو سٹ کے سب والوز ٹھیک ہیں اور اپنی پوری قوت سے کام کر سکتے ہیں تو آپ کا ریڈیو سٹ آپ کی بے شک بہت عمدہ خدمت کرے گا۔ لیکن اگر اس میں ایک والو بھی خراب ہے تو وہ پورے ریڈیو سٹ کی عمدگی پر داغ لگا دیتا ہے۔ فطرت ہمیشہ انسان پر اعتماد کرنے سے زیادہ اپنے انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے چنانچہ جہاں تک حواس اور جسمانی فعالی کے ذریعہ دماغ کی نشو و نما کا تعلق ہے فطرت نے خود بچے میں کھیل کود اور چیزوں کو بنانے بگاڑنے کا رجحان اور جبلت پیدا کی ہے۔ بچہ خود بخود اپنی شفا کے لیے

غیر شعوری اور جبلی طور پر کوشش کرتا رہتا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بعض ماں باپ یا استاد بچوں کو ان کے اس بنیادی کام میں مدد دینے کے بجائے الٹی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ دماغ بہت باریک باریک ریشوں سے بنا ہوا ہے۔ یہ ریشے نشوونما کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نیچے کی شکل میں نشوونما پائے ہوئے اور نشوونما نہ پائے ہوئے ریشوں میں فرق دیکھا جاسکتا ہے۔



یہ گفتگو طویل ہو گئی لیکن اس سے یہ ضرور واضح ہو گیا ہو گا کہ انسان کی صحیح نشوونما میں کیا عناصر بنیادی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ عناصر ایک مرتبہ پھر مجملاً عرض کر دوں مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- اچھی غذا

۲- حواس کے استعمال کا موقع اور

۳- جسمانی فعالی کی آزادی۔

تعلیم کی آخری غرض و غایت چونکہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحیح اور مکمل قسم کا انسان پیدا کرنا ہی ہو سکتی ہے اس لیے بہترین نظام تعلیم بھی وہی ہے جو جسم، حواس اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کا ذریعہ بن سکے اور حقیقتاً ہماری تعلیم کا نیا دور اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جس وقت سے جسم، حواس اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کے نصب العین پر خیال و عمل کی قوتیں صرف ہونے لگی ہیں۔ جہاں پہنچ کر ہمیں یہ بات حاصل ہو جاتی ہے وہی ہماری منزل ہے۔ یہاں نصاب کے مضامین ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہونے کے بجائے ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں اور گویا ان مضامین کو پڑھانے کا گر پا لیا ہوتا ہے جس میں

جسمانی فعالی حواس کے استعمال اور ذہن کو سوچ بچار کا یکساں موقع ملتا ہے۔ جو طریقہ تعلیم ہمیں یہ چیز مہیا کر دے۔ وہی ربط کا طریقہ تعلیم ہو۔ آج سال ۱۹۱۲ء میں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور گو ہمارے مدرسوں میں عام طور پر وہ سہولتیں ابھی میسر نہیں آئیں جو ہمیں ہمارے ارادوں میں کامیاب بنا سکیں تاہم ہمارے ذہن میں یہ چیز بالکل صاف ہو کہ ہم اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس نصب العین تک قدم بہ قدم اور منزل بہ منزل پہنچے ہیں۔ ایسا یقیناً نہیں ہوا جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم کسی صبح اٹھے ہوں اور یہ بات الہام کے ذریعہ ہم میں سے کسی پر وحی کی شان لے کر نازل ہو گئی ہو۔

فضل الدین آثر ایم۔اے

ہماری آبادی

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں ہر دس سال کے بعد جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا ہے۔ گزشتہ مردم شماری میں ہندوستان کی کل آبادی ۳۵۲،۸۳۷،۷۷۸ نفوس تھی، اور خیال ہے کہ نئی مردم شماری میں مجموعی آبادی چار پانچ کروڑ اور بڑھ جائے گی۔ ابھی تک جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں وہ آبادی میں اضافہ کا رجحان ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ملک میں اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ذرائع معاش موجود ہوں اور وہ اس کے لیے خوراک مہیا کر سکے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

کیا اضافۂ آبادی کی یہ رفتار دوسرے ممالک کے مقابلے میں تیز ہے؟ کیا یہ ہمارے ملک کے موجودہ وسائل کے مطابق ہے؟ بڑھتی ہوئی آبادی ہندوستان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے یا بلائے بے درماں؟ کیا یہ ملک اپنی آبادی کو سنبھال سکتا ہے؟— ان سب سوالات کے مختلف الخیال لوگوں کی جانب سے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے اور ہمارا افلاس، قرض، خرابیٔ صحت اور ہر قسم کی معاشی کمزوریاں اور ان کے کل نتائج کی ذمہ داری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی آبادی پر ہے۔ اس طبقہ میں سب ہی قسم کے لوگ شامل ہیں معاشیات کے طالب علم بھی، محب وطن بھی اور حکومت کے آدمی بھی۔ بالخصوص حکومت اس خیال کی طرفدار ہے اور اپنے مفاد کے لیے جائز اور ناجائز دونوں طریقوں سے اس کو دلیل بناتی ہے۔

ایک طرف اگر یہ لوگ ہیں تو دوسری جانب چند اہل الرائے ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کی آبادی سے بالکل خوفزدہ نہیں ہیں۔ یہ بالعموم سیاسی لیڈر اور ان کے دوسرے ہمنوا ہیں جو آبادی کو نہیں بلکہ بری حکومت کو معاشی پستی کا باعث قرار دیتے ہیں اور حکومت سے نالاں ہیں کہ وہ کثرت آبادی کے بہانے کی آڑ لے کر معاشی ترقیات سے گریز کرتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کہانی میں

لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں ابھی خوراک کی کمی نہیں۔ اگرچہ ہندوستان کی آبادی میں اضافہ ہوگیا ہو لیکن خوراک کی رسد میں بھی اضافہ ہوگیا ہو اور آبادی کے اضافہ سے بڑھ کر اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہو۔ گذشتہ دس سال کے سوا یہ اضافہ اکثر مغربی ممالک کی سکے اضافہ سے کہیں کم ہو"

سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ ان دو گروہوں میں کون سچا ہو؟ دراصل غلطی دونوں کی ہو۔ موخرالذکر گروہ کا یہ خیال کہ ہندوستان کی آبادی زائد از ضرورت نہیں، دلائل اور اعداد و شمار سے ابھی غلط ثابت کیا جائیگا ہاں یہ ضرور ہو کہ ہماری زیادہ آبادی نے معاشی پستی پیدا نہیں کی بلکہ یہ پستی نتیجہ ہو حکومت برطانیہ کی غیر ہمدردانہ روش کا۔ حکومت کی روش کی تفصیل اس مقام پر غیر معمولی طوالت کا باعث ہوگی الذا ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریشہ دوانیوں، حکومت برطانیہ کے مضرت رساں طرز عمل اور حکومت ہند کی لاپرواہی اور سرد مہری کی طویل داستان بیان کرنی پڑے گی۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہو کہ جس طرح اضافہ آبادی سے معاشی پستی پیدا ہوتی ہو۔ اسی طرح خوش حالی سے مفلسی کی جانب معاشی حالت کا زوال بھی خود بخود زائد از ضرورت آبادی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہو۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوا۔ معاشی حالت کے گر لے اور وسائل معاش کے مفقود ہونے سے آپ ہی آپ آبادی کا ایک کثیر حصہ بیکار ہو گیا۔

لیکن اتنا کہہ دینے سے آبادی کے مسئلے کا صحیح اور قطعی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے لیے ہمیں ہندوستانی آبادی کے رجحانات کی تحقیق کرنی ہوگی اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان رجحانات میں زائد از ضرورت آبادی کی کون سی علامات پائی جاتی ہیں۔ کثرت آبادی سے مراد آبادی کا متوازن عدد سے بڑھ جانا ہو۔ اندازہ لگایا گیا ہو کہ ایک اعلیٰ درجہ کے زرعی ملک میں فی مربع میل زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہو۔ ہندوستان میں ایک سو بچانوے آدمی فی مربع میل بستے ہیں کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آبادی گنجائش سے کم ہو۔ ایسا ہو سکتا اگر ہندوستان کی زراعت کی حالت اچھی ہوتی۔ مسٹر کیٹ کا خیال ہو کہ ایک شخص کے گذارے کیلئے کم از کم ۲½ ایکڑ زمین ہونی چاہیئے۔ یو۔پی کے متعلق ڈاکٹر [illegible] نے [illegible] کیا ہو کہ اس

معیارِ رہائش برقرار رکھنے کے لیے ہر زرعی گھرانے کے پاس تیس ایکڑ رقبہ ضرور ہونا چاہیے ان اعداد کا جب ہم ہندوستان کی حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے کسان کے پاس ضروریات سے بہت کم رقبہ ہے۔ بنگال، بہار و اڑیسہ، یو۔پی اور مدراس میں فی کس رقبہ کاشت ایک ایکڑ سے بھی کم ہے سی پی اور بمبئی اور پنجاب میں یہ رقبہ ایک اور دو ایکڑ کے بین بین ہے ان اعداد و شمار سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں زمین پر آبادی کا ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے۔ یو۔پی کی بنکنگ انکوائری کمیٹی کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اچھی بارش کے موسم میں بھی صرف ۲۵ فی صد کسان اپنی تمام ضروریات مہیا کر سکتے ہیں کیا یہ ناقابلِ ضرورت آبادی کی علامت نہیں؟

اضافہ آبادی کا اندازہ شرح پیدائش اور اموات کے مقابلے سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی ملک کی شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں بڑھی ہوئی ہوں تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ واضح رہے کہ صرف شرح اضافہ سے کثرت آبادی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اگر شرح پیدائش اور شرح اموات میں برابر کی کمی یا زیادتی ہو تو شرح اضافہ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا ممکن ہے کہ کسی دو ملکوں کی شرح اضافہ تو یکساں ہو لیکن شرح پیدائش اور شرح اموات ایک میں زیادہ ہوں تو دوسرے میں کم۔ اس لیے اضافۂ آبادی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے یکساں شرح اضافہ سے ہرگز دھوکا نہ کھانا چاہیے۔

ہندوستان کی شرح پیدائش و نیز شرح اموات بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور عرصے سے اس میں کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہوا سنہ ۱۹۰۱-۱۹۱۱ء میں ہندوستان کی شرح پیدائش ۳۰،۹ اور شرح اموات ۲۷،۴ تھی اور سنہ ۱۹۳۱-۳۵ء میں یہ شرحیں علی الترتیب ۳۴،۳ اور ۳۲،۰ ہو گئیں، ہمیں پنڈت جواہر لال صاحب کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ انیسویں صدی میں یورپی ممالک کی شرح اضافہ ہندوستان سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور بیسویں صدی تک وہ برابر بڑھتی چلی گئی لیکن بیسویں صدی سے اس میں نمایاں کمی ہونے لگی لیکن ہندوستان کی حالت بالکل برعکس ہے اور بیسویں صدی میں ہماری شرح اضافہ میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں انیسویں صدی میں چند غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے جنھیں عام طور پر نظر انداز کر

جاتا ہو ورنہ ہندوستان میں اضافۂ آبادی کا رجحان جب بھی پایا جاتا تھا۔ یورپ میں اس زمانے میں سائنس کی ترقیات روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نئے نئے ذرایع معاش پیدا ہو رہے تھے۔ نو آبادیاں بنائی جا رہی تھیں۔ غرض یہ کہ آبادی کے بڑھنے کے بے انتہا مواقع حاصل تھے لیکن بیسویں صدی میں حالات اتنے موافق نہ رہے۔ نو آبادیوں میں گنجایش بہت کم رہ گئی یورپ کے ستائے ہوئے ممالک کو بھی ہوش آنے لگا اور انھوں نے معاشی ترقی کے لئے جان توڑ جدوجہد شروع کر دی۔ یورپ میں خود کفالتی کے چرچے ہونے لگے اور لوگوں میں آبادی گھٹانے کا رجحان پیدا ہو گیا ادھر تو یہ سب کچھ ہوا ادھر ہندوستان میں انیسویں صدی میں سیاسی غلامی کے ساتھ معاشی غلامی بھی پھیلی۔ ملک کی زراعت اور صنعت، سب تباہ ہو گئی۔ قحط پر قحط پڑے۔ بیماریاں پھیلیں۔ وبائیں آئیں۔ غرض یہ کہ حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ آبادی میں نمایاں اضافہ نہ ہو سکا لیکن جب بیسویں صدی میں بالخصوص گذشتہ دس پندرہ سال میں امن نصیب ہوا تو شرح اضافہ پھر بلند ہو گئی اور آج یورپ کے اکثر ممالک سے بلند ہے خیال ہے کہ ۱۹۳۱ء کے بعد سے ہماری آبادی پچاس لاکھ سالانہ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو بیسویں صدی کے ختم ہونے تک ہندوستان کی آبادی ستر کروڑ ہو جائے گی۔ کیا یہ حالت خطرناک اور اندیشہ انگیز نہیں ہے؟ اور وہ بھی جب کہ ہمارے پاس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی ذرایع معاش نہیں ہیں اور تخفیف آبادی کے رجحانات مفقود ہیں۔

اخلاقی ضبط ہمارے یہاں نہیں، کم سنی میں شادیاں ہو جاتی ہیں۔ مذہبی رسم و رواج ہیں کہ شادی کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کیا یہ سب چیزیں اضافۂ آبادی کے رجحانات کو ظاہر نہیں کرتیں؛ ممکن تھا کہ افلاس اور بیماری آبادی کو محدود کر دیتے لیکن مذہبی رسوم، ضبط تولید کی غیر مقبولیت اور پست درجے کے معیار رہایش کی وجہ سے یہ بھی نہیں ہو سکتا اور ہماری نوّے فی صد آبادی فاقہ کشی کی دردانگیز مصیبت میں مبتلا رہتی ہے۔

ہندوستان کے اضافۂ آبادی کو خوش آمدید کہنے والے ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صنعت اور زراعت دونوں میں محنت کی قلت کا محسوس ہونا آبادی کی کمی کا ثبوت ہے لیکن واقعہ

اس کے برخلاف ہو۔ بے شک فصل کاٹنے کے زمانے میں محنت کی طلب بڑھ جاتی ہو لیکن اس کے بعد مزدور بیکار رہتا ہو۔ بہت سے دیہاتی شہروں میں جا بسے ہیں اس لیے بھی فصل کے وقت محنت کی قلت ہوتی ہو۔ جو علاقے شہروں سے دور ہیں وہاں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آتیں۔ بنا بریں یہ کہنا غلطی ہو کہ ہر مقام پر اور ہر وقت ہندوستان میں محنت کی قلت رہتی ہو۔ صنعت میں جو محنت کی قلت پڑ جاتی ہو اس کی وجہ یہ ہو کہ مزدور کو گاؤں سے شہر میں نقل مکان کرنا دشوار ہوتا ہو۔ علاوہ ازیں صنعت میں جو قلت پیدا ہوتی ہو وہ با مہارت محنت کی ہو۔ اس لئے صنعت میں محنت کی قلت کو دور کرنے کا طریقہ اضافہ آبادی نہیں بلکہ با مہارت مزدوروں کی تربیت ہو۔

ایک اور اہم مسئلہ ہمارے سامنے خوراک اور آبادی کے تناسب کا ہو۔ ضروری ہو کہ ملک میں آبادی کی ضروریات کے لائق اچھی خوراک موجود ہو۔ ۱۹۲۲ء میں پروفیسر شاہ اور کھمباتا نے اس بارے میں تحقیقات کی تھی جس سے پتہ چلتا ہو کہ ہندوستان کے لوگوں کو ضرورت سے چالیس فی صدی کم غذا نصیب ہوتی ہو۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہو کہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے ۳۵-۱۹۳۴ء تک کے عرصہ میں آبادی میں اکیس فی صدی اور اجناس خوردنی کے رقبہ زیر کاشت میں صرف ۱۲٫۴ فی صدی اضافہ ہوا ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا ہو کہ جنگ عظیم کے بعد سے بیرونی ممالک سے ہندوستان میں اجناس خوردنی کی درآمد بڑھ رہی ہو۔ پروفیسر رادھا کمل مکرجی کا خیال ہو کہ ہندوستان میں صرف اٹھاسی فی صد آبادی کی ضرورت کے لائق غذا پیدا ہوتی ہو۔ بہر حال یہ ظاہر ہو کہ غذا کی رسد ضرورت سے کم ہو جو کثرت آبادی کی اہم نشانی ہو اور جب تک اس صورت حال کی اصلاح نہ کی جائے ملک پنپ نہیں سکتا۔

مسئلہ آبادی کا حل | خوراک کی کمی کیونکر دور کی جائے اس مسئلہ کے حل پر وقتاً فوقتاً مختلف تدابیر پیش کی جاتی رہی ہیں۔ سوال یہ ہو کہ کیونکر آبادی اور ذرائع معاش میں توازن قائم کیا جائے؟ اس کا حل تین طریقوں سے ہو سکتا ہو۔ یا تو ذرائع معاش کو موجودہ آبادی کی ضروریات کے مطابق بڑھا لیا جائے اور ان میں اتنی لچک بھی رکھی جائے کہ وہ اضافہ آبادی کے تناسب سے بڑھتے رہیں۔ یا پھر آبادی کو اتنا گھٹا دیا جائے کہ خوراک و ذرائع معاش سے متناسب ہو جائے۔ ایک تیسرا طریقہ یہ ہو کہ مندرجہ بالا دونوں طریقوں پر

ایک ساتھ حل کیا جائے۔ ذیل میں ہم ان کی مختصر کیفیت درج کرتے ہیں۔

ذرائع معاش کو وسیع کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ملک میں خوراک کی رسد بڑھادی جائے۔ اس وقت ملک میں خوردنی اور غیر خوردنی اجناس کا تناسب ۸۲ اور ۱۸ فی صدی ہے۔ غیر خوردنی اجناس چونکہ زیادہ منافع کی امید دلاتی ہیں اس لیے عموماً اچھی زمین پر کاشت کی جاتی ہیں۔ اگر غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کردی جائے تو خوراک کی رسد میں ۱۸ فی صدی اضافہ کا امکان ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کردینے کے بعد کسان لازمی طور پر خوردنی اجناس کی کاشت کرنے لگے؟ دراصل غیر خوردنی اجناس کی کاشت کی ضرورت اسے اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی کاشت کی بدولت وہ زمیندار اور سرکار کے مطالبات ادا کرتا ہے۔ اگر وہ غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کردے تو زمیندار اور حکومت کے مطالبات کہاں سے ادا کرے۔

ایک دوسری تدبیر غذا کی رسد کو بڑھانے کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ غذا کی برآمد بند کردی جائے۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں خوردنی اجناس کا کوئی بہت زیادہ حصہ برآمد نہیں کیا جاتا اور آج کل تو خوردنی اجناس کی برآمد روز بروز کم ہی ہوتی جارہی ہے۔ نیز اس تدبیر میں برآمد کو روکنے سے جو بیرونی مخالف اثرات پڑیں گے ان کے برداشت کرنے کے لیے ہمیں تیار ہونا چاہیئے۔ خوردنی اجناس کی برآمد بند کردینے سے یہ خطرہ ہے کہ کسان ان کی جگہ مزید تجارتی غیر خوردنی اجناس کی کاشت شروع کردے اور خوردنی اجناس کی رسد میں معتد بہ اضافہ نہ ہوسکے

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم بیرون ملک سے خوردنی اجناس حاصل کریں جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے غذا کی درآمد برابر بڑھ رہی ہے لیکن اس طریقہ میں نہ تو زیادہ توسیع کی گنجایش ہے اور نہ خود کفالتی کے نقطۂ نظر سے یہ طریقہ اطمینان بخش ہی ہوسکتا ہے۔ ہماری قوت خرید کم ہے۔ درآمد شدہ غذا کے بدلے میں اور ملکوں کی طرح ہندوستان کے پاس پیسہ بھی نہیں۔ ہندوستان انگلستان کا قرضدار ہے اور اس مصیبت سے نجات پانے کے واسطے خام پیداوار اور اجناس خوردنی برآمد کرتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ طریقہ زیادہ وسعت کا حامل نظر نہیں آتا۔ اگر دوسری اصلاحی تدابیر سے ہماری خریدنے کی قوت بڑھ بھی جائے تو بھی [illegible]

ہی سفارش نہیں کی جا سکتی کیونکہ جنگ کے تجربوں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ غذا کے لیے دوسروں کا دست نگر ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

شاید سب سے کامیاب تدبیر غذا کی رسد بڑھانے کی "اصلاح زراعت" ہے۔ اس عظیم الشان کام کے لیے ہمیں زراعت کے تمام مسائل جیسے آب پاشی تقسیم اور انتشار اراضی طریق زراعت اور آلات زراعت کی اصلاح اور زرعی قرضے وغیرہ کی کل مشکلوں کو حل کرنا ہوگا۔ اس کام کے لیے روپیہ اور بہت ذہین خلوص اور ہمدردی کی ضرورت ہے لیکن اسے سرانجام دیا جا سکتا ہے اور اس کی تکمیل سے ہماری آبادی کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑی مایوسی اور افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے کسانوں کو جدید ترقیات سے روشناس کرانے کی رفتار بہت سست ہے اور جہاں کہیں بھی جدید ترقیات کا پرچار کیا جاتا ہے وہاں انہیں کسان کی دسترس میں لانے کی سعی پوری طرح نہیں کی جاتی۔ تعلیم یافتہ طبقے کو سرکاری دفتروں کی خاک چھاننے کی ایسی بری عادت پڑ گئی ہے کہ باوجود ناکامی کے وہ زراعت یا صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ غضب تو یہ ہے کہ کسان کا لڑکا بھی پڑھ لکھ کر زراعت سے متنفر ہو جاتا ہے۔ زراعت اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری کثیر زرعی آبادی اسی لیے مصیبتیں جھیل رہی ہے۔

آبادی کا پیشوں میں ٹھیک تناسب سے تقسیم نہ ہونا بھی بہت سی مشکلات کا باعث ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی ۷۰ فی صد آبادی زراعت میں مشغول ہے اور بمشکل ۱۰ یا ۱۱ فی صد صنعت و حرفت میں اور ان میں سے بھی محض ایک فی صد اعلیٰ پیمانے کی جدید صنعتوں میں مشغول ہے۔ زراعت پر آبادی کا غیر ضروری دباؤ ہے۔ اگر اس زائد بار کو ہٹا دیا جائے اور آبادی پیشوں میں صحیح تناسب سے تقسیم ہو سکے تو یقیناً آبادی کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

۱۹۱۸ء کی صنعتی کمیشن نے سفارش کی تھی کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں صنعتی ترقی کی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ ملک میں قدرتی ... ملک کی ... اگر سرمایہ اور مہارت کی ضروریات پوری طرح مہیا ہو جائیں تو صنعتوں کی ترقی کے ... [illegible] ... کے ساتھ یہ ... [illegible] ... ہم ... [illegible]

صنعتی ترقی سے پیدا شدہ مشکلات کا شکار نہ ہونا پڑے۔ باوجود اس کے کہ انگلستان اور امریکہ میں صنعتی ترقی انتہا کو پہنچ گئی ہے وہاں کی کثیر آبادی کا گزارا پیمانہ کبیر کی صنعتوں پر نہیں اور بیکاری کی لعنت وہاں بھی پائی جاتی ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید سائنسی صنعتی نظام میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ روزگار میں اس مناسبت سے اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سرمایہ داروں کا نظام چند خوش نصیبوں کی مدد کرتا ہے۔ بڑی بڑی مشینیں اور کلیں سیکڑوں آدمیوں کا کام انجام دیتی ہیں۔ اعلیٰ پیمانے کے انتظام کی بدولت مزدوروں کی اور بھی بچت ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ ہندوستان اپنی تمام مصنوعات کو خود صرف میں لا سکے کیونکہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد جو اندازہ لگایا گیا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف نوے فی صد آبادی مصنوعات خریدنے کی استعداد رکھتی ہے۔ ملک کی آبادی میں ہر سال ایک فی صدی اضافہ ہوتا رہتا ہے جس کا لحاظ کرتے ہوئے صنعتی پیداوار کی مقدار دوگنی بھی کر دی جائے تو بھی صرف اسی اضافہ شدہ آبادی کے لئے روزگار فراہم ہو سکے گا۔ پھر ہر سال صنعتی پیداوار کو دوگنا کرنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ بالغرض اگر ہندوستان اس میدان میں اتنی ترقی بھی کر لے کہ تمام آبادی جدید صنعتوں میں مصروف ہو جائے تو پیداوار اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کی کھپت ناممکن ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے ملک میں بیرونی مصنوعات کی درآمد بالکل بند کر دیں اور ہندوستان کو محض ایک برآمد کرنے والا ملک بنا دیں۔ واضح رہے کہ آج کل تجارت مبادلہ اشیا کے اصول پر چلتی ہے اگر آپ کے ملک میں بیرونی اشیا کی درآمد نہ ہوگی تو آپ بھی اپنی اشیا برآمد نہ کر سکیں گے۔ پھر آج کل خود اکتفائی کے چرچے ہو رہے ہیں اور غیر ملکی اشیا کے ہر ملک میں نئے نئے بدل تلاش ہو رہے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے اس قسم کی توقع کرنا عبث ہے

چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی ترقی کے یہ معنی نہ لیے جائیں کہ ہم بڑے پیمانے کی صنعتوں کو بالکل ہی بند کر دیں گے البتہ ان کو ناگزیر حدود تک محدود کر دینا ہوگا۔ وہ جاری رہیں گی مگر ان کی حد تعین کیا جائے گا کہ چھوٹی اور متوسط پیمانے کی صنعتوں میں کام کرنے والوں کے مفاد کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچ... کے عمل دخل سے پہلے ہندوستان اپنی بیشتر ضروریات کے لیے خود مکتفی رہا ہے جس کا سبب چھوٹی اور متوسط

صنعتوں کا رواج تھا۔ آج بھی اگر چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی طرف پوری توجہ دی گئی تو اس پست حالی کا خاتمہ مشکل نہیں۔ ضرورت ہو کہ ان صنعتوں کے لیے منظم اور باقاعدہ بازار فراہم کیے جائیں اور ان کی فروخت منظم طریقے پر ہو۔ جاپان میں موزہ بنیان وغیرہ کے کام نے منظم پیدائش اور فروخت کی بدولت اتنی شاندار کامیابی حاصل کر لی مگر ہندوستان میں غیر منظم پیدایش اور بے قاعدہ فروخت کی وجہ سے اس کے کام کو جاپان کی سی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

کسی ملک کی آبادی کو اثر انداز کرنے والی ایک چیز نقل وطن بھی ہو۔ نقل وطن سے آبادی کم ہوتی ہو انیسویں صدی میں نو آبادیات میں ترطن کی بدولت یورپ میں آبادی کے لئے بہت کافی گنجایش نکل آئی تھی ہندوستان والوں کے لیے نقل وطن کے امکانات زیادہ وسیع نہیں۔ کچھ تو ذات پات کے طریقے کی وجہ سے ہندوستانی کو غیر ذات والوں کے ساتھ رہنے سے آرام نہیں ملتا۔ کچھ رسم و رواج اور مذہبی خیالات بھی نقل وطن کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر ہمارے ملک کا عام پیشہ زراعت بھی اس قسم کا ہو کہ ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آج کل صرف ۲۵ لاکھ ہندوستانی بیرونی ممالک میں بستے ہیں۔ اکثر ممالک میں ہندوستانیوں کے داخلہ پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ خود حکومت نے ۱۹۳۸ء میں ایک بل پاس کیا جس سے ملایا میں ہندوستانیوں کا نقل مقام تقریباً ناممکن ہو گیا۔ ملک کے باہر نقل مقام روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہو لیکن اب بھی کچھ عرصہ تک برما اور سیلون میں ۱۴۰۰۰ آدمیوں کے لیے گنجایش موجود ہو۔ علاوہ ازیں برٹش گیانا میں بھی کافی آبادی کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ وہاں کی موجودہ آبادی ۳۰۴۰۰۰ نفوس ہو۔ اور اس سے کئی گنی زیادہ آبادی سما سکتی ہو۔ ۱۹۲۲ء کے قانون نقل وطن میں یہاں ہندوستانیوں کو بسانے کی اسکیم بھی بنائی جا چکی ہو مگر ابھی تک اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی

ادھر اندرون ملک بھی آبادی کا مختلف علاقہ جات میں توازن قائم کیا جا سکتا ہو۔ آسام اور سی۔ پی میں دوسرے صوبوں کی زائد از ضرورت آبادی کی اچھی خاصی تعداد کھپ سکتی ہو۔

اگر ذرائع معاش کے ساتھ ساتھ آبادی بھی بڑھتی رہے اور آبادی کا یہ اضافہ ذرائع معاش کے اضافے سے زیادہ یا متناسب ہو تب بھی ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ انتہائی ضروری ہو کہ

آبادی کے اضافہ کے رجحانات کو کم کر دیا جائے اور موانعات اقتناعی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے سماجی رواج اور مذہبی عقاید جلد شادی کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ ہماری آبادی کا معیار رہایش اس قدر پست ہو کہ بہت جلد اسے حاصل کر لیتا ہو جس کے بعد فطری طور پر اسے شادی کی ترغیب ہوتی ہو۔ دیر سے شادیاں ہمارے ہاں بہت کم ہوتی ہیں۔

بہی خواہان ملک کا پہلا فرض ہو کہ اس خراب حالت کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیں۔ رسم و رواج اور مذہبی خوش اعتقادیوں کے اس طلسم کو توڑ دیں۔ ملک کی دولت میں اضافہ کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ اعلیٰ معیار رہایش حاصل ہو نشر و تبلیغ کی مدد سے اخلاقی ضبط پیدا کیا جائے۔ لوگوں میں صحیح قسم کی تعلیم پھیلائی جائے تاکہ ان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو سکے

وہ زمانہ اب گزر چکا جب ضبط تولید کی حمایت میں پمفلٹ شائع کرنا جرم خیال کیا جاتا تھا۔ تاریخ رچرڈ کارلائل کی ممنون ہو کہ اس نے ضبط تولید پر اظہار خیال کی پابندیاں اٹھوا دیں۔ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی ضبط تولید کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں۔ ضبط تولید کی تحریک کا یہ پہلو بھی کچھ کم قابل غور نہیں کہ اس کا رواج امرا میں زیادہ ہو جن کی قوت تولید پہلے ہی گھٹی ہوئی ہو۔ عوام کی معاشی حالت انھیں اجازت نہیں دیتی کہ ضبط تولید کے قیمتی آلات استعمال کریں لیکن سائنس کی ترقی کی بدولت اچھے اور بے ضرر طریقے ضبط تولید کے رائج ہو چکے ہیں اور وہ عوام کی دسترس سے باہر بھی نہیں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے ضبط تولید کو برا بتایا جاتا ہو۔ اس کا جواب ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد کی زبانی سنیئے۔ نومبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ "الحکیم" میں ڈاکٹر اقبال مرحوم رقمطراز ہیں۔

"اگر حفظ نفس مقصود نہ ہو۔ حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضامند ہوں تو جہاں تک میرا علم راہ نمائی کرتا ہو شرعاً ضبط تولید قابل اعتراض نہیں۔"

اسی رسالہ میں مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں :-

"بلا شبہ ضبط نفس اصل آئیڈیل ہو لیکن معلوم ہو کہ وہ عملاً چل نہیں سکتا کم از کم اس وقت

تک کا انسانی تجربہ یہی ہے ایسی حالت میں جو لوگ طبی، منزلی، خاندانی، اجتماعی اور اقتصادی مقتضیات پر زور دیتے ہیں یقیناً ان کے دلائل کی قوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ ضبط تولید سے لوگوں کو اپنے اخلاقی جرائم کے چھپانے کا موقع مل جائے گا اور ان میں بد اخلاقی پھیلے گی لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ سوسائٹی ان تمام مفید کاموں کو ترک کر دے جن کا بعض لوگ غلط طریقے پر استعمال کرتے ہیں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ضبط تولید بذریعہ ضبط نفس کیا جائے اور اس صورت میں کوئی اخلاقی جرم عائد نہ ہوگا۔

جب علامہ اقبال مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ٹیگور آنجہانی (خط بنام مارگریٹ سینگر از کتاب "ضبط تولید کے لیے میری جدوجہد") اور مسز سروجنی نائیڈو (تقریر مستورات کانفرنس کراچی منعقدہ ۱۹۳۱ء) جیسی مقتدر ہستیاں ضبط تولید کی موافقت میں رائے دے چکی ہوں اور ملک کے حالات کا تقاضا بھی یہی ہو تو ضبط تولید کو ملک میں مقبول کرانے کی سر توڑ کوشش کرنی چاہیئے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تعلیم کے ذریعہ عوام میں ذمہ داری کا احساس پیدا نہ کیا جائے ہماری تعلیم بھی اس قسم کی ہونی چاہیئے جو ذہنی قوتوں کے ساتھ عمل کی طاقت کو بیدار کر سکے تاکہ پڑھ لکھ کر ہم روزگار سے لگ سکیں نہ کہ ملک کی آبادی میں پڑھے لکھے بیروزگاروں کا اضافہ کریں۔

وقت کی پہلی ضرورت ہے کہ حکومت اور ملک کے بہی خواہ تن من سے آبادی کے نازک مسئلے کو حل کریں جب تک ان تمام تدابیر پر بیک وقت پوری قوت کے ساتھ عمل نہ کیا جائے گا یہ کٹھن مسئلہ سلجھ نہیں سکتا۔ آبادی کے مسئلے کے حل میں ہمارے مستقبل کی تمام تابناکیاں پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ بھوکی ننگی آبادی کبھی سربرآوردہ نہیں ہو سکتی۔

آیۃ اللہ بیگ عارف

اسٹیلن کا روس

رسالہ جامعہ کی اشاعت ۱۰ ستمبر میں مسٹر م-م جوہر میرٹھی کا ایک مضمون بعنوان "جرمنی اور سوویٹ جنگ" شائع ہوا ہے۔ یہ لینن اور ٹروٹسکی کا خیالی مکالمہ ہے جو ٹروٹسکی کی کتاب (The Revolution Betrayed) کو بنیاد قرار دے کر لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں جوہر صاحب نے اسٹیلن اور ٹروٹسکی کے مشہور اختلاف سے متعلق ٹروٹسکی کی تائید کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسٹیلن اور اس کی پارٹی نے روس کو تباہ کر دیا ہے اور اشتراکی نظام کو بھلا دیا ہے۔

مضمون نگار نے اس واقعہ کو حقیقت تسلیم کر کے بحث اُٹھائی ہے کہ ٹروٹسکی لینن کے اشتراکی نظریوں کا صحیح پیرو تھا اور اسٹیلن نے لینن کی اشتراکیت سے غداری کی ہے۔ حالانکہ اس بحث میں بنیادی طور پر اسی مسئلہ پر پہلے بحث کرنا چاہیے تھی لیکن جوہر صاحب نے اس کو ضروری خیال نہیں کیا۔

آپ نے آج کے روس پر یہ اعتراضات کیے ہیں۔

۱- روس کی اقتصادی حالت افسوس ناک ہے۔

اس ضمن میں روس کے ذمہ دار افسروں کے اقوال سے استناد کیا گیا ہے۔ اور آخر میں روس کے ساتھ جرمنی، امریکہ اور انگلستان کی معاشی اور صنعتی حالت کے اعداد و شمار دیے ہیں اور دونوں کے توازن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ روس کی حالت مذکورہ ممالک کے بالمقابل بہت ابتر ہے۔ جرمنی کی بڑھی ہوئی صنعتی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لینن کے یہ خیالی جملے آپ نے لکھے ہیں۔

"سنتا ہوں کہ ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹیلن ۱۵ سال میں نہ کر سکا۔"

۲- اسٹیلن نے بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کو بھلا دیا جو لینن کا واحد مقصد تھا اور اس راہ میں اتنا مبالغہ کیا کہ موجودہ جرمنی روسی جنگ کے شروع ہونے پر سوویٹ احرار نے حسب ذیل نعرے لگائے:-

"... اور وطن کو بچاؤ۔ سوویٹ کی ایک انچ زمین کے لیے خون بہا دو۔ سوویٹ قوم کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو"

کہنا یہ ہو کہ روسی رہناؤں نے بین الاقوامیت کے بجائے قومی تصور کو اپنا لیا ہو۔

۳۔ روس نے بین الاقوامی انقلاب کا خیال چھوڑ کر اس عظیم پرولتاری امداد سے خود کو محروم کر لیا ہو جو روس کی تائید میں بہت مفید ثابت ہوتی۔

۴۔ چونکہ روسی سماج میں ذاتیں بن گئی ہیں اس لئے فوج میں بھی ذاتیں بنی ہوئی ہیں۔ اس ذات سازی کا نتیجہ یہ ہو کہ روسی سپاہ بالکل ناکارہ ہو اور صرف ۱۲ دن میں جرمن فوج اتنی بڑھی کہ ماسکو کو خطرہ پیدا ہو گیا ___ سوویٹ کی فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔

جوہر صاحب کے یہ اعتراضات نئے نہیں ہیں یہ وہی آوازیں ہیں جو امریکہ اور برطانیہ کے سرمایہ دار پریس سے رہ رہ کر بلند ہوتی رہتی ہیں۔ اور ذہین وچالاک بورژوا اہل قلم مختلف اسالیب میں انھیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ذیل میں سرسری طور پر میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ مضمون نگار نے کس طرح واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہو اور یہ کہ اصل حقیقت بیان کردہ واقعات سے کتنی مختلف ہو۔

لینن اور ٹروٹسکی | مسٹر جوہر کے مضمون کا یہ بنیادی نظریہ ہی سرتاپا غلط ہو کہ ٹروٹسکی کی رائے لینن کے فلسفے کی تائید میں تھی۔ لینن اور ٹروٹسکی کے درمیان اختلاف رائے ۱۹۰۳ء ہی سے شروع ہو گیا تھا جب لندن کانفرنس میں بالشویک اور منشویک الگ الگ ہوئے تھے۔ لینن بالشویک پارٹی کا لیڈر تھا مگر ٹروٹسکی اس اختلاف میں لینن کی تائید میں نہیں تھا وہ بالکل غیر جانبدار رہا۔ اسی طرح ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۷ء کے انقلابوں میں بھی لینن اور ٹروٹسکی کے درمیان اختلاف رائے رہا۔ لیکن اس تمام مدت میں اسٹیلن برابر لینن کی پارٹی کا روح رواں رہا اور ان دونوں انقلابوں میں لینن کا نقطہ نظر ہی صحیح ثابت ہوا۔

یہ کہنا طرشدہ تاریخی حقیقتوں سے انکار کرنا ہو کہ روس کی فوجی، سیاسی اور معاشی حالت مکمل کیے بغیر بین الاقوامی انقلاب لانے کا تصور لینن کا نقطہ نظر تھا اس لیے کہ لینن نے خود کہا تھا۔

"ہمیں روس کو اتنا مضبوط کر دینا چاہیے کہ وہ تنہا سرمایہ دار ملکوں کا مقابلہ کر سکے"

جو ہر صاحب ٹرٹسکی کی اس تجویز پر کہ

"روس میں ایک بڑا ریڈیو اسٹیشن تیار کیا جانا چاہیے"

اسٹیلن کے اس جواب کا مذاق اڑاتے ہیں کہ

"بجلی کا اسٹیشن بنانا روس جیسے پس ماندہ ملک کے لیے ایسا ہے جیسے کسی کسان کا بجائے گائے کے گراموفون خریدنا"

حالانکہ عملی سیاست کو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اسٹیلن کے اس جواب کی کیا اہمیت ہے۔ اسٹیلن کے سامنے روس کی ۱۶ کروڑ آبادی اور اس کی ابتدائی ضروریات تھیں۔ بڑے ریڈیو اسٹیشن کا قیام کیا قوم کی ابتدائی ضروریات میں ہے؟ اسی پالیسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج روس میں خواہ ریڈیو اسٹیشن ہوں یا نہ ہوں لیکن بھوک فاقہ اور تباہ حالی کا وہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔

روس کی معاشی حالت | روس کا مقابلہ جرمنی، امریکہ اور انگلستان سے کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ ممالک مدتوں سے ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی صنعتی حالت صدیوں سے ارتقاء کی مرہون منت ہے اور روس قبل جنگ ۱۹۱۴ء ایک زراعتی ملک تھا لیکن امریکہ، انگلستان اور جرمنی انیسویں صدی ہی میں صنعتی میدان میں کافی ترقی کر چکے تھے۔

یقیناً پراودا، اسوستیا، موتوتوف اور رلیتوتوف کا یہ کہنا صحیح ہے کہ

"ہماری صنعت ردی حالت میں ہے"

لیکن ان بیانات کا وہ مفہوم نہیں ہے جو کسی سرمایہ دار ملک کی صنعتی تباہ حالی کے ضمن میں دیا جاتا ہے اس لیے کہ جس وقت پراودا یہ لکھتا ہے کہ

"کپڑے کی صنعت بہت ردی حالت میں ہے"

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ روس کے ۱۶ کروڑ انسانوں کی ضروریات کے پیش نظر وہاں کی صنعتی حالت ناقابل اطمینان ہے لیکن جب لندن کا ٹائمز یا نیویارک ٹائمز یہ اعلان کرتے ہیں کہ

"ہماری صنعتی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہے"

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ امریکہ اور انگلستان کے کارخانے جو محض تجارتی مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں اپنے مقصد کو پورا کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس لیے جوہر صاحب کا روس کے ذمہ داروں کے کا اس طرح نقل کرنا کہ پڑھنے والا وہ مفہوم سمجھے جو عام طور پر سرمایہ دار ممالک کی بابت سمجھنے کا وہ عادی رہا بالکل گمراہ کن ہے۔ روس کی صنعتی حالت اس کی ضروریات کے مطابق ناکافی ہے لیکن زاری روس سے مقابل کئی گنا ترقی یافتہ ہے۔

جوہر صاحب کا یہ کہنا کتنا غلط ہے کہ فرانس میں تقریباً سوا تین لاکھ موٹریں ہیں اور روس میں صرف تقریباً سوا لاکھ لہٰذا روس کی حالت میں اشتراکیت نے کوئی انقلاب نہیں کیا۔ حالانکہ وہ یہ اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے یہ بھول گئے کہ یہ سوا لاکھ موٹریں اس روس کے پاس ہیں جہاں سنہ ۱۹۱۷ء سے پہلے چند گنتی کی موٹریں تھیں اور اس سوا تین لاکھ موٹریں رکھنے والے فرانس کے پاس سنہ ۱۹۱۷ء سے پہلے بھی موٹریں موجود تھیں۔ اشتراکیت کوئی منتر نہیں ہے کہ اُسے پھونکتے ہی صنعتی مجسمہ زمین سے اُبھر کر کھڑا ہو گیا۔ فلسفہ کی حیثیت سے وہ عبارت ہے اس سماجی طریقے سے جو عوام کی قوت پیداوار کی صحیح مقصد میں رہنمائی کرتا ہے اور ساتھ ہی خود قوت پیداوار میں بھی شدت پیدا کر دیتا ہے چنانچہ روس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلے دوسرے اور تیسرے پنجسالہ پروگرام کے اعداد و شمار اس واقعہ کی پوری تائید کرتے ہیں۔ روس کے ان پروگراموں کو اتنی کامیابی ہوئی کہ سرمایہ داروں کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک امریکہ کے صدر اعظم مسٹر روزویلٹ نے بھی ایک پنجسالہ اسکیم کا اعلان کر دیا۔

روس اور جرمنی | جوہر صاحب نے اشتراکی روس اور نازی جرمنی کا توازن کرتے ہوئے لینن کا خیالی قول لکھا ہے کہ

"سنتا ہوں ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹالن ۱۰ سال میں نہ کر سکا۔"

معلوم نہیں مضمون نگار نے یہ قول کن اسباب کی بنا پر کیا ہے کیا اس لیے کہ ان کے نزدیک جرمنی کی جارحانہ طاقت روس سے زیادہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ روس اور جرمنی کی اصولی حالت سے قطعی بے خبر ہیں انہیں معلوم نہیں کہ سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک روس میں کیا ترقیات

روس اور جرمنی میں اس سلسلہ میں کیا نئے اصلاحی اور اختراعی قدم اٹھائے گئے اور ان دونوں میں کیا نسبت ہے۔

جہاں تک جرمنی کی اس ۲۱ سالہ ترقی کا تعلق ہے میں مضمون نگار کو یہ یاد دلاؤں گا کہ جرمنی میں نئی بھاری صنعتوں کا احیا امریکی اور یورپی سرمایہ داروں کی امداد کا مرہون منت ہے اگر واشنگٹن اور لندن کے بنک برلن کی مدد نہ کرتے تو کسی طرح بھی ہٹلر کا جرمنی آج وہ طاقت حاصل نہ کر سکتا جو وہ حاصل کر چکا ہے۔
تاہم جرمنی کی طاقت کسی طرح سوویٹ روس کی ترقیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی آج کل جرمنی اور ہٹلر کی بڑی طاقت ان کی فوجی کامیابیاں بتائی جاتی ہیں لیکن اگر اس حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو جرمنی کی فوجی قوت روس کی طاقت کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی جیسا کہ گذشتہ ڈھائی ماہ کی روسی جرمن جنگ سے ظاہر ہے کہ اس مدت میں جرمنی ـــ جس کے ساتھ فن لینڈ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، اطالیہ جیسے نیم آزاد یورپی ممالک اور آسٹریا، پولینڈ، چیکوسلوویکیہ، ناروے، یونان اور دوسرے مقبوضہ یورپی ممالک کی فوجی طاقت ہے ـــ روس کو کوئی خاص اور قابل ذکر نقصان نہیں پہنچا سکا۔
یاد رہے کہ اگر اس جنگ میں جاپان شامل ہو جاتا ہے تو بھی روس کا یہ محوری بال بیکا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ روس کی سائبیریا کی فوج بالکل خود مختار ہے۔

روس کی اہم فوجی قوت کا اقرار خود جرمن ماہرین نے بھی کیا ہے چنانچہ جرمنی کے مشہور فوجی جرنیل ہمان نے ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کے مشہور جرمن اخبار دوئیچی دہر میں مختلف ممالک کی مسلح فوج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"روس کی فوجی طاقت آج تمام دنیا کے لیے چیلنج ہے۔ وہ ہر طرح جدید ترین اسلحہ سے آراستہ ہے۔ اس کی تربیت نئے اور ترقی یافتہ اصول کے ماتحت کی گئی ہے۔"

ابھی اس جنگ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اطالیہ کے مشہور اخبار ریویو ڈی اٹیلیہ کے فوجی تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ

"روس کے ساتھ جنگ میں محوریوں کو لمبی مدت کے لیے اپنی فتح کے خیالات کو ختم کر دینا چاہیے۔ روسیوں نے

ناقابلِ تسخیر بنا لیا ہے۔ محوریوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری مضبوط اور زبردست طاقت
کو احتیاط کے ساتھ ٹکراتے رہیں"

ان حالات میں جوہر صاحب کا یہ لکھنا کہ

"سوویٹ کی فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں"

ایک غیر ذمہ دارانہ اظہارِ رائے کے علاوہ اور کیا ہے۔

بین الاقوامی پرولتاریہ کی مدد! جوہر صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ بین الاقوامی انقلاب کے تصور کو چھوڑ کر اسٹیلن نے اس عظیم پرولتاری مدد کو کھو دیا ہے جو ایسے نازک وقت میں اسے بہت امداد دیتی۔

معلوم نہیں موصوف نے کن اسباب کی بنا پر یہ اعتراض کیا ہے جبکہ معلوم ہے کہ روس پر جرمن حملہ کے ساتھ ہی تمام یورپی ممالک کے پرولتاری اور انقلابی گروہوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے جرمن سامراج کے خلاف عملی جدوجہد شروع کر دی۔ فرانس ناروے، اطالیہ اور یوگوسلیویہ اور بلغاریہ کے نئے حالات اس واقعہ کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اگر بین الاقوامیت کی طرف کمیونسٹ انٹرنیشنل مزید توجہ دے سکتی تو یورپ کی بےچینی زیادہ شدید ہوتی لیکن اس خیال کے پیش نظر اس وقت جبکہ دو منظم اور تربیت یافتہ فوجیں سائنس کے خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر گتھی ہوئی ہیں یہ کہنا کہ روس کی طاقت محض پرولتاریہ ہیں محض ایک طرح کی رومانیت ہے۔ پرولتاریہ ضرور روس کی طاقت ہیں لیکن یہ طاقت مخصوص اور متعین حالات میں ایک طاقت ہے اس وقت اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے جب تقریباً دو ہزار میل کے میدان جنگ میں تقریباً ایک کروڑ فوجیں اَن گنت سامانِ جنگ کے ساتھ ٹکرا رہی ہوں اگر روس سرمایہ دار جرمنی سے مقابلہ کرنے کے معاملہ میں فقط بدیسی پرولتاریہ کے انقلابی اقدامات پر اطمینان کر کے چپ بیٹھ جاتا تو جرمن افواج ولاڈی واسٹک بھی پہنچ جاتیں اور پرولتاریہ تک اطلاع بھی نہ پہنچتی۔

جوہر صاحب کو روس پر اعتراضات کرنے میں نسبتاً سنجیدگی اختیار کرنا چاہیے کہ ان کے اعتراضات کی نوعیت سرمایہ پرستوں کی جاہلانہ ذہنیت کی چغلی کھاتی ہے۔

محمد تقی اودھوی

علامہ اقبال کا فلسفہ

گزشتہ مہینے کے جامعہ میں ایک مختصر مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے۔ "علامہ اقبال کا فلسفہ" مدیر صاحب نے دعوت دی ہے کہ اس پر کچھ اظہار خیال کیا جائے۔ اس لیے میں نے مضمون بغور دیکھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ عنوان تو بہت وسیع ہے مگر بحث اتنی وسیع نہیں۔ اصل بحث کے اعتبار سے صحیح عنوان "اقبال کا فلسفۂ عقل و دل" ہو سکتا تھا۔

مدیر صاحب نے اپنے نوٹ میں فاضل مصنف کے اصل خیال کی وضاحت کر دی ہے۔ مگر مضمون کے پڑھنے سے مجھے علم نہ ہو سکا کہ کن اصولی طریقوں سے عقل و دل کے فلسفہ پر نظر کی گئی اور جو نتائج نکالے گئے ہیں ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔

جب کسی شاعر کے فلسفہ یا پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اس سے اختلاف اور اتفاق کیا جائے تو ضروری ہے کہ ہم اس انتشار اور پیچیدگی کو دور کر دیں جو اس موضوع میں پائی جاتی ہے یا مشکل موضوع پر سوچتے وقت خود فکر کرنے والے کے دماغ میں موجود رہتی ہے۔ واضح فکر اور سکون دماغ ادب عالیہ پر تنقید کرنے کے سنگ بنیاد ہیں۔ جو صاف سوچتا نہیں وہ صاف لکھتا نہیں۔

ہم ان تمام الجھنوں سے نکل کر جو مکالمہ میں پیدا کیے گئے ہیں اور ان لفظی گورکھ دھندوں سے دور ہو کر جو اختر اور یوسف کی گفتگو میں پائے جاتے ہیں مصنف کی اس بحث پر کہ اقبال کا فلسفہ عقل و دل کیا ہے! جب غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کی ابتدا ہی ایسے اصول سے کی گئی ہے جو شعری تنقید کے لیے زیادہ موزوں نہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ مصنف شاعر کے کلام کی جراحی اور نثری تحریر سے کلام کا نشتر تقابل کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس کے پیام کا تعین ہو سکے مجھے افسوس ہے کہ اردو شعر و ادب کی تنقید سے یہ عام طریقہ دور نہ ہو سکا۔

اقبال کے منکرین عام طور پر تین قسم کی پیچیدگیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

۱- وہ اقبال پر وضاحت نظر اور سکون دماغ کے ساتھ غور نہیں کرتے بلکہ بے ذہنی کے ایک معذرت میں

کو پڑتے ہیں جن کو ختم کرنے کے بعد باہر نکل آنے کا راستہ نہیں ملتا اور انھیں سوائے ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔

۲۔ اقبال جیسے مفکر اور شاعر پر اس کے علمی معیار اور بلند مقام کا صحیح اندازہ کیے بغیر رائے زنی کی جاتی ہے حالانکہ اس ذی علم اور ذی ہوش انسان کے فکر و نظر پر اسی وقت بحث ہو سکتی ہے جبکہ اس کے متعلقہ علوم پر نقاد کو بھی دستگاہ ہو۔

۳۔ اقبال کے فلسفے یا پیغام کا بہ حیثیت مجموعی کم اندازہ کیا جاتا ہے اور تجزیہ زیادہ۔ نفسیات، ادبی تنقید کے عالمی اصول اور جمالیات جیسے علوم سے ہٹ کر تحقیقات کی بنیاد متفرق تجزیے یا تقابل پر رکھی جاتی ہے حالانکہ تجزیے سے زیادہ ربط (Synthesis) کی ضرورت ہے۔

اس انداز کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑے شاعر کا پیغام اپنی فطری سادگی، اصلیت اور راست نفسیاتی اثر سے دور ہو کر بحث کرنے والوں کی ذاتی علمیت اور دلائل میں گم ہو جاتا ہے دوسرے .... اقبال کی تشریح و توضیح میں اتنی ہی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے جتنی کہ شرح کرنے والے کے دماغ میں رہتی ہے۔ قرآن مجید کی تفسیروں نے جس طرح قرآن کو آیات بینات کی حدوں سے نکال کر فقہ، تصوف اور کلام کی گتھیوں میں الجھا دیا اسی طرح اندیشہ ہے کہ اقبال اور اس کا کلام جو تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہمارے فہم و ادراک، جذبہ اعتراف و قبول اور ہماری شعوری زندگی کے قریب رہنے کی بجائے علمی بحث اور انفرادی منطق میں نہ گم ہو جائے۔

نفس مضمون پر غور کرنے سے قبل حسب ذیل تین امور کو ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

۱۔ شاعر اقبال فلسفی نہیں ہے۔ فلسفی کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو ابتدا سے مسائل پر ایک خاص نقطۂ خیال، انہماک اور علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا ہے اور آخر وقت تک ان کی تحقیقات مدون کر کے ایک نظام فکر متعین کرتا ہے۔ اس نظام فکر میں معقولیت، مرکزیت، ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزیں ہوتا ہے۔ شاعر کے حکیمانہ خیالات کو فلسفے سے متصادم نہیں کیا جا سکتا۔ میری رائے میں فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے کیونکہ فلسفی ایک ذی شعور انسان سا پاسبانِ عقل کا محکم

منطق اور معقولیت کا شکار رہتا ہے اور اس کے برعکس شاعر ایک جذباتی انسان شعور منطق اور ادراک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیائے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنانے والا۔ ہاں اگر کلام کی نوعیت اس قسم کی ہو تو بعض شاعروں کے عمیق تصورات کو حکیمانہ شاعری کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس شاعری کا کوئی مستقل نظام فکر یا معقول اور منطقی محاذ قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کرکے اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکیں۔

۲۔ جس طرح شعر کی دنیا فلسفہ نہیں ہوتی اسی طرح وہ کوئی منطق یا نظام العمل بھی نہیں ہوتی جسے ہم کانگریس یا مسلم لیگ کے پروگرام کی طرح اپنی زندگی کا ایک راست اور بالا رادہ لائحہ عمل بنا سکیں شاعر کسی نصب العین کی جھلک دکھاتا اور اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہے جس کا مقصد عقل کے بندوں کو تشفی بخشنا یا قایل کرنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو دلفریب بنانے کے لیے جذبات اور احساسات سے کھیلتا ہے ممکن ہے اس طریقے سے عقل بھی بیدار ہو جائے۔

۳۔ اقبال خوش قسمتی سے کہیے یا بدقسمتی سے نثر نویس بھی تھا۔ اس نے چند مقالے لکھے اور تقریریں کیں ہم اُن سے اس کی تعلیمات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور نظریات اور عالمانہ خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ شعری دنیا میں یہ عالمانہ خیالات داخل ہو کر کیا اپنی اصلیت قایم رکھ سکتے ہیں؟ یا کسی دوسرے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں؟ شاعری کس طرح خیالات میں رنگ آمیزی کرتی اور اُن میں کیا وسعت اور اثر پیدا کرتی ہے۔ وہ خود شاعر نہیں جانتا اس لیے اقبال کے نظریات اور فلسفیانہ عقاید کو معلوم کرنے کے لیے اس کی تقریروں اور مقالوں کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے لیکن ان اصولوں کو شعر کے ذریعے سمجھنے کے لیے دنیائے شعر کی جادوگری کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ میں ۵۰ سال سے متواتر اقبال کے کلام سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے اس کی پہلی نظم کو ہمالہ کے بعد سے برابر ان کے ارتقائے خیال کا مطالعہ کیا ہے اور لفظی بحثوں سے ہٹ کر ہمیشہ شاعر اقبال میں انسان اقبال کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں جب کبھی اس کے کلام اور فلسفے پر غور کرتا ہوں تو ان کے اعتقاد

تشبیہات اور استعارات کے بہت پیچھے نفسِ شعور ادراک اور احساس کی اس دنیا میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں سے خیال کی آفرینش ہوتی ہے۔ اور وہ خیال اپنی کئی نفسیاتی منزلیں طے کرتا ہوا شعر کے قالب میں اپنی نمود حاصل کرتا ہے۔ غالب نے کہا تھا ؎

بینیم از گداز دل، در جگر آتشے چو سیل   غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

اس کے مطابق شعر کے سمجھنے کا میرا بنیادی اصول رہا ہے کہ میں شعر کے الفاظ پر (جو عکسِ خیال ہوتے ہیں خیال نہیں ہوتے) غور کرنے کے بجائے گدازِ دل کو محسوس کروں اور رہ بہ ضمیر حاصل کروں۔ اس طرح میں شاعر کو بغیر دیکھے ہوئے اس کی شعری تصویر پر ناز کرتا ہوں۔

فاضل مصنف کے مضمون میں جو طریقۂ فکر و استدلال ہے اس سے مجھے اصولی اختلاف ہے۔

اقبال کے ذہنی ارتقا پر مسلسل غور کرنے والے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اقبال میں شروع ہی سے دو متضاد قوتیں موجود تھیں ایک عقل کے راستے سے غور و فکر، دوسرے دل کے راستے سے مشاہدۂ باطن۔ اقبال کو کچھ دنوں بعد جب ان دونوں قوتوں پر تھوڑا سا اعتماد ہو گیا تو اس نے کہا ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ   سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

ان دو قوتوں کو اقبال ہمیشہ اپنے سینے میں دبائے ہوئے رہے۔ وہ ایک طرف "درسِ حکیمانِ فرنگ" یعنی فلسفہ دوسری طرف "صحبتِ صاحب نظراں" یعنی مشرقی تصوف کو اپنی شاعرانہ زندگی کی روح بنائے رہے لیکن یہ دو قوتیں آگ اور پانی کی طرح اس کے دل میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہیں۔ اگر ہم بانگِ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک اس کی تصانیف کا مسلسل مطالعہ کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعرانہ زندگی اور خیال کی مختلف منزلوں پر یہ دو قوتیں کس طرح متصادم ہوتی رہیں۔ نتیجہ کیا نکلتا رہا اور ان دونوں کے باہمی تصادم کا مآل کیا ہوا۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ہمیں اس کی جملہ تصانیف میں تین کا مطالعہ ضروری ہے۔ ایک بانگِ درا، دوسرے پیامِ مشرق، تیسرے جاوید نامہ۔ باقی تصانیف ان تین اہم تصانیف کے درمیانی خلا کو پُر کرنے والی ہیں یا وہ کڑیاں ہیں جو خیال کے ان تین ممتاز مقامات کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔

بانگِ درا میں اقبال ایک نوخیز شاعر ہے جو ذوقِ جستجو کا شکار ہے لیکن اسکے سوالات کا جواب نہیں ملتا۔ پیامِ مشرق میں اس کے سوالات حل ہونے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے جوابات کو مشرق کی زبان سے مغرب والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جاوید نامہ میں مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ فکرِ اقبال کے مکمل شباب اور پختگی کا زمانہ ہے۔ اس میں وہ اپنے فلک پرواز خیالات اور نظر کے جملہ مقامات کو ان کی معنویت کے ساتھ دکھا دیتا ہے۔ یہ سہ منزلہ عمارت اقبال کی شعری تعمیر کا ایک مکمل نمونہ بن سکتی ہے جس میں دیگر تصانیف کی کھڑکیاں، برآمدے اور دروازے لگے ہوئے ہیں۔

پیامِ مشرق کی منزل پر اقبال ایک قسم کی کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کے بعض سوالات کا جواب ملتا ہے اور بعض کا نہیں لیکن اس کش مکش میں وہ جن مستقل نتیجوں پر پہنچ جاتا ہے۔ ان میں دو یہ ہیں جو ہمارے موضوع کے لیے مفید ہیں۔

۱۔ یورپ میں عقل کی ترقی ہوئی اور اس نے زندگی کے مادی معیار کو بہت بلند کر دیا۔ حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے اقوام کو یہ درجہ بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ یورپ عقل کی ترقی میں روح، دل، قلب اور باطن کی قوت سے دور ہو گیا۔ مشرق ہنوز اس دولتِ سنت کا محافظ اور علمبردار ہے۔ لیکن یہ آگ سینۂ مشرق میں چنگاری بن کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ان چنگاریوں کو بھڑکانا اور نئی آگ سلگانا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

فلسفۂ عقل و دل کی اصل اور حقیقت سمجھنے کا مقام یہی ہے۔ پیامِ مشرق کے دور میں یہ ہوا کہ اقبال کی توجہ عقل کی طرف سے زیادہ تر دل کی طرف پلٹ گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مغرب کی مادی ترقی مشرق کی روحانی نجات کا باعث نہیں ہو سکتی۔ "درسِ حکیمانِ فرنگ" پر "صاحب نظراں" کی خاموش تعلیمات ہر طرح حاوی آتی رہیں چنانچہ جاوید نامہ کے بعد سے اقبال عقل کی دنیا سے پورے طور پر دل کی دنیا میں داخل ہو گئے اور ایک قلندر درویش کی طرح نعرۂ اللہ ہو لگانے لگے۔

کلام اقبال میں عقل و دل کی یہ کشمکش بڑی دلچسپ ہے۔ جب ذوقِ جستجو بڑھ گیا اور شاعر وہم و شک سے گزر کر دورِ یقین میں آ گیا تو اسے حقیقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اس منزل پر اس نے اپنا مستقل [illegible]

جو قائم کر لیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

حقیقت ایک کل ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری دوسرا روحانی۔ یورپ کی آنکھ حقیقت کے نظری پہلو کو بخوبی دیکھ سکتی ہے لیکن اس کی روح میں صرف مشرق ہی ڈوب سکتا ہے۔ اس لیے عصر حاضر کی بیدار مغز قوموں کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ حقیقت کو عقل اور دل دونوں کی آنکھوں سے دیکھیں جسم اور ساخت پر غور کرنا عقل کا کام ہے اور جو چیز جو ہر روح کی دنیا کی تلاش کرے وہ دل ہے۔ اس دلچسپ مسئلے پر انشاء اللہ بشرط فرصت میں کچھ اور لکھوں گا

ہم نے مختصراً یہ دیکھ لیا کہ اقبال کا ارتقائے ذہنی کس احول میں ہوا؛ اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اقبال کے پیام کے چار اہم موضوع ہو سکتے ہیں۔ (۱) عشق (۲) عمل (۳) یقین (۴) خودی۔

میں نے پہلے ہی کہا کہ اقبال کچھ تو اپنے فلسفیانہ مزاج، کچھ مجبور علم اور کچھ افتاد زمانہ کی وجہ سے مجبور ہوئے کہ عقل و دل کی دو متضاد قوتوں کو اپنے سینے میں پرورش کرتے رہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان دونوں کو ملانے کی بھی کوشش کی چونکہ ان کا خیال تھا جس طرح کہ ابھی واضح کیا گیا کہ موجودہ زمانہ کو عقل و دل دونوں کی بیداری کی ضرورت ہے۔ اس کش مکش میں انھوں نے دو اہم سوالات کیے۔

۱. انسان کی آخری نجات اور انتہائی بلندی کس چیز میں ہے؟

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے   کہ میں اس سوچ میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

۲. اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب ان کی فکر و مشاہدہ کی گہرائی نے یہ دیا کہ انسان کی آخری نجات عشق ہے۔ مجھے اس موضوع پر تفصیل سے کچھ لکھنا نہیں ہے۔ اس لئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کا فلسفہ عشق یا عشق کی دنیا عظیم صوفیوں سے مختلف نہیں ہے۔ البتہ اس کے حاصل کرنے کے طریقوں میں کچھ اختلاف ہے۔

عشق کی منزل تک پہنچنے کے لیے انھوں نے تین راستے متعین کیے۔ (۱) خودی (۲) یقین (۳) عمل۔

عمل ایک جامع لفظ ہے جو بنیادی اور روحانی دونوں قسم کے مقاصد پر حاوی ہے۔ عمل کا پیام دینے سے اقبال کی مراد یہ تھی کہ وہ ایک کاہل قوم کو جگا کر ترقی پر آمادہ کریں اور اسے کام کی قوت دکھا کر ...

سیاست ہو یا ریاضت، اس پیغام کو انھوں نے طرح طرح سے اُکسایا دو ایک مثالیں خود جوہر صاحب کے دیے ہوئے اشارے سے معلوم کیجئے۔

(۱) لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

(۲) زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی — آج کیا ہے فقط ایک مسئلہ علم کلام

(۳) وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

یقین:- شعری دنیا میں اقبال کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم مسلم کچھ تو یورپ کی جدید تہذیب اور علوم کی زد میں آکر ان حقایق حیات پر اپنا یقین کھو بیٹھی ہے جسے تیرہ سو برس پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ جتنا جس بات پر یقین ہوگا اتنی ہی قوت عمل اور احساس پیدا ہوگا۔ عمل میں جوش پیدا کرنے کے لیے حقایق پر یقین رکھنے کی تلقین ایک ضروری تلقین تھی جو اس آزاد خیال زمانے میں خاص جرأت اور حکمت کے ساتھ کی گئی۔ ایسے دور میں جبکہ انسان ہر حقیقت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ اور علوم کے نظریات کے باہمی تصادم کی وجہ سے اسے حقیقت ایک بے معنی چیز معلوم ہونے لگی ہے ذوق یقین کو اکسانا کمال تھا۔

خودی:- یقین اور عمل کے ساتھ ساتھ احساسات کی بیداری ضروری تھی۔ اس مقام پر انھوں نے اپنا فلسفہ خودی جس کا تعلق عقل سے ہے خاص انداز سے پیش کیا۔ یہی وہ منزل ہے جہاں اقبال کی تخلیقی قوت اور ایک خاص پیغام کی جھلک نظر آتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح فاضل مصنف نے کہا، اقبال اس بے خودی کے مخالف تھے جس کی تعلیم نے مسلمانوں کو سست احساس اور کاہل بنا دیا تھا۔ اس لئے انھوں نے یہ کہا کہ اب انسان کو اپنی بلندی اپنے مقام اور اپنی روحانی اور عقلی قوتوں کو منفی طریقے کے ساتھ نہیں بلکہ مثبت طریقے کے ساتھ معلوم کرنا چاہیئے۔ خودی ہو یا بے خودی دونوں کا راستہ ایک ہے۔ دونوں عشق کے ذریعہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں لیکن حالات زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ منزل کبریا کا سفر پوری خود شعوری کے ساتھ کیا جائے جس طرح مصنف نے سمجھا۔ اس مقام پر خودی اور عشق، عقل و دل، یا تن کی دنیا اور من کی دنیا میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوتا۔ وہ خودی کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ انسان "یزداں بکمند آور" کا جذبہ پیدا کرے۔ خدا ایک بلند مقام کا نام ہے اور اس مقام کو

حصول اور وہاں تک رسائی کے لئے پہلے وسیلے کی ضرورت ہے جو خودی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ خدا کو اپنے دیکھنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنی ساری قوتوں کو بلند کرے۔ ایک جگہ جب یہ بلند مقام پا کر خدا کو دیکھتا ہے تو اس کی شایان شان ہے۔ اس طرح خودی دو صرف عقل کا راستہ بلکہ روح کا راستہ بھی بن جاتی ہے۔ تزکیہ نفس، ریاضت، ذکر، تخیل، مراقبہ سب جائز لیکن اقبال کے فلسفے کے مطابق بے خودی اور انکاری (Self Denial) کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ خود شعوری (Self Consciousness) خود ثباتی (Self Assertion) کی روح اور اعتماد کے ساتھ۔ ان کا یہ خیال تھا کہ خودی کے شعور اور اس کی بلندی کا اراده عام انسانوں کے فائدے کی چیز کو دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہوگا اگر یہ آئندہ چل کر بے خودی میں مبدل ہو جائے تو اس کی یہ تبدیلی وقت اور مقام کے شایان شان ہوگی۔ اس خودی کے دو روپ یہ ہیں۔

(۱) خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ شعر گویا فی السموات و ما فی الارض کی نہایت ذی شعور حکیمانہ تفسیر ہے جو اس زمانے میں کی جا سکتی ہے۔

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں انہیں — پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں انہیں

جوہر صاحب کے پیش کردہ اس شعر میں خودی کا وہ تصور جو میں نے ابھی بیان کیا عمدگی سے واضح ہوتا ہے۔ طریق خانقاہی گو فرسودہ ہو چکا ہے لیکن عشق کے لیے ضروری ہے۔ البتہ اس میں پختہ تر ہو جانا چاہیے وہ اس طرح سے کہ ذکر اور فکر دونوں میں انسان محو ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ذکر کا تعلق دل سے اور فکر کا تعلق عقل سے ہے جیسے اقبال کہیں اور جگہ کہتے ہیں۔

گفت مرگ عقل گفتم ترک فکر — گفت مرگ قلب گفتم ترک ذکر

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ اقبال کے نزدیک انسانی ترقی کی آخری منزل عشق ہے جہاں خدا ملتا ہے اور کوئی پہنچ نہیں سکتا ہے بغیر خودی (۱) اور عمل (۲) کے۔ انہیں پر زور دینے کے لئے اس نظام کی تشبیہیں، استعارے، حکمت اور معرفت کے نکات اور مثالیں پیدا کیں۔ خوب ہوگا کہ فاضل مصنف نے جو مثالیں دی ہیں وہ بعض مقامات پر برجستہ نہیں ہیں اور انسان کا مفہوم جو پیش کیا گیا ہے خاص طور سے تنگ نظری کا ہے۔

معجزۂ اہل فکر فلسفۂ پیچ بہ پیچ　　　معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اس شعر کا پہلا مصرعہ ان کے مفید مطلب ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اقبال نے عمل یقین اور عشق کے متفقہ پیغام پر زور دیا جس کے مظہر حضرت موسیٰ ہیں اور ان کا تعلق فرعون اور طور سے ہے پیغمبر اقبال کے نزدیک خودی عمل یقین اور عشق کا مکمل نمونہ ہوتا ہے۔ فاضل مصنف نے دوسرے مصرعہ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا اور نہ اس کا ذکر کیا

اسی طرح اقبال نے عمل اور خودی کی قوت کو اکسانے کے لیے فلسفہ شاہین کی دلچسپ تشبیہ پیدا کی۔ عقل کو غلام عشق کو امام علم کو پوست عشق کو مغز، جنوں کو جو عشق کی ایک والہانہ کیفیت ہے علم سے زیادہ تیز رو بتایا۔ بہرحال جس موقعے پر جس مسئلے کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہوئی وہاں حسن کمال کے ساتھ اس پر زور دیا گیا۔ مثلاً

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی　　　نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اس شعر میں عقل اور عشق کی ناتمامی اور بے راہ روی پر افسوس کیا ہے۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے، یہ سرور　　　تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مصنف کے پیش کردہ اس شعر میں، جیسا کہ میں نے کہا خودی کو عقل و دل دونوں کے لیے موزوں قرار دیا گیا

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند　　　آدم بہ میرد از بے یقینی

اس شعر میں یقین کی قوت دکھائی گئی ہے۔

نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس　　　بیا کہ عشق کمالے ز یک فنے دارد

اس میں عقل پر مکمل اعتماد کو باطل قرار دیتے ہوئے عشق کے کمال کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہزار طریقوں سے اقبال نے اپنے پیغام کے ان چار عناصر کو روشن اور موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سارا پیغام کالعدم ہو جاتا اگر ان عناصر میں توافق باہمی کے بجائے تصادم باہمی کیا جاتا یا ایک کو دوسرے کا حریف گردانا جاتا۔ لیکن بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال نے ان کے مدارج اور فوقیت کا ہر منزل پر خیال رکھا ہے۔ اور جو واسطہ اور رابطہ ایک کو دوسرے سے ہے ان کی ترتیب اور مقام کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ فاضل مصنف اس مقام پر غور و فکر سے کام لیں تو مناسب ہو۔

آخر میں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ

۱۔ اقبال کی کمال شاعری اور اس کی قوت تخلیق اس کے علم سے متاثر ہوئی۔ ایک تو بلاعلم حجاب الاکبر۔ دوسرے اس کے خیالات میں اس کے مطالعہ اور مشاہدہ کی وجہ سے دوسروں کے خیالات کی اس قدر پرچھائیاں آگئیں کہ اس کے اکثر خیالات کسی نہ کسی گزشتہ بڑی شخصیت میں خواہ وہ غزالی ہوں یا برگساں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس مقام پر یہ کہنا کہ یہ خیال غزالی کا ہے یہ نظریہ برگساں کا ہے اس لیے ناموزوں ہے کہ اقبال نے بالارادہ اپنے خیالات کو اس طرح نظم نہیں کیا کہ وہ ان کے معلوم ہوں یا انھیں مخاطب کیا جائے۔

۲۔ اقبال نے اپنے کلام میں حقائق پیش کرنے کی کوشش کی اور ظاہر ہے کہ حقائق نئے نہیں ہوتے شاعر جن حقائق کو پیش کرتا ہے وہ تو زندگی میں گھلے ملے ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے نیوٹن، آئن اسٹائن یا ڈارون دنیائے سائنس میں نئے انکشافات کریں لیکن زندگی اور جذبات کی دنیا میں حقیقت جانی پہچانی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اقبال کی "من کی دنیا" کوئی نئی چیز نہیں، خود کوئی نئی بات نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ اس لیے اس مفروضہ یا تصور ماقبل کے ساتھ کہ اقبال ایک فلسفی تھا نئی چیزیں پیش کرتا تھا۔ انتہائی آورجنل شاعر تھا مسلم تھا۔ اس کے کلام کا مطالعہ کرنا خواہ مخواہ غیر ضروری صفات کا افسانہ کرکے اس کے کلام کو مشکل تر بنا دیتا ہے۔

جہاں تک اس کے بیانات شاعرانہ کا تعلق ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ واقعہ اُلٹا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے بعض نظریات کو واضح کرنے کے لیے انھیں نثر کے خشک قالب میں ڈھالنے اور ان کی شرح کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس اگر اس نے اپنی تقریروں میں شعور، ارادے، سنجیدگی اور غیر جذباتی طریقے سے بیان کیے ہوئے جذبات کو شعر کا لباس پہنانے کی کوشش کی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خیالات اور نظریات من و عن اسی طرح شعر میں منتقل ہو گئے ہوں جس طرح نثر میں ہیں شاعری کی ایمائیت (Suggestiveness) ابہام اور وجدان کو روکنا جس کے ذریعہ اصل خیال کچھ سے کچھ بن جاتا ہے اور نئی تاثیر پیدا کر لیتا ہے خود شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اقبال خود نہیں جانتا کہ اس کے مقالے میں ظاہر کیے ہوئے خیالات اس کے شعر میں جلوہ گر ہو کر ہم پر کیا اثر کر رہے ہیں۔

محمد عبدالقیوم خان باقی

عاشقی[1]

انسانی زندگی میں سیکڑوں گوناگوں واقعات پیدا ہوتے ہیں اور پورے ہوتے ہیں مگر بہت کم ایسے موقع ہوتے ہیں جن میں بے آہنگی کے عنصر کا کیا ذکر بلکہ ہم آہنگی اور مطابقت ہوتی ہو جیسے تصویر کے ساتھ اس منظر یا مطرب کے ساتھ باجے کی آواز۔ واقعات ہماری پیش بندیوں کے مطابق اس طرح پورے ہوتے رہتے ہیں کہ ہم ماضی و حال کی خوشگوار تاریخ سے اپنے مستقبل کے بھی اُتنے ہی روشن اور خوش آیند ہونے کی امید کیا کرتے ہیں لیکن خواہش کے مطابق کاموں کی تکمیل اور حصول مقصد کے باوجود ہماری زندگی میں ایک واقعہ ایسا ضرور پیش آتا ہے جو ہمیں مبہوت اور ہمارے مستحکم و دیرینہ نظریوں کو متزلزل کر دیتا ہے۔

عشق اتنا اہم موضوع ہے کہ اس کی حقیقت عاشقوں کی حالت کے مشاہدے یا خود عشق میں مبتلا ہو جانے کی آرزو سے سمجھ میں نہیں آسکتی اس کے لیے نہ تو وجدان و کشف کافی ہیں اور نہ معقولات و منقولات بلکہ عشق سے روشناس کرانے والی چیز ہمارے لیے محض ذاتی تجربہ ہے۔ مشہور ہے کہ ایک فرانسیسی ماہر معقولات اپنے دوستوں کے حلقہ میں موضوع عشق پر بحث کر رہا تھا۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ وہ کوئی قطعی رائے اُس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کہ خود اس کی کنہ سے واقف نہ ہو۔ فرانسیسی کو بہت برا معلوم ہوا وہ جلسہ سے باہر نکلا اور ارادہ کیا کہ بغیر تجربہ کیے ہوئے منہ نہ دکھائے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ واپس آیا اور کہا کہ میں پھر اسی موضوع پر گفتگو کروں گا اس لیے کہ اب میں عشق کی لذت و درد کا خوگر ہو چکا ہوں۔ اگرچہ اس قلیل مدت میں وہ کیفیات اور مدارج عشق سے کیا واقف ہو سکا ہوگا تاہم اس واقعے سے اندازہ ہو جائے گا کہ عشق کو کتابوں اور اقوال سے کوئی نہیں سمجھ سکتا اس کے لیے صرف ذاتی اقدام اور انفرادی تجربہ کی ضرورت ہے۔

عشق میں گرفتار ہونے کے بعد ہم میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوتا ہے۔ ہماری آنکھوں سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور ہمیں گزشتہ تمام تمنائیں گرد معلوم ہونے لگتی ہیں۔ عشق سے پہلے ہمارے [illegible]

---

[1] یہ ترجمہ ہے۔ Stevenson's "On Falling in Love"

تھی ہمارے جذبات میں اشتعال نہیں تھا لیکن اب ان کی جگہ ایک ایسے زبردست جذبے نے لی جو ان تمام چیزوں کو محو کر کے ہم پر پورا پورا غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور اس وقت ہم درد و رنج کی ان لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں جن سے ہمیشہ نابلد تھے۔ صرف عشق ہی اس معقول پسند دنیا میں ایک نامعقول اقدام ہے جو کسی منطق کا پابند نہیں۔ اس کے اثرات بھی بالکل مختلف اور غیر متناسب ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب اور کیسے عشق میں مبتلا ہو جائے گا۔ روز کی بات ہے کہ دو غیر مانوس انسان حسن سیرت و صورت سے عاری ایک دوسرے سے ملتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں بیسیوں دفعہ ایسا ہوا کرتا ہے اور ان کو کوئی خیال بھی نہیں ہوتا کہ دفعتاً ایک دفعہ انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ عشق کے دیوتا کا شکار ہو گئے جس نے دونوں میں محبت کا وہ ربط قائم کر دیا ہے کہ معشوق غرضِ تخلیق عالم اور معراجِ کشیدۂ آفرینش معلوم ہونے لگتا ہے۔ عاشق کے خیالات اس رشتۂ باطنی میں اتنی مضبوطی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ہر فعل کو معشوق کی پرستش اور خوشی کا سبب سمجھنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کے اپنے وجود کا مقصد بھی محض محبوب کے ساتھ ہم نشینی اور ہم نوائی ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو اس واقعہ پر حیرت ہوتی ہے کہ ان دونوں میں کون ایسی چیز مابہ الامتیاز تھی جو ایک دوسرے سے محبت کا پیش خیمہ ہوئی؟ ان کے نزدیک اگر مرد اپولو بلویڈیر[1] (APOLLO BELVEDERE) کا اتنا حسین ہوتا اور عورت اس پر فریفتہ ہو جاتی تو چنداں محل تعجب نہ تھا لیکن دشواری تو یہ ہے کہ یہاں مرد میں وہ حسن سیرت و صورت بھی نہیں کہ وہ عورت کی توجہ اپنی طرف منعطف کرے پھر عشق کا آخر کیا سبب ہوا؟ غالباً اس معمہ کا حل

"بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست"

میں مل سکے۔ ورنہ جہاں تک حسن صورت کا تعلق ہے میری دانست میں صرف دو مرد یعنی لیانارڈو ڈا ونسی[2] (LEONARDO DA VINCI) اور گوئٹے[3] (GOETHE) ایسے ضرور گزرے ہیں جو جوانی میں

---

[1] اپولو یونانیوں کے خیال میں صورت اور موسیقی کا دیوتا مانا گیا ہے۔ اس کی شبیہ بے مثل سنگ مرمر کی بنائی گئی تھی [illegible] جاتی تھی۔

[2] [illegible]

[3] [illegible]

عورتوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے تھے۔ ان کے علاوہ مردوں کا بڑا حصہ کسی طرح اپنی جسمانی خوبصورتی سے اس قابل نہیں کہ وہ اپنی نگاہوں سے عورتوں کے سینہ کو چھلنی کر دے۔ عورت کے لیے اس کے برعکس جاذب نگاہ ہونا بالکل ممکن ہو لیکن بدقسمتی سے میں مرد ہوں اس لیے غیر جنس کے نفسیات پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔

دنیا میں سیکڑوں کام ایسے ہیں جن کے سبب خود ہم ہوتے ہیں ہم چاہے اسے کریں یا نہ کریں تقدیر سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ ہماری تمام روحانی فضیلتیں، شفقت، بلند خیالی، نیک اعمالی اور تمام وہ کام جو ہماری روحانیت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں ہمارے ہی بس میں ہیں ہم انہیں چاہے بگاڑیں چاہے بنائیں مقدر کا ان سے کوئی تعلق نہیں لیکن دنیائے عشق میں تو بس مقدر ہی کی حکمرانی ہے۔ عاشق ہونا یا نہ ہونا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس لیے کہ عشق اختیاری و اکتسابی نہیں بلکہ اضطراری اور غیر اختیاری چیز ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شیکسپیر بھی اس میدان میں سپر انداختہ رہا اور جب ملکہ ایلزبتھ نے اس سے فالسٹاف کو عاشق کی حیثیت سے پیش کرنے کی فرمائش کی تو اسے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بہت ناکامیابی ہوئی اس لیے کہ عشق کا مظاہرہ سب کے امکان میں نہیں اور فالسٹاف جیسا موٹا کریہہ، بزدل اور الھڑ انسان کبھی بھی اس کا مناسب موضوع نہیں بن سکتا تھا۔ شیکسپیر کی طرح ہنری فیلڈنگ بھی عشق کی چاشنی سے بے خبر تھا۔ سوائے راب رائے نامی ناول کے ایک آدھ باب کے اسکاٹ کے متعلق بھی میری یہی رائے ہے۔ جب یہ تین تاریخی عظیم شخصیتیں یعنی شیکسپیر، فیلڈنگ اور اسکاٹ جن میں سب کے سب تخیل کے اعتبار سے بلند پرواز، صحت کے اعتبار سے تندرست، احساس کے اعتبار سے ذی حس اور طبائع کے اعتبار سے مخیر انسان تھے اور جن سے ہم عشق کی صحیح ترجمانی کے متوقع ہو سکتے تھے اس وادی سے ناکام واپس آئے تو ان زرد رو، بے حس اور خود پسند انسانوں سے جن کا زیادہ وقت

لہ شیکسپیر کے ڈرامہ ہنری چارم میں پرنس ہال کا ندیم و جلیس ہے۔ اس ڈرامہ کو دیکھنے کے بعد ملکہ ایلزبتھ نے شیکسپیر سے فرمائش کی کہ فالسٹاف جیسے بیوقوف آدمی کو عاشق کی حیثیت سے دکھائے چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ایک دوسرے ڈرامہ میں فالسٹاف کو ایک خادمہ کا عاشق دکھایا [illegible]

لباس کی سج دھج میں صرف ہوتا ہے اور جن کی تعداد شاید دنیا میں سب سے زیادہ ہو کبھی عشق جیسے بلند جذبہ کی امید کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے ان کی تو بس یہ مثال ہے کہ جس طرح بھیگا ہوا کپڑا آگ سے یا نابینا مناظر قدرت سے متاثر نہیں ہو سکتا اسی طرح مادۂ جذب و انجذاب کا فقدان ان کے دل کی بستی میں عشق کو کبھی خیمہ زن نہ ہونے دے گا اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے بھی ملیں گے جو مادہ انجذاب رکھنے کے باوجود محبوب کا عشق حاصل نہیں کر سکتے اور یوں تخلیقِ عشق مشکل ہو جاتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اس ناکامیابی کے بھی اسباب وجوہ ہیں:

معشوق سے اظہار عشق ایک نہایت نازک اور اہم بات ہے اکثر اوقات مناسب موقع کا نہ ملنا یا جھیپ کی وجہ سے عشق ظاہر نہ کرنا بھی محبت کو ختم کر دیتا ہے بعض عشق کی ڈینگ مارتے ہیں مگر وہ اس سے باہر قدم نہیں رکھتے لیکن ایک عقلمند انسان مقدمات عشق سے واقفیت کی وجہ سے پہلے ہی سے زمین ہموار کرتا رہتا ہے اور مناسب موقع پر اظہار محبت کر کے کامیاب ہو جاتا ہے۔ بہت سے ایسے مرد بھی ملیں گے جو صدائے "ارنی" اور جواب "لن ترانی" کے بعد بھی اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں اور آخر کار عشق حاصل ہی کر لیتے ہیں لیکن اس ضد میں ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ عورت فطرتاً عشق کا دم بھرنے سے اور چکنی چپڑی باتوں سے خوش ہوتی ہے تاہم معاشقہ کی تکرار سے پریشان ہو جاتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ عاشق اپنے فعل سے محبوب کی نظروں میں سبک ہو جائے۔ اگر بفرض محال ایسا نہ ہو تو بھی زبردستی کے عشق کے بعد شادی حتماً زیادہ خوشگوار اور دیرپا نہیں ہو سکتی۔ عشق جبریہ کامیاب نہیں بنایا جا سکتا۔ عشق تو دراصل وہ ہے جو خود سے پیدا ہو۔ مداح کمال طور کرتا ہوا دونوں طرف آگ لگا دے اور محبت کی آغوش کھول کر ایک دوسرے کا استقبال کرائے۔ یا دوسرے الفاظ میں عشق کی ابتدائی حالت یوں سمجھو کہ دو عشق کے متوالے کمال احتیاط اور مشتعل جذبات کے ساتھ اس طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھیں جس طرح کہ دو نادان بچے ایک انجان اور تاریک کمرے میں جاتے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تکتے اور ایک دوسرے کے نقش قدم پر چلتے ہوں جب عشق کی یہ کیفیت ہوگی تب ہی نظروں یا پیشانی سے ایک دوسرے کے خیالات اور تکلیفوں کو سمجھ سکتے ہیں اور اس طرح عشق کی آمادہ گشت دونوں روحوں کو باخبر کر کے ایک دوسرے سے اس طرح واقف کر دیتی ہے کہ انھیں بلا عشق کی ضرورت ہے

بھی نہیں ہوتی۔ وہ آپس میں اس طرح یک جان ہو جاتے ہیں اور ان میں وہ روحانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے کہ عاشق کے دل میں جب کوئی بات آتی ہے تو وہ فوراً سمجھ لیتا ہے کہ یہی بات محبوب کے دل میں بھی پیدا ہوئی ہے۔

عاشق ہونا جتنا تحیر زا ہے اتنا ہی مفید بھی۔ یہ زمانہ کے انحطاطی اثرات کو زائل کر کے طبیعت کو چست اور دماغ کو قوی رکھتا ہے یہ بد دماغی اور بد مزاجی کو جس کی طبیعت عادی ہو جاتی ہے دور کر کے انسانی احساسات میں ایک نئی روح پھونکتا ہے اور اس کے خفتہ اور نیم خفتہ جذبات کو بیدار کر دیتا ہے عشق سے قبل تک انسان ان تمام لذائذ کا جو اس کی پہنچ سے باہر تھے منکر رہا کرتا، چیزوں کے تاریک پہلو پر نظر رکھتا اور روشن پہلو سے قطع نظر کر کے زندگی کی بیکار و بدمزہ چیزوں سے دل بستگی حاصل کیا کرتا تھا۔ اس طرح گویا اس نے زندگی کے تمام عمدہ جذبات، جوانی کی لذت، ظرافت اور حسن کہ جس کا اس کے پاس ذخیرہ تھا عدم استعمال کی وجہ سے زنگ آلود کر دیا تھا۔ وہ محبت کے باغیوں کا ایک رکن بن گیا تھا۔ خود داری کا غلط مطلب اور خود غرضی کی آزادی کو وجہ ناز سمجھتا تھا۔ وہ اپنے محدود حلقۂ مشاغل سے قدم باہر نکالنا گناہ اور شادی کو ڈراؤنا خواب جانتا تھا لیکن ان تمام قنوطیت اور کہنہ پرستیوں کے باوجود عاشق ہونے کے بعد اس میں سینٹ پال[1] کی طرح ایک اچانک تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کے قلب کی حرکت جو ابھی تک تدریجی تھی ایک بارگی تلاطم و جزر و مد کا عالم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے اور دنیا کی ہر چیز اسے ازلی ولا ہوتی نور میں غرق دکھائی دیتی ہے۔ اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آج تک نہ کچھ دیکھا تھا نہ سنا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی اسے خواب معلوم ہونے لگتی ہے عشق کے تیز احساسات اسے مضطرب اور بے کیف رکھتے ہیں کبھی تنہائیوں میں خوب ہنستا ہے اور کبھی راتوں کو ٹکٹکی باندھے ہوئے آسمان کی طرف تکا کرتا ہے قلم میں کہاں وہ قوت کہ اس دماغی کیفیت کی تصویر کشی کر سکے۔ اسے ہم بعض فلاسفہ اور شعراء کے زبردست شاہکاروں میں دیکھ سکتے ہیں مثلاً ایڈلیٹ[2] نامی نظم میں ہیبل

ملہ ابتدا میں یہ یہودی تھا اور عیسائیوں کا جانی دشمن لیکن دفعتاً اس کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور وہ مذہب عیسائیت کا زبردست حامی اور مؤید ہوگیا۔

ملہ جرمن شاعر فریڈرک ہیبل (۱۸۱۳ء تا ۱۸۶۳ء) کی نظم جو موضوع عشق پر بہترین نظم ہے۔

ماڈ (   ) میں ہینی[1] (   ) کی غزلوں میں شیکسپیر کے انٹنی اینڈ کلوپٹرا اور رومیو اینڈ جولیٹ (   ) وغیرہ میں اس کیفیت کی حیرت خیز ترجمانی کی گئی ہے اسی طرح لا مزیبل میں پلاریس[2] کی حالت بھی اس کیفیت کی پوری پوری آئینہ دار ہے۔ جارج سینڈ (   ) اور جارج میرڈیتھ (   ) کے کرداروں میں یہ دماغی کشمکش خوب خوب موجود ہے۔ ہم کہاں تک نام گنائیں ادب میں عشق کے ماروں کی داستان بہت بڑے پیمانہ پر موجود ہے۔ ہم ادبیات کے دروازہ ہی سے شہر ہیولا[3] میں داخل ہو سکتے ہیں جو بہشت سے متصل اور شہر عشق کے بالمقابل ہے۔ یہاں بیٹھ کر عاشق خوش بختی اور نہ پوری ہونے والی امیدوں کا خواب دیکھا کرتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عاشق ہونے کے بعد انسان اپنے وجود اور اپنے عمل کو دنیا کے لیے کیوں مفید اور مغتنم سمجھنے لگتا ہے؛ غالباً یہ فطرت ہے کہ انسان اپنے معمولی سے معمولی کام کو بھی عالمگیر اور دنیا پر چھایا ہوا سمجھے بس اسی طرح عاشق بھی یہی خیال کرتا ہے کہ اس کے عشق کے تاثرات اور سرگرمیاں دوسروں کو بھی ضرور متاثر کریں گے۔ عاشق و معشوق کی نگاہوں میں اپنا وجود اس قدر دلکش اور روح افزا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ دنیا کے لیے ممکنات میں سے بہترین چیز ہے۔ وہ اس جذبہ میں یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ آسمان کا نیلگوں ہونا، آفتاب کا روشن ہونا اور موسم کا خوشگوار ہونا بھی اپنے ہی وجود کا منت کش سمجھنے لگتے ہیں اور اس مبالغہ آمیز معیار عشق کی وجہ سے وہ روز بروز خود نما و خود پسند ہوتے جاتے ہیں انانیت کا معیار عاشق کی نظروں میں اس قدر رفیع ہو جاتا ہے کہ وہ ہر عورت کو جان آف آرک (   ) خیال کرتے ہیں مگر خود ہم چارلس گرینڈ لین[4] (   ) کی طرح لاف و گزاف اور خود نمائی سے آگے نہیں بڑھتے

---

[1] یہ بھی انیسویں صدی کا جرمن شاعر ہے۔ بہت سی غزلیں لکھیں جو کہ اپنی رشتہ دار بہن امیلی ہائنے کے عشق کی وجہ سے نہایت کامیاب ہیں۔

[2] وکٹر ہیوگو (   ) کے ناول بدنصیب میں ایک کردار جو عشق میں مبہوت ہے

[3] بنین (   ) اپنی کتاب پلگرمس پروگرس (   ) میں ہیولا (   ) کو ایک مقام بتاتا ہے جو کہ تمام فرحت و لذت کا نمونہ ہے۔

[4] رچرڈسن (   ) کے ناول کا ہیرو ہے جو ہر ایک سے ملنے میں بڑے بڑے جملے استعمال کرتا ہے اور لاف و گزاف کا عادی ہونے کی وجہ سے نہایت مضحک ہو گیا ہے۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا تھا کہ آیا عشاق کی اس قسم کی لفاظی سے عورتیں بھی خوش ہوتی ہیں! لیکن اب جارج ایلیٹ (G. ELIOT) کے ناول ڈینیل ڈیرونڈا (DANIEL DERONDA) کے پڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ بے شک وہ خوشامد سے خوش ہوتی ہیں اس لیے کہ اس ناول کی ہیروئن اپنے عاشق کی ڈینگوں اور چکنی چپڑی باتوں سے انتہائی خوش ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھی جھنجلا بھی جاتی ہے۔

گو کہ عشق کا یہ بلند معیار کہ عاشق و معشوق کا عشق دنیا کی خوش بختی کا سبب ہو اپنے میں کوئی افادی پہلو نہیں رکھتا تاہم اس میں ایک خوبی ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس خیال سے عاشق مخیر اور کشادہ دل ہو جاتا ہے اور ۴
جس وقت وہ دوسروں کو بھی محبت میں مبتلا دیکھتا ہے تو ان پر ترحم اور خوشی کی نظر ڈالتا ہے۔ ترحم اس وجہ سے کہ وہ اپنے عشق کی تکلیفوں کو یاد کر لیتا ہے اور خوشی اس وجہ سے کہ لوگ عشق میں اس کی تقلید کرتے ہیں جس طرح کسی کمیڈی میں ہیرو ہیروئن اپنے علاوہ کسی معمولی کردار کے عشق پر بھی ترس و شفقت کرتے ہیں اسی طرح اصل زندگی میں بھی باوجودیکہ عاشق اپنے عشق کے مقابلہ میں دوسروں کے عشق کو ہیچ سمجھتے ہیں پھر بھی خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ دوسروں کی محبت بھی پھلے پھولے اور بار آور ہو۔ بہرحال عاشقوں سے ہمدردی فطری چیز ہے یہ روکی نہیں جا سکتی۔ جس طرح کوئی انتہائی کاروباری انسان بھی مناظر قدرت کی دلکشی کی وجہ سے چند منٹ ضائع کر کے اُسے ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح انتہائی بے حس اور ٹھوس انسان بھی جذبۂ ہمدردی سے پُر ہو جاتا ہے جبکہ وہ دو دردمند دلوں کی داستان پڑھتا ہے یا ان کو شہر کی کسی گلی میں دیکھ لیتا ہے اگر کوئی مدت العمر نا کتخدا لڑکی کسی ناول میں ہیرو ہیروئن کے معاشقہ سے دلچسپی نہیں لیتی تو وہ اس کی خبیث طبیعت کی وجہ سے ہے اس لیے کہ جو شخص عشاق پر کم از کم ہمدردانہ نظر نہ ڈالے وہ بہت ہی پست اور خلاف فطرت ہو گا۔

عاشق و معشوق کا عشق چاہے دوسروں کے لیے مفید ہو یا نہ ہو لیکن اس سے خود عاشقوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ بھلائی کرنا اور اسے لوگوں تک پہنچانا ان کا مطمح نظر ہو جاتا ہے۔ عاشق کی ذاتی خود نمائی اور خود پسندی ختم ہو جاتی ہے اور اسے محض معشوق کی خوشی اور لطف التفات میں سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ معشوق کی خوشی سے عاشق کے دل میں فخر، انکسار، ترحم اور محبت کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر فعل میں لباس میں گفتار میں

دار میں محض معشوق کی خوشی کا خیال رکھتا ہے۔ وہ دنیا کے لیے جاذب نظر نہیں بننا چاہتا بلکہ صرف معشوق کے ہے تاکہ اس کی بارگاہ میں ہدیہ نیاز پیش کرتا ہے۔ عاشق اپنی تمام کمزوریوں سے بھی معشوق کو آگاہ کر دیتا ہے رقبول و عفو کا متمنی رہتا ہے۔ اب اس کی محض یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ اپنے کسی ذاتی محاسن کی وجہ سے نہ پا جائے بلکہ اصلی حالت میں اس سے محبت کی جائے۔ اپنی حالت کو معشوق کے سامنے صحیح پیش کرنا نیا میں سب سے مشکل کام ہے اس وجہ سے کہ انسان محض الفاظ کے ذریعہ سے اپنے خدوخال کو صحیح دکھا سکتا ہے اور اس میں اس بات کی ہر وقت گنجائش ہے کہ وہ اپنے معنوں کو بخوبی ادا نہ کر سکے یا معشوق الفاظ کے مناسب نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑ جائے۔ پس اس سبب سے اپنے کردار کے صحیح پیش کرنے میں نسان کو عموماً ناکامیابی ہوتی ہے۔ عاشق اس کی پروا نہیں کرتا کہ آیا وہ اپنے کو دنیا کے سامنے صحیح دکھا سکا یا نہیں، اس کی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو معشوق کے سامنے اصلی رنگ میں دکھا سکے۔ اس کی بس یہ خواہش رہتی ہے کہ معشوق اسے اچھی طرح سمجھ لے اور اس کی طرف سے کسی غلط فہمی یا ناواقفیت میں مبتلا نہ رہے جب اس کوشش اور محبت کے باوجود اسے کسی وقت یہ علم ہو جاتا ہے کہ معشوق نے اسے پوری پوری طرح نہیں سمجھا ہے یا مزاج شناس نہیں ہوا ہے تو عاشق میں جذبہ بغاوت و نفرت پیدا ہو جاتا ہے۔

عاشق گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا اپنے لیے کوفت و مصیبت سمجھتا ہے۔ اسے اس بات سے اذیت ہوتی ہے کہ زمانہ ماضی بغیر اس معشوق کی ہمراہی کے کیوں صرف ہوا اور اس نے اتنے عرصہ تک دوسری عورتوں سے کیوں عشق بازی کی، کیوں نہ اپنے اسی محبوب کے ساتھ رہا۔ یہ خیال اس کے جذبہ خودداری کو ٹھیس لگاتا ہے۔ اپنے ان خیالات پر تو اسے رنج ہوتا ہی ہے لیکن جو چیز اس کے دل میں ناسور پیدا کر دیتی ہے اور اس کے زخم کو مندمل نہیں ہونے دیتی وہ یہ ہے کہ خود معشوق نے ماضی میں کیوں اس کے علاوہ دوسرے مردوں سے تعلق رکھا اور کیوں خدا نے رحیم اتنے عرصہ تک عورت کے دوسرے مردوں کے عشق پر راضی رہا۔ یہ مرد کی خود غرضی ہے ورنہ جس فعل کو خود اس نے روا رکھا تھا اسے عورت کے لیے کیوں معیوب سمجھتا ہے۔

مرد اپنے عشق کی مطلق العنانی کو جائز رکھتا ہے لیکن عورت کے اس رویہ کو غیر فطری اور عملی زندگی کے خلاف سمجھتا ہے۔ مرد کا یہ جذبہ قابل ستائش نہیں اس لیے کہ دونوں کو برابر کا حق ہے اگر مرد کو عورت کے پچھلے واقعات

عشق کی وجہ سے اس سے حسد پیدا ہوگیا تو وہ عشق پاک و بے آلائش کب رہے گا؟ وہ تو نفسانی خواہشوں کا گویا شکار رہا اور گویا ہوس رانی ہی اس کا اصل مقصد تھا۔ غالباً حسد انسان کے خمیر میں نہیں رہا ہے اور اس کے لیے محض یہ ثبوت کافی ہے کہ جب قدیم ترین انسانی نسلیں عشق کی تھوڑی پونجی کے ساتھ دنیا میں آئیں تو ان میں یہ مادہ تھا ہی نہیں یہ تو تہذیب و تمدن کی برکت ہے کہ حسد پیدا ہوا ہم میں جتنی تہذیب ہوگی اتنا ہی بلند ہمارا عشق ہوگا اور اتنا ہی زیادہ حسد ثبوت کے لیے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دوسرے ممالک والے جو ہم سے کم متمدن ہیں عشق کا پست معیار رکھتے ہیں اور ان میں کتنا کم حسد ہوتا ہے اس جگہ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم عشق کی کوئی تاریخی ریسرچ کریں اور یہ بتائیں کہ آیا وہ قدیم قوموں مثلاً یونانیوں وغیرہ میں بھی تھا یا نہیں اس وجہ سے کہ یہ تفتیش ہمیں مغالطہ میں ڈال دے گی۔ ہمیں بس یہ ماننا پڑے گا کہ عشق تخیل و تہذیب تمدن کی برکت ہے اور حسد عشق و دوستی، وطنیت اور مناظر قدرت سے دلچسپی لینے کے سلسلہ میں پیدا ہوا اگر ہم عشق کو اس وجہ سے ذلیل نہیں سمجھتے کہ یہ ہماری موجودہ تہذیب کا کرشمہ ہو جو دہ تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے تو ہمیں حسد و رقابت کو بھی بری نظر سے دیکھنے کا مجاز نہیں اس لیے کہ یہ تو محض اسی عشق کا ہی جزو لاینفک ہے چاہے اسے کوئی مانے یا نہ مانے واقعہ یہی ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ معشوق کی گزشتہ زندگی اور معاشقہ کی داستان پر جس جذبۂ نفرت کو ہم حسد سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الاصل حسد نہیں کہا جا سکتا اگر کوئی مرد شادی کے بعد اپنی بیوی کے پاس ان خطوط کا مجموعہ پائے جو اس نے شادی سے قبل دوسرے عاشقوں کو لکھے تھے تو کیا مرد اپنی بیوی سے حسد کرنے لگے گا؟ نہیں: مرد کو محض دکھ ہوگا اور شدید دکھ۔ اسے تکلیف ہوگی کہ جورو نے شادی سے قبل کیوں دوسروں سے محبت کی۔ وہ اس بات پر افسوس کرے گا کہ زن و شوہر ایک ہی احساسات و جذبات کے ساتھ کیوں نہ توام پیدا ہوئے تاکہ دونوں میں کوئی راز نہ رہتا۔ وقت بھی نہ ضایع ہوتا۔ کہیں اور ایک دوسرے کا تعلق بھی پیدا نہ ہوتا ان کا عشق آپس میں کامل اور بے غل و غش رہتا اور ابتدا ہی سے ساتھ رہنے کی وجہ سے تضیع اوقات نہ ہو سکتا اور وہ اس غم و غصہ سے بھی نجات پا جاتے کہ وہ پیدا ہونے کے بعد ہی کیوں نہ بیاہ دیے گئے اور کیوں شادی سے قبل تک کا وقت ضائع ہوا۔ بس ان خیالات کے علاوہ

اسے بیوی سے نہ کوئی حسد ہوگا اور نہ وہ اس کی طرف کوئی ناجائز شک کرے گا۔

عشق انسان کو اس کے غیر فانی ہونے کا یقین کرا دیتا ہے۔ عاشق یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ عشق کی وسعت کے لیے زندگی کوتاہ ہے۔ اس کے لئے زندگیوں کا ایک مجموعہ کفایت کر سکتا ہے۔ زندگیوں کا ایک تسلسل ہونا چاہیئے تاکہ عشق ایک بڑی مدت تک نشو و نما حاصل کرے اور پھر پھولے اور بار آور ہو۔ ان خیالات کے علاوہ عاشق کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی کیوں نہ عشق میں بسر کی۔ اسے لطف اندوز ہونے کے لئے کیوں اس قدر قلیل مدت ملی؟ مگر افسوس کہ عاشق اسی قصر تخیل میں رہتے ہیں اور کوس رحیل بج جاتا ہے۔ اس لئے کہ زندگی عاشقوں کے خیال کی پابند تو ہے نہیں وہ اپنا دورہ پورا کرتی رہتی ہے اور ایک سکنڈ کے لیے بھی اس بات کا انتظار نہیں کرتی کہ ان کی دلچسپی ختم ہو جائے تب موت آئے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق ہونے کے بعد ہی موت آ جاتی ہے۔ بعض کیوپڈ کا نشانہ بننے سے قبل ہی دنیا کو وداع کر دیتے ہیں اور جب عشاق موت کی گہری نیند سو جاتے ہیں، تب کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ جب تیس برس کے عشق کا ڈرامہ دنیا کے اسٹیج سے ناپید ہو جاتا ہے تو یہ پاک جذبہ جس کو وہ اتنا بزرگ، اتنا عظیم سمجھتے تھے کیا نشانیاں چھوڑتا ہے؟ کچھ نہیں، سوائے دو ایک گیتوں کے جو کہ انھوں نے لکھے ہوں۔ ایک عمدہ کاموں کے جو وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہوں اور دو ایک بچوں کے جو ان کی نشانی اور گفتار و کردار میں والدین کی شبیہ ہوں۔ یہ ہے اس غیر فانی جذبہ کی مختصر کہانی۔

مترجمہ اقبال انصاری ایم اے

سُراغ رسانی کے قصّے

سراغ رسانی کے قصے فی الحقیقت عصر حاضر کی پیداوار ہیں لیکن زمانہ قدیم میں بھی ان کے غیر ترقی یافتہ مگر دلچسپ نمونے ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں سراغ رسانی کا شوق ابتدا ہی سے موجود ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ واقعہ نہایت مشہور ہے کہ دو عورتیں ان کے پاس فریاد لے کر آئیں۔ ان میں ایک بچے پر جھگڑا ہوا۔ ہر ایک یہ کہتی تھی کہ بچہ میرا ہے اور مجھے ملنا چاہیئے۔ حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ بچہ کو تلوار سے کاٹ کر آدھا آدھا بانٹ دیا جائے۔ اصل ماں کی ممتا بھلا اس تقسیم کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ وہ چیخ اٹھی کہ پیغمبر اعظم! میں بچے سے درگزری مجھے تو بس اس کی جان پیاری ہے۔ اس طرح حضرت سلیمانؑ کو معلوم ہو گیا کہ بچہ کی حقیقی مالک کون ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلے نفسیاتی سراغ رساں تھے جن کا حال ہمیں زمانہ قدیم کے حالات میں ملتا ہے۔

دانیال کے زمانہ میں بل دیوتا کا ایک مشہور مندر تھا۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ گوشت یا شراب جو چیزیں ہر رات دیوتا کو نذر کی جاتی تھیں وہ اُن کو کھا لیتا تھا۔ دانیال بڑے صائب الرائے تھے انھوں نے لوگوں سے کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہے اور اگر تمھیں یقین نہ ہو تو مندر کے صحن میں راکھ بکھیر دو اگلے روز اس کا امتحان ہو جائے گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ صبح کو بادشاہ نے لوگوں کو پجاریوں کے پیروں کے نشانات دکھلائے جو راکھ پر بن گئے تھے اور بتلایا کہ یہی لوگ گوشت اور شراب کے مزے اڑا رہے ہیں دیوتا غریب کو اس کی خبر بھی نہیں۔ دانیال کا یہ کارنامہ تجزیہ کی عمدہ مثال ہے جس کو سراغ رسانی کا پہلا اصول سمجھنا چاہیئے۔

ورجل نے ہرقل کے قصہ میں لکھا ہے کہ کاکس نے اس کے چار بیل چرائے اور ان کی دم پکڑ کر اپنے غار میں لے گیا تاکہ کوئی ان کا سراغ نہ پا سکے کہ وہ کہاں چھپے ہیں لیکن ان کے ڈکرانے نے سارا راز فاش کر دیا۔ اب کاکس غریب کی کم بختی آگئی اس لیے ہماری ہمدردی اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ کلاسیکل قصوں میں

کا یہ نقص ہو کہ اس میں ہماری ہمدردی مجرم کے ساتھ ہو جاتی ہو موجودہ زمانہ میں اس نقص کو دور کرنے کی بڑی کوشش کی گئی ہو۔

علم الاصنام کے قصوں اور قدیم روایات میں بھی کہیں کہیں سراغ رسانی کی جھلک مل جاتی ہو۔ ایک آقا کا قصہ مشہور ہو کہ اس کے چور کا پتہ لگانے کے لیے اپنے تمام نوکروں سے کہا کہ وہ ایک جادو کی بلی کو ہاتھ لگائیں جو چور ہوگا اس کے ہاتھ لگاتے ہی بلی میاؤں کرنے لگے گی۔ آقا نے بلی کے رووئیں پر کوئی چیز مل دی تھی جب سب کے ہاتھ دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کے ہاتھ بالکل صاف اور بے داغ تھے وہی چور تھا اس لئے کہ اس نے میاؤں کے ڈر سے بلی کو دور ہی سے برائے نام چھو لیا تھا!

ایک شیر کا قصہ مشہور ہو کہ اس نے جنگل کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی دعوت کی لومڑی نے دیکھا کہ بہت سے ہرنوں کے بھٹ تک جانے کے تو نشانات ہیں لیکن واپسی کے نہیں ہیں اس لیے اس نے شیر کی دعوت نامنظور کر دی۔ یہ تمام قصے تجزیہ اور نفسیات کی واقفیت پر دلالت کرتے ہیں۔

لیکن ان قصوں میں اور موجودہ سراغ رسانی کے قصوں میں بڑا فرق ہو اس میں شک نہیں کہ ان کی عمارت اسی بنیاد پر قائم کی گئی ہو لیکن موجودہ حالات، سائنس اور نفسیات کی واقفیت نے اس کو ایک مستقل فن کی صورت دیدی ہو۔ اور اسی لیے اس کا صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے وسط سے قبل آغاز بھی نہیں ہوا۔ کانن ڈائل (۱۹۳۰ء - ۱۸۵۹ء) پہلا شخص ہو جس نے سراغ رسانی کے قصوں کی مقبولیت بڑھائی اور ۱۹۱۴ء کی لڑائی کے بعد ان کی مانگ اتنی بڑھ گئی کہ روز بازار ان سے بھرتے تھے اور روز خالی ہوتے تھے۔ سراغ رسانی کے قصے نوجوانوں میں زیادہ مقبول ہوئے۔ یوں تو ہر زمانہ کے نوجوانوں میں شوق تلاش و تجسس رہا ہو لیکن اس زمانہ کے نوجوان اس معاملہ میں اور بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ یہ عہد ہی تحقیق و دریافت کا ہو۔

موجودہ صدی تنقیح و احتساب سے عبارت ہو۔ اس میں ہر طرف جوش و گوش کی فراوانی اور عقل و فراست کی ارزانی نظر آتی ہو۔ وکٹوریہ کے عہد میں جو غیر مستدلالی ایمان و یقین پیدا ہو گیا تھا اس کے خلاف بغاوت کی گئی اور ایسی شدید کہ تمام پرانے اصنام خیالی کو مسمار کر دیا گیا۔ اب ہر چیز کو جانچا پرکھا اور

تولا جاتا ہے اور کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کیا جاتا جو انسانی ذہن و دماغ کو گوارا نہیں ہوتی۔ یہ شک اور شبہ کا دور ہے۔ اب فرض کر لینے اور کسی بات کو طے شدہ سمجھ لینے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ ہر مسئلہ کو چاہے وہ آرٹ کا ہو یا ادبیات کا، اخلاقیات سے متعلق ہو یا مذہبیات سے اسے غیر معتقدانہ اور تشکیکانہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور بڑی جانچ پڑتال، شدید غور و فکر اور رکر رسہ کر تجربوں کے بعد ہی کوئی فیصلہ دینے کی جرأت کی جاتی ہے۔

بیسویں صدی والوں نے عقل کی پاسبانی اور رہنمائی میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور معتقدات کی تمام بنیادیں ہل گئیں لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور رہا کہ ہر شخص میں تلاش و دریافت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور اس جذبۂ بے اختیار کی تسکین کے لیے نئے نئے سامان پیدا ہو گئے چیستاں اور معمے حل کرنے کا جیسا شوق اس زمانہ میں پیدا ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ادب اور خصوصاً قصے اور افسانے زمانے کے اس رنگ سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ سراغ رسانی کے افسانوں میں بیسویں صدی کے تمام میلانات آکر مجتمع ہو گئے ہیں اور وہ ہمارے جذبۂ تحقیق و تجسس کی آسودگی میں بڑی امداد کرتے ہیں۔

پچھلی جنگ عظیم کے بعد قیام امن و سکون کی جو کوششیں کی گئیں ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید "رومانی" ادب کو بہت نقصان پہنچے گا اور اب سوائے تجربہ خانوں کے انسان کو کہیں بھی کارنمایاں دکھانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس کے ثبوت میں ایچ۔ جی۔ ویلس کے سائنٹفک ناول پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں "دار التجربے ہی" رومان زار کی حیثیت سے دکھلائے گئے ہیں لیکن انسان ہمیشہ جوش آفریں محرکات کی جستجو میں رہا ہے۔ اس کمی کو سراغ رسانی کے افسانوں نے پورا کیا۔ اس لیے کہ ان میں اسرار و رموز، جانبازی اور حوصلہ مندی، خوف و ہراس، جوش و اشتعال سب ہی کچھ موجود تھا اور ان سب باتوں کی منطقی تشریح بھی موجود تھی جس سے سائنٹفک دماغ کو فرحت حاصل ہو سکتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں مادی اور صنعتی عہد کے خلاف زبردست رومانی ردعمل ہوا۔ اس زمانے میں ایسے ناول لکھے گئے جن میں فوق الفطرۃ عناصر شامل تھے اور اس دنیا کی تلخیوں سے گریز کر کے تخیل کے دامن میں پناہ لی گئی تھی۔ ہنگامہ خیز قصے دراصل انھیں فوق الفطرۃ

افسانوں کی دوسری کڑی یا اُن کا منطقی نتیجہ ہیں لیکن اس قسم کے قصوں کی ادبی ترقی اور کامیابی کا آغاز ایڈگرایلن پو (۱۸۰۹ء تا ۱۸۴۹ء) سے قبل ممکن نہ ہو سکا۔ وہ بوسٹن (امریکہ) میں پیدا ہوا اور آئرش نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے ماں باپ ایکٹر تھے اور شاید اسی اثر کی وجہ سے وہ ڈرامائی یا ہنگامہ خیز قصے کامیابی کے ساتھ لکھ سکا۔ وہ عجیب و غریب شخصیت اور ذہنیت کا حامل تھا۔ اس میں شاعر کی موضوعیت، ریاضی داں کی درست پسندی، فن کار کا تخیل اور سائنس داں کا ادراک۔ اس عمدگی کے ساتھ ہو گیا تھا کہ وہ اس کام کو حسن و خوبی انجام دے سکا۔ پو کے قصے جو طلسمی اور خیالی کہانیوں" کے نام سے مشہور ہیں، جدید جاسوسی افسانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے لیکن ان کا ایک بڑا نقص نصیحت آمیزی ہے بعض اوقات صفحے کے صفحے باہر جزمیات کا لکچر معلوم ہوتے ہیں اور ان کو اصل قصے سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ کانن ڈائل نے پو کے درسی اور خشک منطقی ڈھنگ کو بدلا اور سراغ رسانی قصوں کے دامن کو گل ہائے رنگا رنگ سے بھر دیا۔ انداز بیان کی شگفتگی اور روزمرہ کے ماحول کی دلکشی نے کانن ڈائل کی مقبولیت بڑھا دی اور اس کے "ہومز افسانے" گھر گھر پڑھے جانے لگے۔ اس سے قبل عہد وکٹوریہ کے دو مشہور ناول نویسوں مسز ہنری وڈ اور ولکی کالنس نے ایسے قصے لکھ کر جو جذبات اور ذہن و دماغ کو متاثر کرتے تھے کانن ڈائل کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔

سراغ رسانی کے افسانوں کی کامیابی کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک تو یہ کہ اس میں پڑھنے والے کی ہمدردی سراغ رساں کی طرف ہو جانا چاہیے ورنہ اسے ایسے قصوں میں کوئی لطف نہیں آئے گا جن میں مجرم کو برابر زک اور شکست ہوتی ہے۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس قسم کے قصے اپنی نوعیت کے لحاظ سے عقلیت کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں چند گتھیوں کو پیش کیا جاتا ہے اور گرہ کشائی کے لیے محض ناخن ہی نہیں بلکہ فہم و فراست بھی درکار ہوتی ہے۔ اس لیے سراغ رسانی کے قصے تعلیم یافتہ لوگوں ہی میں مقبول ہو سکتے ہیں۔ اگر قصہ ذہن و عقل کو متاثر نہیں کرتا بلکہ صرف جوش و خروش پیدا کرتا ہے تو وہ "THRILLER" (ہیجان انگیز) چیز ہے اور اس کی مانگ صرف معمولی پڑھے لکھے لوگوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ انگلستان میں انیسویں صدی کے آخر میں تعلیم کا شوق نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا اور ہر شخص کو

تعلیم سے محروم کیے جانے کے مسئلے پر غور کیا جا رہا تھا۔ اسی زمانہ میں تعلیمی قوانین پاس ہوئے اور جیل کے قوانین تعزیری کی اصلاح کی۔ پولیس کا باقاعدہ انتظام بھی اسی عہد میں ہوا جس کے ذریعہ انکشافِ جرم میں پہلے سے زیادہ ضابطہ اور قاعدہ برتا جانے لگا۔ یہ تمام باتیں سراغ رسانی کے افسانوں کی مقبولیت بڑھانے میں معاون ہوئیں اور ان محرکات نے پو کی بنیادوں پر فلک بوس قصر تعمیر کر دیا۔

کانن ڈائل کے شرلک ہومز کے قصے بہت مقبول ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ بکے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی نقل کرنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک شخص آرتھر مارلین کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو بھی کانن ڈائل کا مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ ڈائل نے لوگوں کو ایسا مسحور کر دیا تھا کہ ایک مدت تک کسی اور کو وہ قبولِ خاطر حاصل ہی نہیں ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں جا کر جی کے چسٹرٹن (۱۸۷۴ء–۱۹۳۶ء) شرفِ قبولیت اور خراجِ تحسین حاصل کر سکا۔ اس کے سراغ رسانی کے افسانوں نے تمام ادبی طبقوں میں دھوم مچا دی۔ ۱۹۲۲ء میں یہ رومن کیتھولک مذہب سے وابستہ ہو گیا اور اس تعلق نے اس کا مقصد پچھلے افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف کر دیا۔ اس نے اپنے افسانے قانون کی محبت میں یا تفریحِ طبع کے لیے نہیں لکھے بلکہ بہ حیثیت ایک مذہبی آدمی کے وہ یہ چاہتا تھا کہ مجرم کو اقبالِ گناہ کا موقع ملنا چاہیے۔ اور یہی اس کے نزدیک جرمیات کے مسائل کا سب سے بڑا حل تھا۔ چسٹرٹن کے "فادر براؤن" افسانے لطیف اصلاح پسندی سے قطع نظر اس اعتبار سے بھی قابلِ ذکر ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ دنیا کو بتلایا کہ اس قسم کے قصے ادبیات میں بھی بڑا مرتبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کی تباہ کاری اور خوں ریزی کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ انسان باوصف دعویٔ شائستگی اب بھی اتنا ہی بڑا درندہ ہے جتنا پہلے تھا۔ وحشت و بربریت کا عہد پھر تازہ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانے کی باگ پیچھے کی طرف موڑ دی گئی ہے۔ اس وقت ہر طرف خطرہ، شور اور ہنگامہ ہی نظر آتا تھا۔ ایسے ادبیات کے ذریعہ اس جذبۂ جانبازی و خطر پسندی کی تسکین غیر ضروری تھی اس لیے اسی زمانے میں جاسوسی افسانے لکھے گئے جو غیر محاربین کے لیے بہت کچھ دلچسپی کا سامان رکھتے تھے۔

جنگ کے بعد یعنی ۱۹۱۸ء میں رومانی جذبات بہت ابھر آئے اور امن قائم ہو جانے کے بعد ان کی تسکین کا مسئلہ پیش تھا۔ سب اہلِ فکر دلوں کو ٹٹولنے اور اسباب کی چھان بین میں مصروف تھے۔ اسی وجہ سے نفسیاتی ناول کا عروج ہوا۔ لیکن یہ چیز عام پسند نہیں تھی۔ فوج کے خستہ اور درماندہ سپاہی، بے روزگاروں کے جتھے اور ہنگامہ پسند عوام برگشتہ فکر اور مراقبوں کی فلسفیانہ تحریریں پڑھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے ان کی تسکین کا سامان صرف ہیجان انگیز افسانے اور سراغ رسانی کے قصے ہی بہم پہنچا سکتے تھے۔

۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم کے بعد سراغ رسانی کے افسانوں میں کافی تبدیلی اور وسعت پیدا ہو گئی اب افسانہ میں محض اسرار اور بھید ہی کا ذکر نہ ہوتا تھا بلکہ اب پیچ کا ایک معما پیش کیا جاتا تھا جس کے حل کرنے میں پڑھنے والے کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں آسٹن فری مین نے ایسے دلچسپ قصے لکھے جن کے ایک حصہ میں مجرم کے کاموں کی تفصیل ہوتی تھی اور دوسرے میں بڑی خوبی اور دلآویزی سے رفتہ رفتہ جرم کا انکشاف کیا جاتا تھا۔ کہ چیستاں کا لطف آخر وقت تک قائم رہے۔

بعض لوگوں نے اپنے سراغ رسانوں کی قابلیت دکھلانے کے لیے بے جا مبالغہ کیا ہے۔ اور عجیب عجیب مجرموں کی داستانیں لکھی ہیں۔ اس قسم کا مبالغہ ہیجان انگیز افسانوں میں تو کھپ جاتا ہے لیکن سراغ رسانی کے قصہ میں مجرم اور سراغ رساں دونوں کو اسی عالم آب و گل کا انسان ہونا چاہیے۔ کامیاب قصہ وہ ہے جس کو پڑھ کر قاری یہ نہ کہے کہ سراغ رساں کتنا ہوشیار ہے بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہو کہ میں کتنا بے خبر تھا کہ میں نے ان پتوں اور علامتوں پر غور نہ کیا:

اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سراغ رسانی کے قصوں میں نہایت معمولی قسم کے جرائم کی داستان ہونا چاہیے۔ جس کے انکشاف میں کچھ لطف نہیں ہے۔ تھوڑی سی رنگ آمیزی جیسے نرگسی آنکھوں میں سرمہ ہر صنفِ ادب میں ضروری ہے۔ اس لیے کامیاب افسانہ نگار کو یہ چاہیے کہ وہ عام اور عجیب کے درمیان کا راستہ اختیار کرے اور اس کے اشخاص افسانہ ایسے ذہین لوگ ہوں جو اسی دنیا کے آدمی معلوم ہوں لیکن روز کے کام میں عام اشخاص سے زیادہ اپنی فہم و فراست پر بھروسہ رکھتے ہوں۔ افسانہ نگار کو یہ خود کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ضروری اتا پتا بتلا دے تاکہ قاری کی دماغی تسکین بھی ہو سکے۔

سراغ رسانی کے قصوں پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اخلاق پر برا اثر ڈالتے ہیں معترض کے نز
جرم کی داستان بیان کرنا ہی جرم کی ترغیب دینا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ آسکر وائلڈ نے اپنے مضمون "دروغ با
کے زوال" میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کتاب کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ ا
پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا برا، لایعنی سی بات ہے۔ اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کتاب اچھی لکھی گئی ہے یا بُ
والٹر پیٹر کے نزدیک بھی کسی صنف ادب کو جانچنے کا معیار صرف حُسن و دلکشی ہے۔ اس کے علاوہ ان قصوں کا
ہی مجرم کا سراغ لگانا ہے۔ ایک اچھے اور کامیاب افسانہ میں ہماری ہمدردی کبھی بھی مجرم کی جانب نہیں ہو سک
ممکن ہے اس کی سزا کے وقت ہمارے اوپر ہمدردی کا جذبہ طاری ہو جائے اس لیئے اخلاقی اور فنی بہتر
اسی میں ہے کہ افسانہ کو انکشاف راز یا حراست مجرم کے بعد ختم کر دیا جائے۔ اس کے آگے قصہ کو بڑھانا یا ا
نگار کا جج کے فرائض انجام دینا خوش مذاقی اور فن دونوں کا خون کرنا ہے۔

سراغ رسانی کے اعلیٰ اور کامیاب قصے جذبات و احساسات کو نہیں بلکہ ذہن و دماغ کو متاثر کرتے ہیں
اس لیے ان کا شمار آرٹ کے زمرہ میں نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آرٹ غیر متغیر جذبات و کیفیات پر اثر ڈالتا ہے۔ ا
لیے حقیقی آرٹ ہمیشہ مستقل اور پائیدار ہوتا ہے۔ شیکسپیر حقیقی آرٹسٹ تھا اور اسی لیے آج تک زندہ ہے۔ اس
علاوہ سراغ رسانی کے قصے زیادہ تر زندگی کے ایک رخ کو نمایاں کرتے ہیں اور اس میں اصلی زندگی کے
تمام خط و خال نظر نہیں آتے۔ اسی لیے ان کا مقصد ہنگامہ خیزی، وقتی اور ذہنی تفریح سے زیادہ نہیں ہے لیکن موجود
زمانہ میں اسی قسم کے قصے مقبول اور محبوب ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہماری بے لطف اور بندھی ٹکی زندگی میں دلچسپ
پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اس صنعتی تہذیب اور میکانکی دور میں جبکہ انسان کو بھی کلوں کی طرح کام کرنا پڑتا ہے یہ قصے
ذرا ہنگامہ، لطف اور شور یا انبساط کا باعث ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی رونق ایک ہنگامہ پر موقوف ہے اور انسا
ہمیشہ سے سرور و شور اور جوش و خروش کا متلاشی اور تحقیق و دریافت کا جویا رہا ہے۔ سراغ رسانی کے قصے ہما
اس تشنگی کو رفع کرتے ہیں لیکن جس طرح شدید گرمی میں کہیں سے آکر بہت سا پانی پی لینا نقصان دہ ہے اسی طرح ا
قصوں کا مطالعہ بھی اعتدال سے نہ بڑھنا چاہیئے اگر یہ دماغی تفریح محض تلخیِ کام و دہن رفع کرنے کے لیے
حاصل کی جائے تو باعث لطف و مسرت ہوگی۔

اردو میں سراغ رسانی کے قصے بہت کم لکھے گئے ہیں ہمارے یہاں قصہ کا شوق کافی پرانا ہے۔ کتھاؤں اور جاتکوں کے قصوں، اقبال جرم کی پرانی کہانیوں اور طلسم و ساحری کے افسانوں میں کہیں کہیں سراغ رسانی کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اردو میں داستانی مثنویاں شروع ہی سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بعض اپنے مافوقی موضوع کے اعتبار سے ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ مافوقیت، پراسرار اور سراغ رسانی کے قصوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ انگلستان میں کالرج اور ہوریس والپول کی تحریروں نے جن میں مافوقی عناصر زیادہ نمایاں تھے اولین تخم ریزی کی۔ وکٹوریہ کے عہد میں ولکی کالنس وغیرہ نے اس زمین کی آبیاری کی اور پو کے ذریعہ تخم کی نشوونما کے آثار شروع ہوئے اور اس درخت کی پہلی کونپل کانن ڈائل کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اردو کی مثنویوں میں مافوقی عناصر کی کمی نہیں ہے۔ بدر منیر اور گلزار نسیم کی بنیاد ہی مافوق الفطرۃ ماحول پر قائم ہے۔ پرانے قصوں میں بھی مثلاً طلسم ہوشربا (طلسم نوخیز جمشیدی) اور بوستان خیال وغیرہ میں بھی خرق عادت، سحر و طلسم اور عیاری اور مخبری کے متعدد قصے مل جاتے ہیں لیکن ان چیزوں کو دراصل موجودہ زمانے کے جاسوسی افسانوں سے (جن کے درمیان کئی عبوری منزلیں حائل ہیں) کوئی راست علاقہ نہیں ہے اور یہ شمع محمود شاہان ملک کی مجلس برخاست ہو جانے کے بعد بھڑک کر خاموش ہو گئی۔ اب اس کو کوئی دوسری مشعل ہی روشن کر سکتی تھی۔

برطانوی حکومت کے مستقل قیام، پولیس کے باقاعدہ انتظام، اخباروں کی روزافزوں ترقی، انگریزی تعلیم کے فروغ اور مغربی اثر نے نئے خیالات پیدا کیے۔ وہ چراغ پھر نئے تیل سے روشن کیا گیا اور لوگ پو اور کانن ڈائل کی طرف بھی متوجہ ہوئے چنانچہ موخرالذکر کے بہت سے ترجمے ہوئے اسی سلسلہ میں پروفیسر فیروزالدین مراد اور محمد یعقوب کلام (مترجمین حکایات ہومز) پروفیسر نصیرالدین عثمانی (مترجم وادی خوف) اور محمد نصیر احمد (مترجم حلقہ مسموم اور خاندانی آسیب) قابل ذکر ہیں۔ ڈائل کے علاوہ اور جاسوسی مصنفین کے بھی ترجمے ہوئے۔ کچھ ہنگامہ خیز قصے سلطانہ ڈاکو، قتل بے گناہ، پراسرار انسان، ٹوپی کا سراغ وغیرہ نہایت سستے چھپے تاکہ عوام تک پہنچ سکیں۔ ان میں کچھ معمولی انگریزی قصوں کے خاکے ہیں جن کو مقامی لباس میں حذف و اضافہ کے بعد پیش کر دیا گیا ہے۔ بعض طبع زاد بھی ہیں جن کا مقصد ذہنی تفریح سے زیادہ ہنگامہ خیزی

ہے۔ ہمارے یہاں اول تو تعلیم کی کمی اور طبیعتوں کی افسردگی کی وجہ سے جاسوسی لٹریچر بہت کم ہے اور جو کچھ ہے بالکل گھٹیا اور ابتدائی صورت میں۔ اس میں نہ منطقی استدلال ہے اور نہ دماغی فرحت کا سامان۔ اس کی ساری عمارت اتفاقات اور حادثات پر قایم ہے۔ غور و فکر اور مشاہدہ اس میں نام کو نہیں۔ فنی خوبیاں بھی اس میں مفقود ہیں۔ ایک نقص جو عام طور پر ان معمولی قصوں میں ملتا ہے وہ یہ کہ مجرم کو جب تک پھانسی نہیں ہو جاتی کتاب ختم ہی نہیں ہوتی۔ بعض قصوں میں بے حد مبالغہ ہے۔ اور اشخاص افسانہ معمولی گوشت پوست کے انسان نہیں معلوم ہوتے۔ اور وہ انسانی کمزوریوں اور خوبیوں سے بالکل مبرّیٰ نظر آتے ہیں۔ ان قصوں کا انداز بیان بھی اصول فن کے اعتبار سے ناقص ہے۔ مختصر یہ کہ ان میں بجز ہیجان انگیزی اور عوام فریبی کے اور کوئی وصف نہیں ہے۔

مولوی ظفر عمر اس بے آب و گیاہ سرزمین میں ایک نخلستان کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ سراغرسانی میں انھیں کافی درخور حاصل ہے کیونکہ ان کی عمر ہی پولیس کے کام میں صرف ہوئی ہے لیکن ان کے یہاں بسا اوقات مجرم کو فنی ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدی جاتی ہے۔ ایک گتھی کو پیش کرنا اور پھر ایک ایک ڈورے سائنٹفک قابلیت سے سلجھانا، جو اگاتھا کرسٹی کا وصف ہے۔ مولوی ظفر عمر کے یہاں بھی ہے لیکن معمولی حقیقت یہ ہے کہ ابھی اردو میں ایک شرلک ہومز، ڈاکٹر تھارن ڈائک اور فادر براؤن کی بڑی کمی ہے۔

کیا عجب ہے کہ موجودہ جنگ کے محرکات ہمارے افسانہ نویسوں کے ذوق کو مہمیز کریں اور وہ مولوی ظفر عمر کی بنیادوں پر ایک بلند عمارت تعمیر کر کے اردو کے دامن کو دلچسپ قصوں سے بھر دیں۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔اے

اندرون مصر

یورپ میں صرف ایک جگہ ہے انگلستان پر حملہ کرکے اسے بُری طرح نقصان پہنچایا جا سکتا ہے اور وہ مصر ہے۔ (ڈاکٹر پال روہربیک جرمن ماہر جنگ)

جرمنوں کا نہر سوئز پر نرغہ ہوا اور مصر بھی یورپین اور امریکہ کے اخبارات کی سرخیوں میں نمایاں نظر آنے لگا۔ اس سے پہلے بیشتر امریکی اسے ایک رنگین سرزمین خیال کرتے تھے جہاں سیاحت کرنا راحت فزا ہے۔ ابوالہول اور اہرام مصری، ریتیلی زمین، اونٹ سیاح، بحیرہ روم کے مسافر جہاز اور فرعونوں کے مقبرے اس سے متعلق ہیں اور پھر ایسی سرزمین میں جہاں مطلع ہمیشہ صاف اور دھوپ تیز رہتی ہے۔ ریگستان کا رومان اور مشرقی اجنبیت مل جل کر عجیب فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

لیکن آج کل کا مصر عجیب متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے۔ سیاح اب بھی گھومتے پھرتے ہیں اور آثار قدیمہ کے ماہر جستجو کرتے ہیں مگر اس کی ایک اور حیثیت بلند تر ہے۔ یہ بہت اہم فوجی مرکز ہے اور یہیں سے روئی، چاول اور غلہ دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ بحیرۂ روم کا دروازہ ہے اور یہاں سے مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے راستے کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ اگر انگریز مصر سے باہر نکال دیے جائیں تو جرمنوں کی طاقت بحر شمال سے لے کر ہمالیہ تک ناقابل شکست ہو جائے گی نیز وہ ان ڈکٹیٹروں کو تیل کا اس قدر کافی ذخیرہ مل جائے گا کہ وہ دس کیا بیس سال تک جنگ جاری رکھ سکیں گے۔

تمام عملی مقاصد کے لیے مصر سے مراد نیل کی وادی لی جاتی ہے۔ اس کا رقبہ ۲،۳۵۰۰۰ مربع میل ہے جس میں ۳۳۲،۰۰۰ مربع میل ریگستان ہے۔ دریائے نیل باقی بارہ سو میل کے باشندوں کے لئے خون زندگی کا کام کرتا ہے۔

نیل میں پانیوں کا بہت وسیع سلسلہ ہے اور انہیں سے اس پر قابو رکھا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ ایکڑ مزید زمین قابل کاشت [illegible] کے ارد گرد نہریں ہیں یہ دریائے سیراب ہوتے ہیں ان جزیروں میں گنے

میں (جو دریا کی طغیانی کا زمانہ ہے) چالیس دن کے لیے تین فیٹ اونچا پانی چھوڑا جاتا ہے۔ اس کے بعد پانی نکال دیتے ہیں اور زمین پر جو بے حد زرخیز ہے بیج بو دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح گنے، روئی، غلہ پھل اور ترکاریوں کی کاشت کی جاتی ہے بیشتر دو فصلیں اور اکثر تین فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔

نیل مصری تجارت کی بھی جان ہے اس کے ذریعے سے ملک کی بیشتر پیداوار ساحل سمندر پر جو آ دریا ملکی ضروریات کے لیے پہنچائی جاتی ہے۔ دسیع سپاٹ پیندے والی کشتیوں میں سامان لے جایا جاتا ہے۔ یہ کشتیاں پانی کے ساتھ بہہ کر نیچے پہنچتی ہیں اور پھر کسان انہیں رسیوں سے باندھ کر اوپر کھینچ لاتے ہیں بہت ۳
سی دخانی کشتیاں بھی نیل میں چلتی ہیں مگر آدمیوں اور بادبانوں سے کشتی رانی ارزاں ہے۔

<u>جہاں شرق و مغرب ملتے ہیں</u> | نیل کا ڈیلٹا مشرق کا آستانہ اور مغرب کی منزل رہا ہے۔ یہاں شرق اور مغرب قدیم اور جدید مل جل جاتے ہیں اور نسل زبان، آداب اور روایات کے اس عجیب مرکب میں جو دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں ملتا ان کا امتیاز رفتہ رفتہ فراموش ہو جاتا ہے۔

مصر میں دو تمدن نشو و نما پاتے ہیں گھوڑا اور خچر گاڑی، بھاپ سے چلنے والے اور پٹرول انجنوں کے باوجود باقی ہیں۔ لوہے اور کنکریٹ نے کچے گھروں اور لکڑی کے یک منزلہ مکانوں کی جگہ لے لی ہے۔ مگر وہ بالکل معدوم نہیں ہوئے۔ مصریوں کا اعلیٰ طبقہ بانڈ اسٹریٹ لندن کے کپڑوں میں ملبوس گھومتا ہے ادنیٰ لوگ اب بھی سوتی گلابیہ جو بورے کی طرح سلی ہوتی ہے پہنے ہوئے ننگے پیر شہر یا کھیتوں میں پھرتے رہتے ہیں۔

دارالسلطنت قاہرہ میں ہزار سالہ قدیم جامعہ آزہر ہے جو ساری اسلامی دنیا کا علمی مرکز ہے اسکندریہ میں ...... مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں اس کی بنیاد دو ہزار سال ہوئے سکندر اعظم نے ڈالی تھی اور اس وقت سے یہ دنیا کا سرسبز شہر ہے قاہرہ اور اسکندریہ میں وسیع اور عالیشان موسم انتہائی [illegible] دفاتر بنے ہوئے ہیں جن کے درمیان جدید طرز کی سڑکوں پر لنکن، رولس رائس اور کیڈیلاک موٹریں فٹن اور خچر گاڑیوں کے پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔ کناروں کی سڑکوں پر خاکی وردی پوش انگریز فوجی افسر آسٹریلیا کے سپاہی اور یونانی تاجر اور منکسر شامی سوداگر پیادہ اور کوڑی غریبوں سے کندھے رگڑتے ہیں جو گھٹنے چیتھڑوں میں نیم برہنہ گھوما کرتے ہیں۔

سنیچر یا اتوار کی شام کو فیشن پرست اہل پولیس گھوڑ دوڑ کا میدان ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنگ سے پہلے ایسپم ڈاونس یا لانگ چیمپس تھے۔ بابیلیکا کا بازار الف لیلہ کا زندہ مرقع ہو موٹے نازنے پسینے میں شرابور مصری تاجر سفید گرگندے گالا بیہ اور لال شکستہ ترابونیئے مصر کے قومی لباس میں اپنی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے آگے تختوں پر بیٹھے چلاتے رہتے ہیں یا آس پاس کی گلیوں میں زور شور سے کوئی سودا چکاتے ہیں۔ قاہرہ کے اس حصے میں جہاں مشہور شیرڈ ہوٹل ہے جس میں امن کے زمانہ میں یورپ کے مہذب اور شائستہ لوگ ٹھہرتے تھے نصف درجن کے قریب دیسی قہوہ خانے ہیں۔ وہاں غریب مصری سنگ مرمر کی میزوں کے کنارے گھنٹوں بیٹھے قہوہ یا زب زب پیتے اور خلا میں دیکھتے رہتے ہیں۔

مصر حاضر کی پیدائش | مصر سے یورپ کو روشناس کرانے کا ذمہ دار نپولین بونا پارٹ تھا ۱۷۹۸ء میں اس نے چھ ہزار سپاہی مصر میں اتار کر میلوک سورماؤں کو شکست دی۔ اس نے اپنی بھاری توپ سے اتفاقیہ ابوالہول کی ناک کا ایک حصہ اڑا دیا۔ اور بعد میں سائنس دانوں کی ایک جماعت کو ملک کی پیداوار اور وسیلوں کا اندازہ لگانے کے لیے چھوڑ گیا۔ جب اس کے بیڑے کو جنگ ٹرافلگار میں شکست ہوئی تو اسے مصر فتح کرنے کے خیال کو چھوڑ دینا پڑا اور پھر مصر عثمانیوں کے زیر نگیں ہو گیا۔ موقع شناس البانوی سردار محمد علی نے جس کی اولاد سے موجودہ شاہ فاروق ہیں مصر کو دوبارہ فتح کر لیا اور ترکی خلیفہ کے نام سے حکومت کرتا رہا۔

لیکن نپولین ساحل سمندر پر اپنے نقوش پا چھوڑ گیا تھا۔ مصری امرا کی زبان فرانسیسی ہو گئی جو اب بھی ہے جب خدیو اسمٰعیل کو اپنی فضول خرچیوں کے لیے روپیہ کی ضرورت پڑی تو فرانسیسی سرمایہ دار بلائے گئے اور جب فرڈیننڈ ڈی لس پاس نے نہر سوئز بنانے کی اجازت حاصل کی تو اس کے حصے بھی بیشتر فرانسیسی سرمایہ داروں نے خریدے۔

۱۸۷۵ء تک برطانیہ اس تصویر خانہ میں نہیں آیا۔ اس زمانہ میں ڈسرائیلی نے خدیو اسمٰعیل کے ہمیشہ دیوالیہ رہنے سے فائدہ اٹھایا اور نہر کے ۲۰۰۰۰۰۰۰ ڈالر کے حصے خرید لیے اور اس کے بعد متواتر قرض دیتا رہا۔ بالآخر برطانیہ اور فرانس اس پر مجبور ہوئے کہ وہ مصر کے مالیات پر دوہری قابو رکھیں خدیو کو مجبور

کیا گیا کہ وہ اپنے سے زیادہ سمجھدار بجائے تونین کے حق میں مستعفی ہو جائے۔ ٹیکس کے طریقے کی اصلاح ہوئی زمی قرضہ کم کیا گیا۔ برطانوی اور فرانسیسی افسروں کو مصری نظام میں عہدے دی گئیں اور مغربی طرز طریقے رائج کیے گئے۔

ان اصلاحوں کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک جانباز مصری افسر عربی پاشا نے مسلح بغاوت کی ۱۸۸۲ء میں عربی پاشا کو شکست ہوئی اور برطانیہ نے مصر پر تسلط جمانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۸۸۳ء میں سخت پیچیدگیوں کا سامنا تھا۔ فرانس مصر میں پھر سے دلچسپی لے رہا تھا۔ اور گورنل گرشیڈ سوڈان میں نشو و نما پر گنگ لے کر مارا رہا ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور انتہا پسند شخصیت مہدی نے جو خود کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے بتلاتے تھے بڑی جرأت سے آزادی پھیلانے کی کوشش کی مگر ان کو جنگ عمدرمان میں افسوس ہو کہ شکست ہوئی۔ یہ جنگ ۲۱ لانسرس رجمنٹ کی وجہ سے مشہور ہے۔ جس میں لفٹیننٹ ونسٹن چرچل نے حصہ لیا تھا۔ یہ لارڈ کرومر کا زمانہ عروج تھا۔ جب جنگ چھڑ گئی تو برطانیہ مصر کے ماتحت حکومت زیر حمایت ہونے کا اعلان کر دیا۔

صلح نامہ میں پریسیڈنٹ ولسن نے قومی خود مختاری کا اصول مدنظر رکھا اس نے مصر میں سخت ہنگامہ بپا کر دیا۔ ایک قومی تحریک پیدا ہوئی جس کا نعرہ "مصر مصریوں کے لیے" تھا۔ اس نے جلسے اور طلبا کے مظاہرے کرائے اور دہشت انگیز تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔ آخر میں برطانوی سردار (کمانڈر انچیف) سرلی سٹیک کو سعد زاغلول پاشا کے رفقا نے قتل کر دیا۔ تب برطانیہ نے مدافعتی تدبیریں اختیار کیں۔ دبابے اسکندریہ کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور تھوڑی مار دھاڑ بھی ہوئی اور نظام از سر نو قائم ہو گیا۔ زاغلول پاشا اور دیگر نمایاں مصری لیڈر جلا وطن کر دیے گئے۔

آخر ۱۹۲۲ء میں برطانیہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ قوم پرستوں کے مطالبات حق بجانب تھے چند مستثنیات کے علاوہ مصر کے آزاد اور خود مختار ہونے کا اعلان کر دیا گیا اور شاہ فواد اول اس کے پہلے حکمران ہوئے۔

اس وقت تک برطانیہ نے تجارتی اور مالی اعتبار سے مصر میں پوری طرح سے قدم جما لیے

اس نے .... ڈالر ملک میں قومی قرض، نیشنل بینک مصر، کمپنیوں، کانوں، روئی کے کارخانوں اور سیاحی ایجنسیوں میں پھیلا رکھے تھے۔ ۱۹۲۲ء کے صلح نامہ میں بہت سے مستثنیات تھے جن کی رو سے انگلستان کا مصر کی مالیات پر قابو باقی رہتا تھا۔ اسی سے اس کا سرمایہ محفوظ تھا اور غیر ملکی ٹیکس اور مصری قانون کی رو سے باہر تھے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کا یہ حق بھی مسلم تھا کہ وہ سرزمین مصر پر تھوڑی سی مسلح فوج بھی رکھے۔

۱۹۳۰ء کے درمیانی مہینوں میں برطانیہ کو ڈکٹیٹروں کے عروج اور خاص طور سے اٹلی کی بحیرۂ روم میں روزافزوں طاقت کو دیکھ کر تشویش پیدا ہوئی اور اس وقت پھر مصر میں یہ تحریک ہوئی کہ غیر ملکیوں کا اقتدار بالکل ہٹا دیا جائے۔ خاص قومی انجمنوں کے ساتھ دو فاشستی خیالات رکھنے والی جماعتیں بھی پیدا ہوئیں۔ نوجوان مصری پارٹی یا سبز قمیص والے جن کی مالی امداد اطالوی حکومت کرتی تھی۔ اور نیلی قمیص والے جنگی سپاہی جو جرمن طوفانی سپاہیوں کے نمونے پر تھے جنھیں جنگ عظیم میں خاص اور اہم خدمات کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس کے لیڈر اولوالعزم مدبر نحاس پاشا تھے۔ ڈکٹیٹروں کے یہ اثرات بہت جلد زائل کر دیئے گئے مگر مصری وطن پرستوں نے برطانیہ کے خلاف احتجاج جاری رکھا۔

۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے مصر کی آزادی دوبارہ تسلیم کی اور دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد اور امداد کے معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ اگلے سال ۱۹۲۲ء کے مستثنیات کو بھی رد کر دیا گیا اور مصر جمعیۃ الاقوام میں بھی داخل کر لیا گیا۔ اس کے معاوضہ میں برطانیہ کو مصر نے اس بات کا حق دے دیا کہ وہ نہر سوئز کے علاقے میں دس ہزار فوج اور چار سو طیارے اور ہوا باز رکھے تاکہ ان سے دو دبار کی حفاظت کی جا سکے۔

۱۹۳۶ء کے معاہدے کے مطابق مصر نے اٹلی اور جرمنی سے سیاسی رشتے منقطع کر لیے ہیں۔ جرمن اور اطالیوں کا مال جس کا اندازہ ....۰ ڈالر کیا جاتا ہے حکومت نے ضبط کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ذکر دلچسپ ہوگا کہ مصر کا سالانہ بجٹ ....۰ ڈالر سے زیادہ نہیں بڑھتا۔ اس کے علاوہ ۰۰ ہزار جرمن اور اطالوی جو مصر میں رہتے تھے اور جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اپنی اپنی حکومتوں کی امداد کرتے [illegible] نظر بند کر دیا گیا۔ گزشتہ جون سے مصر میں فوجی قانون نافذ کر دیا گیا ہے [illegible] جنگ [illegible] کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اسکندریہ اور قاہرہ کی تیس فیصدی آبادی ساحل کی جگہوں سے ہٹائی جا [illegible]

گئی اور فضائی حملوں سے بچنے کی تدابیر کی گئی ہیں۔ لیکن اس امر کے باوجود کہ مصر افریقہ میں جرمن اور اطالوی فوجوں کی منزل مقصود ہے مصری حکومت نے اپنی غیر مداخلتی پالیسی برقرار رکھی ہے۔

اس حکمت عملی کے وجوہات کچھ تو فوجی اور بیشتر سیاسی ہیں۔ اہم جنگی مسئلہ یہ ہے کہ مصر ایسا مسلح نہیں کہ ہر نوع ہوائی حملوں کا مقابلہ کر سکے۔ اگر قدیم مصریوں پر فضائی حملہ ہوا تو ان میں دہشت پھیل جائے گی۔ اور جانوں کا بھی بہت نقصان ہوگا۔ کیونکہ وہ نہ تو ذہنی اور مادّی طور پر اس طریقۂ جنگ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سارے قاہرہ میں جہاں ۱۴۰۰۰۰۰ کی آبادی ہے صرف تیس چالیس تہہ خانے ہیں اور وہ بھی محض گڑھے کھود کر ان پر لکڑی کے تختے ڈال دیے گئے ہیں اور اوپر سے ریت بچھا دی گئی ہے۔ اس میں صرف کھڑے رہنے کی جگہ ہے۔ ہوا اور روشنی کا کوئی انتظام نہیں اور فضا اس قدر گندی ہے کہ اب تک تہہ خانوں میں اتنے حادثے ہوئے ہیں جتنے باہر نہیں ہوئے۔

جماعتیں اور سیاسیات | جنگ ہی کے مسئلہ پر مصری جماعتوں اور سیاست دانوں میں اختلاف ہے۔ عدم مداخلت پسندوں کے لیڈر شاہ فاروق ہیں۔ گو شاہ فاروق محض برائے نام حکمراں ہیں مگر در حقیقت وہ بہت سے اختیارات عمل میں لاتے ہیں۔ شاہ موصوف اپنے باورچی، موٹر ڈرائیوروں اور موٹر سائیکل سوار دل محافظوں سے لے کر محل کے خاص انجینیر واکر ڈیروکی تک بہت با اثر اطالوی جماعت سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے والد شاہ فاروق نے اٹلی میں تعلیم پائی اور اطالوی فوج میں تربیت حاصل کی۔ ان کے مشیر خاص عرصے سے نرم رَو علی مہر پاشا شاہی جماعت کے لیڈر رہے ہیں۔ حال ہی میں برطانوی سفیر سر مائلس لیمپسن نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اٹلی اور جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیں اور اسی مسئلہ پر انہوں نے گزشتہ جون میں استعفیٰ دے دیا۔

مصر میں بہت سے سیاست داں بھی ہیں جو جرمنوں کے تو خلاف ہیں مگر برطانیہ کے ساتھ بھی نہیں ہیں۔ سابق وزیر اعظم صابری پاشا بھی ان ہی میں سے تھے۔ پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں وہ افتتاحی تقریر کرتے ہوئے انتقال کر گئے۔ موجودہ وزیر اعظم حسین سری پاشا بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

مصر کی موجودہ سیاست میں محال مجسم یہ ہو کہ سعدی یا قومی جماعت جرمنوں اور اطالویوں کے خلاف اعلان جنگ کے لیئے چلا رہی ہو اور یہی جمعیتہ برطانیہ کے تحت خلاف رہی ہو۔ سعدی کہتے ہیں کہ مصر کا آزاد قوم کی حیثیت سے وقار اور اس کا قومی مفاد اس بات کی ضرورت پیش کرتے ہیں کہ جلد از جلد مداخلت کی جائے۔

مصر میں گو عام رائے دہندگی ہو مگر وہاں کے لوگ درحقیقت بالکل گونگے ہیں اور حکومت کے لائحہ عمل بنانے میں کوئی دخل نہیں رکھتے۔ اہرام مصری بنانے والے غلاموں کی اولاد سے فلاحین ہیں اور یہ آبادی کا بیشتر حصہ یعنی ۱۶،۰۰۰،۰۰۰ ہیں۔ ان میں سے نوے فی صدی جاہل ہیں اور صرف دو فی صدی سیاسی احساس رکھتے ہیں۔

فلاحین کی حالت بھی بہت فرسودہ ہو۔ وہ مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ اپنے زمینداروں کا کام دس سنٹ روزانہ پر کرتے ہیں اور نطیری روٹیاں ہیم کھجور اور اکثر گوشت کھا کر زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ ان میں سے آدھے سے زیادہ آشوب چشم میں مبتلا رہتے ہیں۔

چونکہ وہ جاہل ہیں اس لیے ان کی خبروں کا وسیلہ صرف ریڈیو ہو۔ شام کو وہ گاؤں کے قہوہ خانے میں بیٹھے نارجیل پیتے ہوئے چیخنے چلاتے ہو سر کی بازی پر بازی کھیلتے رہتے ہیں۔

خبروں کے وقت عقیدت مندانہ خاموشی طاری ہو جاتی ہو اور تمام حرکات بند ہو جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے جو خبریں اس وقت سنی جاتی ہیں وہ اطالوی نشرگاہ باری سے نشر ہوتی ہیں۔ ایک عربی مقرر وہاں سے برطانیہ کے خلاف پرجوش پروپیگنڈا کرتا رہتا ہو اور برطانیہ کی زبردست شکستیں سنا کر جذبات کو اور بھڑکاتا ہو۔ ۳ جنوری ۱۹۳۸ء سے B.B.C. نے عربی میں خبریں اور تقریریں نشر کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہو اور نشرگاہ باری سے برسرپیکار ہو۔ مصر کی نشریات کو مقبول بنانے کے لیئے اس نے ایک مشہور مصری گویے کو نوکر رکھ لیا ہو جو خبروں کے درمیان رسیلے عشقیہ گانے سناتا ہو۔ یہ تدبیر بہت مجرب ثابت ہوئی ہو۔ مگر برطانیہ اور اٹلی کے متضاد دعوے فلاحین کو سرگرداں کر دیتے ہیں۔ درآں حالیکہ وہ جو کچھ ریڈیو پر سنتے ہیں اسی کو یقین کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ عرب اپنے بھائی کو ایسے نازک مسئلہ

پھر کیسے دھوکا دے سکتا ہے۔ اور بازی اور لندن کے مقرر چاہے عقائد کیسے رکھتے ہوں لیکن سچے مسلمان تو ضرور ہیں۔

بحیثیت مجموعی مصر کے خیالات جرمنی اور اٹلی کے شدت سے خلاف ہیں اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ وہ برطانیہ کے بھی مخالف ہیں۔ مگر مصری اور خاص طور سے وہاں کے سمجھدار لوگ، ممبران پارلیمنٹ اور تعلیم یافتہ طبقہ جو آبادی کا دس فی صدی ہے سمجھتے ہیں کہ صرف برطانیہ کی فتح سے مستقبل امید افزا ہوسکتا ہے اور وہ خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ جرمنوں نے جو ممالک فتح کیے ہیں ان پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ حکومت کی اس پالیسی کو کہ عربوں میں یہ فیاضانہ جذبہ قایم رکھا جائے کہ وہ برطانیہ کے ساتھ غیر جانبدار رہیں قدر کرتے ہیں۔ وہ برطانیہ کی عزت کرتے ہیں لیکن اتنی محبت نہیں کہ وہ ان کے ساتھ لڑکر جان دینے پر آمادہ ہوجائیں۔

بہرحال مصر کی مداخلت افریقہ میں حکومتوں کے توازن قوت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں پیدا کرے گی۔ (ترجمہ)

شفقت اللہ کرمانی بی۔اے (آنرز)

آخر کیوں؟

شہر کے روشن بازاروں میں گھومے گھومے چلنے والے
گرما کی دوپہر میں جیسے دُھندلے سائے ڈھلنے والے

اونچے اونچے ایوانوں کے مرجھائے کملائے باسی
لب کھلے آنکھیں اندھیاری جیسے نئی چالوں میں آ کر

بڑی بڑی تنخواہوں والے سبھی اطمینان سے عاری
اُن کے جسم امراض کے مخزن گولیوں پہ ہیں بھاری؟

سیٹھ ہوں یا دفتر کے بابو فرزانے ہوں یا دیوانے
سب کی روحیں میلی جیکٹ چیتھڑے جیسے پھٹے پرانے

شہروں کی البیلی پریاں یا گاؤں کی دوشیزائیں
سب کے من میں کھوٹ بھرا ہے اوپر سے چاہے مسکائیں

لمبے ناموں والے لیڈر، ملک کی ناؤ کھینے والے
سب کے سب ہیں زر کے بندے یہ آزادی دینے والے

کالج کی دیوار کے پیچھے ذبح ہوئی غیرت کی دیوی
رقصاں ہے تہذیب کے پردے میں عریاں وحشت کی دیوی

چھٹا ہوا ہر دھرتی سے آکاش سے باتیں کرنے والا
راہ کے تنکے چنتا ہے آزادی کا دم بھرنے والا

یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟ اے بندوں کی سننے والے!
فرش پہ کیوں ٹھٹکیں دھڑیں ہیں عرش سے تارے چننے والے؟

احمد ندیم قاسمی

غزل

یوں پرسشِ ملال وہ فرما کے رہ گئے — شکوے مری زبان تک آ آ کے رہ گئے ۴
پہلے تو عرضِ غم پہ وہ جھنجلا کے رہ گئے — پھر کچھ سمجھ کے سوچ کے شرما کے رہ گئے
وہ کون ہے جو تا سرِ منزل پہنچ سکا — دھندلے سے کچھ نشان نظر آ کے رہ گئے
بارِ عیادت اُٹھ نہ سکا اُف رے نازکی — تکلیف چند گام وہ فرما کے رہ گئے
اب دل سے کیا نکلتے ہیں تیرِ نگاہِ ناز — جو دل میں آ کے رہ گئے بس آ کے رہ گئے
نغموں پہ میرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے — کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے
آئینہ چوم چوم رہے تھے وہ بار بار — دیکھا جو یک بیک مجھے گھبرا کے رہ گئے

ہر شکر انتقامِ محبت ہو اسے جگر
شکوہ نہیں ہو اُن سے جو تڑپا کے رہ گئے

جگر مرادآبادی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

نقش اول: از صالحہ عابد حسین۔ ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ صفحات ۲۳۲، قیمت عہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی

یہ بیگم عابد حسین کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دو ایک نئے بھی ہیں۔ ان قصوں میں زیادہ تر ہماری گھریلو زندگی کی چلتی پھرتی زندہ تصویریں ہیں۔ ہماری تہذیب ہماری معاشرت ہمارے معتقدات ہمارے رسوم و رواج اور ہمارے توہمات غرضکہ ہر چیز اس میں موجود ہے۔ مصنفہ نے عورتوں کی سیرت اور ان کے رہن سہن کے طریقوں کو بہت غور سے دیکھا ہے اور ان کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اصلاحی غرض بھی زیادہ تر پس منظر میں رہی ہے۔ مصنفہ کے قصے ہلکی پھلکی تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دراصل ان کے بیان کی سادگی اور شستہ پن ہے۔

ہماری رائے میں صالحہ صاحبہ اگر ناول نگاری اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ ان کے قصوں سے تشنگی پوری نہیں ہوتی اور ذہن گھریلو زندگی کو تمام تر دیکھنے کا متلاشی رہ جاتا ہے۔ یوں بھی لذیذ حکایت دراز ہونی چاہیے۔ ذرا افسانہ نویسی کے گُروں کے برتنے کی بھی ضرورت ہے۔ تاکہ افسانویت ذرا اور اثر انگیز ہو جائے۔

گُل و مُل :- از سید علی عباس صاحب عباس۔ ناشر انجمن ترقی ادب دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات کل ۲۸۰
قیمت عہ، کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ عباس صاحب بہار پوری کے اردو و فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اردو کلام ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور فارسی کلام ۵۰ صفحات پر۔ شروع میں ہدایت حسنی صاحب ایم اے کا ۶۲ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں عباس صاحب کی زندگی اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے

حضرت عباس بہار کے ایک کہنہ مشق اردو و فارسی کے شاعر ہیں۔ کلام میں پاکیزگی خیال اور

نفاق اور اصل ادبیت ہر جگہ نمایاں ہے اور یہ تمام فیض غالب مرحوم کا ہے۔ عباس صاحب غالب کے پرستاروں میں سے ہیں۔ تمام کلام پر رنگ ان ہی کا چڑھا ہوا ہے حالانکہ تخیل کی وہ نزاکت اور جدت طرازی نہیں پیدا ہو سکی ہے پھر بھی خیالات کی شائستگی اور کلام کی پختگی میں تمام دہلوی رنگ موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تسخیر کائنات بود التفاتِ دوست — عالم بکامِ ماست کہ او شد بکامِ ما

جن کی دنیا معترف تھی وہ مری خودداریاں — خوب کام آئیں کہ نذرِ پائے درباں ہو گئیں

عقل کی خامی کا اے دل گر مداوا کیجیے — پختہ کارانِ جنوں سے ربط پیدا کیجیے

کیجیے تعمیر ہر ذرہ پہ سو عرشِ خیال — دیدۂ دل وقفِ تعلیمِ تماشا کیجیے

ترتیب کلام میں ردیف کے بجائے اگر تاریخ کا خیال مدنظر رکھا جاتا تو بہتر تھا۔

جامِ طہور:۔ از خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی۔ ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ لاہور۔ صفحات ۱۸۱ سائز ۲۰×۲۶/۱۶۔ قیمت درج نہیں۔ کاغذ معمولی کتابت و طباعت عمدہ۔

یہ مجموعہ اثر صہبائی کی رباعیوں اور قطعات کا ہے۔ شروع کے ۲۰ صفحوں میں اپنی شاعری کے متعلق مختلف اشارات دیے گئے ہیں جس سے ان کی شاعری کا پس منظر سامنے آجاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں خیام، شریک حیات کی موت، گاندھی۔ ٹالسٹائی، اقبال اور ٹیگور سے تاثر پذیر ہوتے رہے۔ بہتر یہ ہوتا اگر رباعیات کی ترتیب بھی ان ہی ادوار کے تحت کی جاتی۔

اثر صاحب کی شاعری ایک پاک خیال، صوفی منش اور حق پسند انسان کی شاعری ہے۔ اہرمن و یزداں خیر و شر، تزکیۂ نفس، موت و حیات، فنا و بقا، عدم اور وجود، جبر و قدر وغیرہ فلسفیانہ مضامین اثر صاحب کے کلام کے خاص جزو ہیں۔ وہ ان مابعد الطبیعیاتی بلندیوں سے بہت کم نیچے اترتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان فلسفیانہ مضامین کو وہ ایسی خوبی اور دلکشی کے ساتھ شعریت میں سموتے ہیں کہ قاری کا ذہن بغیر کسی قسم کا بار محسوس کیے ایک خاص لذت حاصل کرتا ہے جو اپنی جگہ لطیف، پاک اور منزہ ہوتی ہے۔ چند مختلف حالتوں کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

حورانِ بہشت کی تمنا بے سود — ہنگامِ شباب زہد و تقویٰ بے سود

لبریز نشاط ہے چمنستانِ بہار — یادِ غمِ دوش و فکرِ فردا بے سود

نیرنگ طلسمِ زندگی کو پایا — آئینۂ غم ہر اک خوشی کو پایا
تسکین ہے تو ذکرِ یزداں میں اثرؔ — سرچشمۂ بےخودی اسی کو پایا

گل چوم کے واہ واہ کی ہے میں نے — کانٹا چبھنے پہ آہ کی ہے میں نے
رویا ہنس ہنس کے اور ہنسا رو رو کر — یوں چشمِ شبِ سیاہ کی ہے میں نے

ہنگامۂ رنج و جاں ہے حق کی ہستی — سیلِ یمِ بیکراں ہے حق کی ہستی
گو تلخ تریں ہے حق کی مے اے ہمدم — خوش باش کہ جاوداں ہے حق کی ہستی

اے حاملِ دہر! تجھ کو حاصل کی تلاش! — اے بر لبِ ساحل! تجھے ساحل کی تلاش!
تو خضر بھی، منزل بھی، رہِ منزل بھی — رہبر کی تلاش کر نہ منزل کی تلاش!

ہنگامۂ فصلِ گل ہے ہنگامۂ رنگ — ہے بربطِ رنگ سے رواں نغمۂ رنگ
مے خانۂ رنگ ہے گلستانِ جہاں — گل ساغرِ رنگ ہے صبا بادۂ رنگ

رباعی سے اثر صاحب کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ خیام کے ترجمہ کا اسی کے رنگ میں ڈوب کر اگر کسی اُردو شاعر کو حق پہنچتا ہے تو اثر صاحب کو۔

خدا کی باتیں :- مرتبہ سحبان الہند حافظ احمد سعید صاحب، ناشر دینی بکڈپو بیت السعید کوچہ [illegible] دہلی سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲؍ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

اس کا اصل نام تو الہدیۃ السنیۃ ہے لیکن عوام کی رعایت سے ’خدا کی باتیں‘ رکھا گیا ہے۔ کتاب کے مؤلف یا مترجم یا ناقل حضرت سحبان الہند حافظ احمد سعید صاحب ہیں جن کی شخصیت اس کتاب کے تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی ضروری گزارش پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آپ کو حسن اتفاق سے ایک کتاب [illegible] مل گئی اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی ہاتھ آگیا۔ کتاب خلیو کس کی ہے؟ گزارش کے الفاظ پر [illegible] صاحب کی تالیف ہے۔

[illegible] کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جو بات ایک بار [illegible]

حضرت سحبان الہند جو خیر سے حافظ بھی ہیں۔ گزارش (ب) میں علی حسن خاں کو حسن علی خان بول گئے ہیں اور تالیف کو تصنیف فرما رہے ہیں۔ افادہ خاص و عام کی غرض سے آپ کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہ تھی کہ یہ حسن علی یا علی حسن کون بزرگ تھے، ورنہ اگر آپ نواب حسام الدولہ صفی الملک ابو النصر میر علی حسن خاں صاحب کو نہ جانتے ہوتے تو بھی کتاب حظیرۃ القدس کے ٹائیٹل کو دیکھ کر آپ پہچان سکتے تھے کہ یہ نواب سید صدیق حسن مرحوم کے خلف الصدق تھے۔ اگرچہ اس کتاب کے متعلق آپ معترف ہیں کہ محنت سے مرتب کی گئی اور احادیث صحیحہ پر مشتمل ہے لیکن آپ نے ساری کتاب میں کہیں اپنے اس ماخذ کا حوالہ نہیں دیا اور نہ اس کے ترجمہ کا۔ اور نہ یہ بتایا کہ آپ نے اور کس قدر اور کون کون صحیح احادیث کا اس کتاب پر اضافہ فرمایا۔

خدا کی باتیں صرف حظیرۃ القدس ہی سے نہیں لی گئیں بلکہ آپ نے لکھا ہے کہ (علامہ مدنی کی کتاب الاتحاف السنیہ اور علامہ عبد الرؤف مناوی کی اس کی تلخیص زیر مطالعہ رہی) حیرت ہے کہ ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کا حوالہ کسی حدیث کے ترجمہ کے بعد نہیں دیا گیا کہ معلوم ہو جاتا کہ حظیرہ پر علامہ مدنی کا یہ اضافہ ہے، دھوکا ہو سکتا تھا کہ کہیں اس سے یہ مطلب تو نہیں کہ اصل کتب حدیث سے احادیث جمع کی گئیں ہیں لیکن مولانا نے خود تصریح کی ہے کہ عظیم گڈھ جیل میں بحالت قید محض رہتے ہوئے یہ کام ختم کر دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا نے تتبع احادیث کی زحمت گوارا نہ فرمائی اور تلخیص و ترجمہ حظیرہ سے یہ کتاب مرتب فرما دی۔ کاش ہمیں یہ موقع ملتا کہ ابو الشیخ ابن عدی ابن النجار ابن شاہین محمد بن نصر ابو علی کی کتابوں کا پتا آپ سے پوچھ سکتے احادیث قدسیہ کی تحقیق کے متعلق ہم آئندہ فرصت میں اظہار خیال کریں گے اس وقت زیر نظر کتاب "خدا کی باتیں" کے متعلق یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ (۱) جن مخرجین حدیث (ابو الشیخ و دیلمی وغیرہ) کی احادیث لکھی گئیں ان کی تصحیح کیے بغیر ترجمہ مناسب نہ تھا۔ جھوٹی بات عربی زبان میں ہو تو بھی جھوٹی ہے اور ترجمہ ہو کر اردو میں آ گئی تو بھی جھوٹی رہے گی۔ (۲) ان احادیث کے ترجمہ میں احتیاط و تشریح کی ضرورت تھی جنھیں سلف نے متشابہات قرار دیا ہے مثلاً احادیث قدم و ساق، کیا جنت کی کنجی اور دوزخ کے کھٹکے کے مصنف ہوتے ہوئے آپ پسند فرمائیں گے کہ عوام یہ سمجھیں (جن کو سمجھانے کے لیے آپ نے یہ کتاب لکھی ہے) کہ جس اللہ کی جنت کی ترغیب دی جاتی ہے اور جس کی دوزخ سے ڈرایا جاتا ہے وہ خود دوزخ میں قدم رنجہ کرے گا

اور قیامت میں رقی اپنی پنڈلی کھولدیگا۔ آپ کی یہ تاویل کہ پاؤں رکھنے سے مطلب یہ ہو کہ دبا دیا جائیگا کہ سمٹ کر دوزخ چھوٹی ہوجائے اول تو کسی صحیح حدیث سے ماخوذ نہیں۔ پھر اللہ کے پاؤں کو دوزخ سے نجات کہاں ملی۔ اسی طرح آپ کی یہ تاویل کہ پنڈلی کھولے جانے سے مراد درمیانی درجہ کی تجلی ہو کسی صحیح حدیث سے ماخوذ نہیں۔ کشف ساق کی تشریح آپ مفردات راغب میں دیکھ سکتے ہیں (۳) غیرمستند کتب حدیث سے روائتیں نہ لینا چاہیے تھیں مثلا صفحہ ۱۸۱ پر پھر صفحہ ۱۸۵ پر ابن شیخ سے دو قسم کے مرغوں کا حال لکھنا عبث تھا اس حدیث کی سند تو دیکھیے۔ اسی طرح عقل کے متعلق حدیث کا حال ہو۔ کہ ابن جوزی (دیکھیے العلل المتناہیہ) اور دوسرے علما کی تصریحات کے مطابق اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ اسی طرح صفحہ ۲۱۰ پر جو حدیث ہو اس کی صحت کا پتا نہیں (۴) بعض طویل احادیث کو مختصر کیا ہو لیکن بہتر یہ تھا کہ انھیں نہ لکھا جاتا کیونکہ طویل احادیث کے متعلق علما نے بہت کم کے حافظہ پر بھروسہ کرنے کا موقع پایا ہو۔ بہرحال اس کتاب کے چھپ جانے سے یہ فائدہ تو ہوا کہ حضرت نواب صفی الملک حسام الدولہ کی کوشش دوبارہ اردو میں آگئی اور ساتھ ہی ساتھ تلخیص الاتحاف کا اردو میں ترجمہ ہوگیا۔ ناقدین کے لیے فکر و نظر کا موقع ہو۔ اللہ اس کتاب کے معاونین کو جزائے خیر دے۔

(ی۔م۔ر)

بیٹے :۔ مترجمہ احسان علی شاہ بی۔ اے (آنرز) ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$، صفحات ۲۹۸ قیمت عہ/ کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ ناول دراصل امریکہ کی مشہور ناولسٹ پرل۔ ایس بک کی مشہور ناول سنز کا ترجمہ ہو۔ دراصل موصوفہ نے چین کی زندگی کے متعلق (جس کا انھوں نے اپنے دوران قیام میں بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا) ایک مشہور ناول لکھی تھی جس کا نام گڈ ارتھ یا دھرتی ماتا ہو اس ناول پر موصوفہ کو نوبل پرائز بھی ملا تھا اور جس کا فلم بھی بن کر بہت مشہور ہوچکا ہو بیٹے دراصل دھرتی ماتا کے لڑکوں کی داستان حیات ہو۔ اس ناول میں چین کی مفلس قحط زدہ زندگی کی چلتی پھرتی تصویر کھینچی گئی ہو۔ ایسی پُرالم بھیانک اور مظلوم ساتھ ہی سچی اور حقایق سے لبریز ہیں کہ بڑا تعجب ہوتا ہو کہ انسانیت کب تک اس روح فرسا غربت اور فلاکت میں پھنسی رہے گی کاش سرمایہ داری ... جنگی قحط اور گرسنگی کا خاتمہ ہو۔

مغل لائن لمیٹڈ

زائرین کعبہ کے لئے مژدہ

مغل لائن نے گذشتہ سال برطانوی اور ہندوستانی بیڑوں اور ہوائی جہازوں کی حفاظت میں زائرین حج کے لئے نہایت اطمینان بخش انتظام کیا تھا۔ نہایت فخر اور مسرت کے ساتھ مغل لائن اعلان کرتی ہے کہ اس نے حکومت سے مشورہ کے بعد امسال بھی حاجیوں کی زیارت کی تمام ممکن سہولتیں اور آسائشیں مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے۔

جنگ کی وجہ سے روانگی کی صحیح تاریخ نہیں دی جا سکتی لیکن حاجیوں کو چاہئے کہ وہ مندرجہ ذیل تاریخوں تک بندرگاہوں پر ضرور پہنچ جائیں۔

وقت مقررہ کے علاوہ پانچ دن کا مزید انتظام رکھیں ممکن ہے کہ کسی وجہ سے دیر ہو جائے

بمبئی	پہلی روانگی	۱۰ نومبر ۱۹۴۱ء	دوسری روانگی	۱۷ نومبر ۱۹۴۱ء
کراچی	"	۱۱ نومبر ۱۹۴۱ء	"	۱۸ نومبر ۱۹۴۱ء
کلکتہ	صرف روانگی	۱۷ نومبر ۱۹۴۱ء		

کرایہ حسب ذیل ہوگا:۔

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ	کلکتہ سے جدہ اور بمبئی کی واپسی
درجہ اول واپسی مع طعام	۴۴۴ روپیہ	۴۱۶ روپیہ	۹۰۰ روپیہ
ڈیک چھت کی واپسی مع طعام	۲۰۲ روپیہ	۱۹۶	۲۳۵ روپیہ ۸ آنے

مندرجہ بالا کرایہ کے علاوہ بندرگاہوں کے ٹیکس وغیرہ کے اخراجات کے سلسلے میں ہر حاجی کو تین روپیہ دس آنے اور دینے ہوں گے۔

مزید تفصیل کے لئے ذیل کے پتہ پر خط وکتابت کیجئے

ٹرنر موریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں
ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے
سامنے خالص چیز پیش کی ہے زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں
ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے افواہات
جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیا کے متعلق بے بنیاد باتیں
ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیا کے فروخت سے فائدہ حاصل
کریں۔ جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت
میں بھی ہمارے تیل عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا
ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض دفعات اس قسم کی آمیزش باعث ضرر ثابت
ہوتی ہے۔

اس لئے
اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی
خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ
چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے)
آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی
خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ

ادبیات اردو میں ایک گرانقدر اضافہ

رسالہ سہیل گیا کا

خاص نمبر ۱۹۴۱ عیسوی

تقریباً ڈھائی سو صفحات پر اگست میں شائع ہو گیا

اس عدیم المثال خاص نمبر میں ملک کے مندرجہ ذیل مشاہیر اہل قلم کے بلند پایہ مقالے۔ جدید معیاری افسانے اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے۔ کیف آور نظمیں اور وجد آفریں غزلیں شریک ہیں۔

سید وصی احمد بلگرامی۔ عطاء اللہ پالوی۔ سید محمود مورخ بی اے۔ جمیل احمد کندھا پوری۔ پروفیسر طاہر رضوی حاجی نبی احمد بریلوی۔ حمید عظیم آبادی۔ سید رضا قاسم مختار۔ طفیل احمد سہارنپوری۔ رضا طباطبائی۔ قمر بشیر گھاٹوی۔ پروفیسر اختر اورینوی۔ پروفیسر محمد محسن۔ ڈاکٹر محمد نصیر الدین۔ بلونت سنگھ۔ مفتی گوہر شادانی تمنائی۔ ش مظفر پوری۔ پروفیسر اختر قادری۔ ایم اسلم۔ پیارے لال شاکر میرٹھی۔ شکیلہ اختر۔ عارف سنہاروی جی۔ آر۔ قیس شیخپوروی۔ شیدا کیوروی۔

آرزو لکھنوی۔ سیماب اکبرآبادی۔ شفق رضوی۔ جمیل مظہری۔ اثر لکھنوی۔ نوح ناروی۔ فراق گورکھپوری۔ عبداللطیف تپش۔ ثاقب کانپوری۔ مبارک عظیم آبادی۔ سریر کابری۔ الطاف مشہدی اعجاز صدیقی اکبرآبادی۔ سلام مچھلی شہری۔ قیصر عثمانی۔ ادیب مالیگانوی۔ ظفر زبیری۔ اختر موہانی۔ رضیہ رعنا۔ وغیرہ۔

خاص نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ لیکن اگر آپ اسے مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی مبلغ تین روپئے سالانہ چندہ ارسال فرما کر اسی نمبر سے سہیل کے مستقل خریدار بن جائیں۔

منیجر رسالہ سہیل گیا

دورِ حاضرہ کی عظیم الشان کتاب

معارف القرآن

یعنی

حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا)، جو اس اصول کے ماتحت مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اور تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ دین (یعنی انسانی فطرت کے لئے ضابطہ زندگی) کے متعلق کوئی سوال آپ کے سامنے آئے اس کے متعلق قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم ایک مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔ یہ

مایۂ ناز کتاب

جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز

کے مدت العمر کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہے

جلد اوّل

چھپ کر تیار ہے۔ جو بڑی تقطیع کے پونے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت۔ جلد اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت مجلد چھ روپیے چار آنے۔ محصولڈاک پندرہ آنے۔ بلا جلد۔ پانچ روپے۔ محصولڈاک ۱۳/

ملنے کا پتہ

۱۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ شمیم منزل شیدی پورہ۔ نئی دہلی

۲۔ ملک رشید الدین صاحب۔ سپرنٹنڈنٹ پنجاب کوآپریٹو یونین۔ لاہور

۳۔ لوئر مال۔ نزد عدالت خفیفہ۔ لاہور۔

اُردو زبان میں ایک نہایت ہی اہم اور عظیم الشان علمی کام

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

یورپ کے نہایت ہی ممتاز، اور بلند پایہ مستشرقین (اور خیشلت علماء) کی ایک بہت بڑی جماعت نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نام سے اسلام کی نہایت ہی اہم اور پر از معلومات انسائیکلوپیڈیا چند جلدوں میں ترتیب دی تھی، جس میں قدیم و جدید معلومات مشرقی و مغربی تصنیفات سے جمع کئے گئے تھے اور مضامین کے آخر میں اس کے آخذ بھی بیان کردئے گئے تھے۔

یہ انسائیکلوپیڈیا بیک وقت یورپ کی تین علمی زبانوں جرمن، فرنچ، اور انگریزی میں ہالینڈ سے شائع ہوئی۔ مغربی فضلاء کے علاوہ مشرق کے بلند پایہ علماء نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور جامعیت و وسعت معلومات کے لحاظ سے بے حد اہم کتاب شمار کی گئی ہے۔

اس میں اسلامی علوم وفنون، اسلامی تمدن، اسلامی سیرت و تاریخ اور اسلامی آثار کا عظیم الشان ذخیرہ ہے۔

انہی خوبیوں کی وجہ سے مصر سے اس کا عربی ترجمہ فضلائے مصر کے ناقدانہ حواشی کے ساتھ ہر دو مہینے پر شائع ہو رہا ہے۔

اردو میں اس نمونے کی کوئی اہم کتاب نہیں تھی، جدید پریس پٹنہ سٹی نے اس کا اردو ترجمہ مزید حواشی و تشریحات کے ساتھ ہر دو مہینے پر سو صفحات کی ضخامت میں ۲۰×۲۶/۸ سائز پر شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔

اس کی بلند علمی منزلت کا تقاضا ہے کہ اصحاب علم اس کی توسیع اشاعت میں پورا حصہ لیں۔

اس علمی سلسلے سے کسی لائبریری اور علمی و ادبی ادارے کو خالی نہ رہنا چاہیے۔ قیمت فی نمبر [illegible]

اور سالانہ قیمت [illegible]

منیجر جدید پریس بیگم پور پٹنہ سٹی

اردو ادب میں ایک نیا اضافہ

نورس

مسعود اختر جمال کی زندگی بخش نظموں کا مجموعہ

آنے والے انقلاب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ زندگی کی نئی قدروں کو پہچانیں ۔ اور اس زمانے میں جب کہ دنیا جنگ کی ہولناکیوں سے زیر و زبر ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں آپ کی مدد کرے گا۔

قیمت فی جلد

بار اوّل — قسم اوّل مجلّد تین روپے (۳)،

ایک ہزار (۱۰۰۰) — " دوم غیر " ایک روپیہ چار آنے (۱؍۴)،

مکتبۂ

ادبستان ۔ پانڈے حویلی ۔ بنارس

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب

"وحی الٰہی"

"وحی الٰہی" ہماری زبان میں پہلی بے مثل محققانہ کتاب ہے جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے سنجیدہ اور دل پذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سماجاتا ہے۔ اس کتاب میں وحی کی لغوی اور شرعی حقیقت، وحی کے اقسام، وحی سے متعلقہ مباحث مثلاً صفاتِ الٰہی خصوصاً صفت کلام۔ ملکۂ نبوت اور استعداد وحی۔ وحی اوّلاً کس طرح نازل ہوئی اور آخر تک کن کن طریقوں سے نازل ہوتی رہی۔ قرآن نے اپنے وحی ہونے کے کیا کیا دلائل بیان کئے۔ وحی کی حقیقت جدید فلاسفۂ مغرب کے نزدیک ان سب عنوانوں پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں اعجاز قرآن پر بالکل جدید طرز سے گفتگو کی گئی ہے جس میں وجوہ اعجاز کی تنقیح کرکے ہر وجہ اعجاز پر بصیرت کی پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ وحی الٰہی کے سلسلہ میں جس قدر عقلی اور نقلی شکوک و شبہات کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ان کا کلی طور پر ازالہ ہوسکتا ہے اور طالب حق کے لئے ہدایت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ ترتیب کی دلنشینی اور انداز بیان کی شگفتگی کے لئے مولانا سعید احمد مدیر برہان کا نام نامی کافی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب اس کتاب کا خاص طور پر مطالعہ فرمائیں۔ وحی جیسے نازک اور الجھے ہوئے مسئلہ کا حل اس سے بہتر شکل میں کہیں نہیں ملے گا۔ کتابت طباعت نہایت اعلیٰ

اصلی قیمت غیر مجلد ۲؎، مجلد ۳؎

رعایتی " " ۲؎، " ۲؎

پتہ

مکتبہ برہان۔ قرول باغ۔ نئی دہلی

سیاسی کتابیں

مبادی سیاسیات — مصنفہ پروفیسر محمد ہارون خاں شیروانی۔ ایم اے (آکسن) ہمارے ملک میں اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی کسی سیاسی مسئلہ پر زیادہ دیر تک جذبات سے الگ ہوکر علمی گفتگو نہیں کر سکتے اس کی وجہ یہی کہ خود ہماری زبان میں علم سیاست پر اچھی کتابوں کا فقدان ہے۔
مبادی سیاسیات اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں ذرا تفصیل سے علم سیاست کی ابتدائی معلومات پیش کی گئی ہیں اور عہد حاضر کی سیاسی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ قیمت۔ مجلد ہے

خلافت و سلطنت — مولفہ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی پی ایچ ڈی۔ مصنف نے ان واقعات کو جو خلافت اور سلطنت کے سیاسی اور مذہبی تعلقات و روابط کے نتیجے میں بڑی تلاش سے مرتب کیا ہے۔ ایک طرح یہ کتاب ایشیا کی اسلامی سلطنتوں کی تاریخ بھی ہے۔ قیمت ہے

نظام سلطنت — مولفہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ اس میں مذہب، تمدن، اخلاق و معاشرت اور قوانین سلطنت پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت ہے

بین الاقوامی سیاسی معلومات — دنیا کی سیاسیات سے متعلق افراد و اقوام، ممالک، مقامات اور معاہدات و اصطلاحات کی یادداشت۔ قیمت ہے

سوشلزم کی بنیادی حقیقت — مترجمہ سید محی الدین شمسی ایم اے۔ اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی وہ آٹھ تقریریں جنھیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے کتاب کے شروع میں سوشلزم کے حالات اور اس کی موجودہ رفتار ترقی پر مترجم نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت ہے

سوشلزم — یہ کتاب بانی اشتراکیت کارل مارکس کے دست راست فریڈرک اینگلز کی وہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جس میں اشتراکیت کے ہر پہلو کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۱ر

آغاز کیسے ہوا؟ — لینن کا شاہکار۔ اس میں مصنف نے قومی اور سوشلسٹ کارکنوں کے فیصلہ الیسی

ہدایات درج کی ہیں جن کا مطالعہ نوجوانوں کے لئے ضروری ہے۔ قیمت ۶ر

شہنشاہیت یہ کتاب دراصل جدید سرمایہ داری کی مکمل تاریخ ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ بالخصوص یورپ کے ملکوں میں سرمایہ داروں کی محدود جماعت نے حکومت پر قبضہ کرکے بنی نوع کو کس طرح غلام بنایا۔ قیمت مجلد ۱۲ر

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا۔ اس مختصر سے رسالے میں یہ بتایا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ ہم مسلمان ہیں تو کیسے؟ ہمارا ماضی کیا تھا؟ حال کیسا ہے۔ اور آئندہ کیا تبدیلیاں ممکن ہیں۔ قیمت ۳ر

ہندوستان کی اقتصادی تاریخ مصنفہ خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی۔ مصنف نے اپنے خاص ادیبانہ رنگ میں ہندوستان کی اقتصادی پالیسی سے بحث کی ہے۔ قیمت ۶ر

کسان تحریک اس میں اس تباہ حال طبقہ کی حالت کا ذکر ہے جن پر ہندوستانیوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس کے تین حصے ہیں پہلے میں کسانوں کے عام مسائل سے بحث ہے دوسرے میں برطانوی سامراج اور کسان کے تعلقات ہیں اور تیسرے میں قومی تحریک اور کسان سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۸ر

انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ اس پمفلٹ میں عوام کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خود کیسے اپنی تحریک چلا سکتے ہیں اور ملوں، کارخانوں، کھیتوں، شہروں اور دیہاتوں میں اپنی تنظیم اور اتحاد کے زور سے دشمنوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ قیمت ۱ر

معاملہ زمین از برج نرائن صاحب ایم۔ اے پروفیسر اقتصادیات۔ ۱۸ ابواب میں زمین کھیتی بندوبست، انکم ٹیکس وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۶ر

مکتبہ جامعہ قرول باغ، نئی دہلی

تاریخ و سوانح

تاریخ سلطنت خداداد | میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اس کے جانشین ٹیپو سلطانہ کی مکمل تاریخ۔ یہ ایک طرف مواد و دلائل اور دوسری طرف جوش عقیدت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ قیمت للعہ

تاریخ جنوبی ہند | یہ جنوبی ہند کی تاریخ ہے۔ مصنف نے بڑی چھان بین سے تمام داخلی پر خارجی اسناد مرتب کئے ہیں۔ قیمت سے

داستان غدر | حضرت ظہیر دہلوی۔ شاگرد رشید حضرت ذوق نے غدر دہلی کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ آج وہ قصے اور کہانیاں ہیں مگر کچھ ایسے دردناک ہیں کہ دل ہل جاتے ہیں۔ قیمت عم

مرآت مصطفےٰ آباد | قدیم زمانے میں کچھ سے لے کر کوکن تک ایک ہی زبان اس سارے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ مگر بعد میں سیاسی انقلابات کے باعث یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ایک کا نام گجرات اور دوسرے کا سوراشٹ یہ سوراشٹ یا جوناگڑھ (مصطفےٰ آباد) کی تاریخ ہے۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{4}$ کاغذ، لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ قیمت مجلد نو روپئے دلعہ

مرآت محمدی | مصنفہ شیخ غلام محمد کی مکمل اسلامی تاریخ، ۲۰۰ صفحات بڑی تقطیع۔ قیمت دو روپئے آٹھ آنے عہ

تذکرہ کاملان رامپور | مولفہ حافظ علی خاں شوق اس میں تقریباً دو سو بزرگان رام پور کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ قیمت سے

انقلاب ۱۸۵۷ء | اس میں ۱۸۵۷ء کے اس درد انگیز ناکام انقلاب کی تاریخ ہے جو درس عبرت کا ایک سبق آموز باب ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ قیمت عم

سفرنامہ اسیر مالٹا | مولینا محمود الحسن صاحب شیخ الہند کے حجاز، مصر، مالٹا کے سفر کے حالات مرتبہ مولینا حسین احمد صاحب مدنی۔ قیمت عم

شہیدان حریت | اس کتاب میں سعد زغلول پاشا، غازی عبدالکریم، جمال الدین افغانی

بیسیوں فدایان ملت کے حالات زندگی درج ہیں۔ قیمت ۱۲؍

سلطانی محلوں کا راز | مترجمہ عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی۔ سلطان عبدالعزیز شہنشاہ ترکی کے حالات۔ قیمت ۱۲؍

سوانح حیات | آزاد، سرسید، حالی، شبلی وغیرہ کی سوانح عمریاں اور ان کی خصوصیات کمال پر ایک نظر۔ قیمت ۱۲؍

سوانح برادران باربروسہ | برادران باربروسہ کے حالات زندگی، اس عہد کے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی زندگی کا مرقع۔ قیمت ۸؍

مشاہیر اسلام | صوفیائے کرام علمائے عظام شہدائے ملت اور مجاہدین و سلاطین کے حالات زندگی۔ قیمت اول ۸؍ دوم ۸؍

حیدر علی | میسور کے اسلامی عہد کی ایک حسین و جمیل داستان جس میں عشق و محبت کے حیرت انگیز واقعات کو تاریخی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنفہ محمود خاں۔ قیمت ۸؍

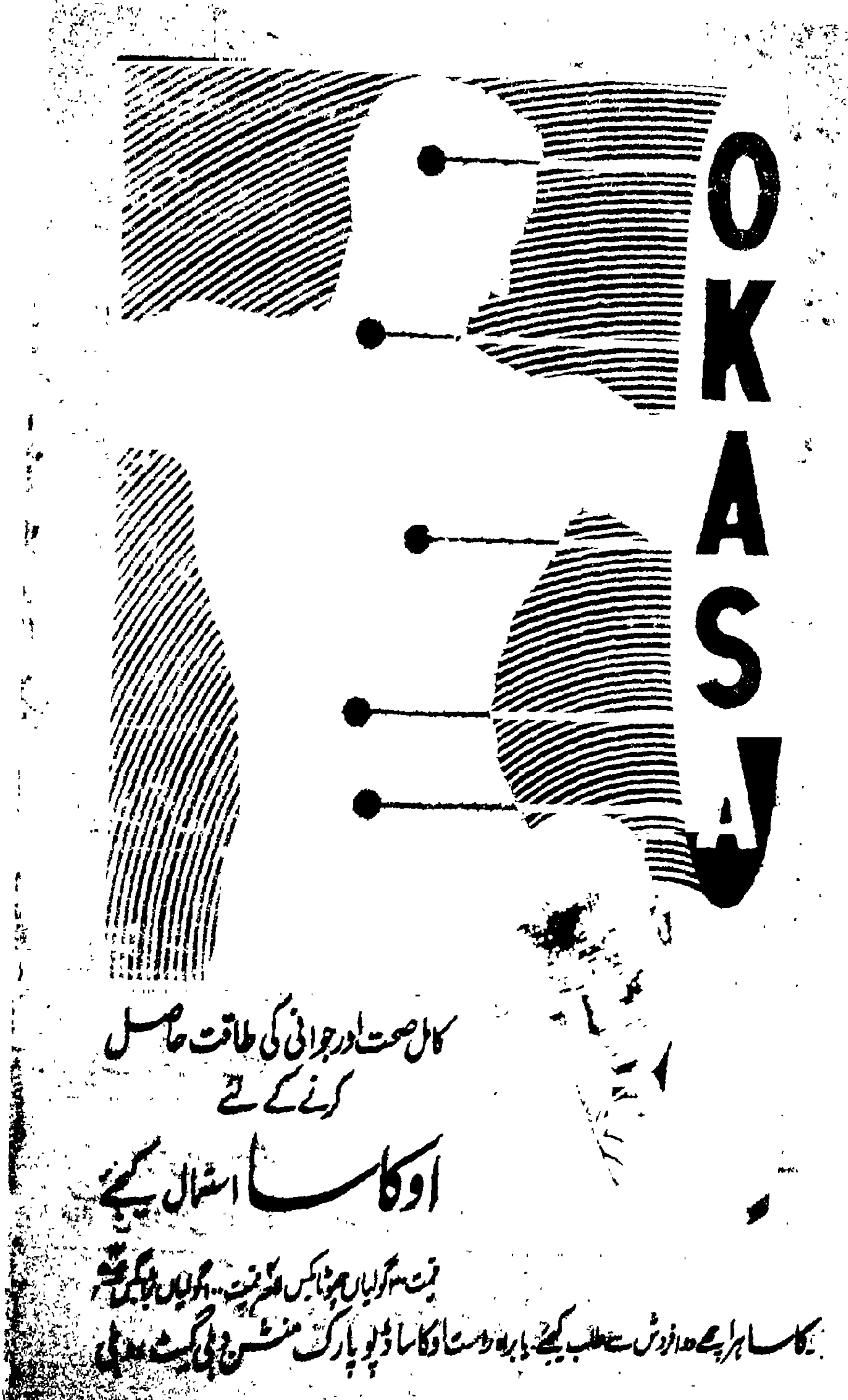
حیات اجمل | حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات ہے۔ جس میں مرحوم کے اخلاق و عادات، علمی و طبی حالات، مطب اور سفروں کے واقعات درج ہیں۔ قیمت ۱۲؍

حیات وارث | از مرزا ابراہیم بیگ صاحب شیدا وارثی اس میں حضرت حاجی حافظ سید وارث علی شاہ کے ممتاز کمالات مقدس واقعات اور مفید ہدایات و ارشادات درج ہیں حجم ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد ۲؍

حیات حافظ رحمت خاں | اس میں روہیل کھنڈ کے مدبر حکمراں حافظ رحمت علی خاں کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ ان کی خدا ترسی، پاک بازی، دوست نوازی، عالی ہمتی ایثار اور علم دوستی کے مخصوص واقعات لکھے ہیں۔ قیمت ۱۲؍

حالات علی برادران | مولانا محمد علی اور مولینا شوکت علی کے زندگی کے حالات۔ قیمت ۸؍

مکتبہ جامعہ قرولباغ۔ نئی دہلی


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک منشن دہلی گیٹ دہلی

جامعہ

زیرادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم، اے

| جلد ۳۵ - نمبر ۶ | بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ [illegible] فی پرچہ آٹھ آنہ |

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

تعلیمی بجٹ

(اس بجٹ کا ایوان فرضی۔ اس کے افراد فرضی اور اس کا نفس مضمون بھی فرضی ہے)

آج تعلیمی بجٹ کا دن تھا اور کل سے آنریبل منسٹر کو بے حد مصروفیت رہی تھی۔ ان کے پاس کئی ایک محکمے تھے۔ ان کے سرخاب کے پر تو اور تھے لیکن تعلیم تو ان کے کلاہ وزارت میں ایک مرغی کے پر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اور مرغی بھی کوّاک مرغی!

کل شام کو انھوں نے فائلوں کے نیچے سے تعلیم کے کاغذات نکالے تو ان پر اچھی خاصی گرد جمی ہوئی تھی۔ انھیں دفتری پر تاؤ تو بہت آیا مگر پھر سوچ کر رک گئے تھے اور جب انھوں نے فائل کھولی ہے تو ایک جھینگر زقند بھر کر زن سے ان کی ناک کے پاس سے گزر گیا تھا۔ اس کمبخت کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ وہ کیسی باوقار ناک کے پاس سے ہو کر گزرا تھا کیسی باوقار اور کیسی حساس!

ان کے پاس وقت کم تھا بہت کم۔ درختوں کے سایے ان کے ٹینس میدان پر لمبے ہو چلے تھے اور ابھی تک وہ اپنے تعلیمی سکریٹری کو شرف باریابی نہ بخش سکے تھے۔ اتنے میں انھیں نیچے سے چینی کے برتن کھنکنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی انھیں یاد آیا کہ انھوں نے آج چند سوشیل قسم کے دوستوں کو چائے پر بلایا ہے۔ انھوں نے فوراً سکریٹری کو اندر بلا لیا تھا اس دوران میں بھی ان کی نگاہیں بار بار کھڑکی کے پار جا رہی تھیں ابھی تعلیمی بجٹ کے مباحث پر سرسری سا تبصرہ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی نگاہ کھڑکی سے باہر میدان پر گئی اور انھوں نے دیکھا کہ سبز گاہی لان سے پرے کوٹھی کی افق پر ایک قوس قزح کے رنگوں والی ساڑی نمودار ہو چکی تھی۔ اس پر انھوں نے جلد جلد سکریٹری کو رخصت کر دیا تھا۔

آج تعلیمی بجٹ کا دن تھا اور آنریبل منسٹر اس میدان کے پرانے شہ سوار تھے اس موسم کے بجٹ کی بہت سی ٹٹیاں تو وہ صاف پھلانگ چکے تھے اب تو محض اس کی دم باقی رہ گئی تھی بجٹ کیا تھے اچھے خاصے جنگی قسم کے بیڑے تھے جنھیں جیو لگا نا اور پار کرنا آنریبل منسٹر کا ہی کام

تھا۔ اور تفصیلی بجٹ وتعلیمی بجٹ کا کاغذ کی وہ ناؤ تھا جسے اگر وہ ایک بار اپنی گھنی مونچھیں لبوں سے اٹھا کر پھونک ہی دیتے تو آنا فانا میں پار کیا ہوا کی لہروں پر ہچکولے لینے لگتی۔

مگر اس مرتبہ ان کی خود اعتمادی کچھ ڈانوا ڈول سی ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ اس بجٹ پر مہتہ جی نے کٹوتی کی ایک تحریک پیش کر دی تھی!

اس کے جواب کی تیاری کے لیے انھوں نے کل شام کو اپنے سکرٹری کو بلایا تھا۔ سکرٹری صاحب نے اس سے پہلے ایک دن اپنے پرسنل اسسٹنٹ کو اور اس نے اپنے نائب کو اور اس نے اپنے کلرک کو بلایا تھا۔ مال گاڑی کے انجن کی طرح انھوں نے ایک ریلا جو پیچھے کو دیا تو اس کی دھمک گاڑی بہ گاڑی اور وہ بہ روک آخری ڈبہ تک پہنچی تھی یہ آخری ڈبہ ان کا جونیر کلرک تھا۔ یہ ڈبہ ان جنادری گاڑیوں اور دیوار کے بیچ میں پس کے رہ گیا تھا۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ ان کے درمیان کیوں آیا۔ کیا اسے پتا نہ تھا کہ یہ بھنجائی اور پائی تو سب سے کمزور کی قسمت میں ہی لکھی ہے۔

ان کا تیار کیا ہوا جواب محض جواب نہ تھا اس کے ہر جملے اور ہر لفظ کے پس منظر میں ایک کارواں تھا جس میں قطار اندر قطار منشی، اسسٹنٹ، سپرنٹنڈنٹ ایک ہی رسی اور ایک ہی نکیل میں پروئے ہوئے تھے۔ اس نکیل کا سرا آنریبل منسٹر کے ہاتھ میں تھا اور اس رسی سے اس پورے بے زبان گروہ کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ اگر اس جواب کا کوئی حرف قابل اعتراض قرار دیا گیا تو اس پورے گروہ کی جان ایک پھوڑے کی طرح ٹیسیں لینے لگے گی۔

غرضکہ یہ تقریر کلرک بہ کلرک ہوتی ہوئی سینہ بہ سینہ نہیں، قلم بہ قلم آخر کار کلرکوں کے میکائیل یعنی ایوان کے کلرک کے پاس پہنچی لیکن حتمی ذمہ داری اسی کمزور اور جھرجھری اینٹ پر ہے جس پر اس قصر استعماریت کا توازن ٹکا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ دفتری حکومت کے طلسم کو ایجاد کرتے وقت کسی منچلے نے ستم ظریفی یہ کی تھی کہ اس کی بنیاد اچھے خاصے نٹ گری کے تماشے پر رکھدی تھی اور حساب اس طلسم کا یہ تھا کہ اگر سب سے اوپر کا نٹ ذمہ داری کے نردبان سے پھسل جائے تو وہ اپنے ماتحت کے عین شانوں اور پشت

پر جاکر ٹکتا تھا۔ اس سے ایک تو چوٹ کم لگتی تھی اور دوسرے اس تحریک سے وہ ماتحت اپنے نچلے ماتحت پر اسی شان سے نازل ہوتا تھا۔ قس علیٰ ہذا۔ مگر اس منحوس پن میں کم بختی تو سب سے نچلے ماتحت کی تھی جس کے نیچے سوائے پتھریلی زمین کے اور کچھ نہ تھا اور یہ بے چارہ اکثر چاروں شانے چت جاتا تھا اور چونکہ اوپر کے لوگ مادی لحاظ سے بھی بھاری بھر کم ہوتے تھے اس لئے اکثر اوقات دوبارہ اُٹھنے کی ہمت بھی نہ پڑتی تھی۔

اب اجلاس شروع ہوا۔ اس کا افتتاح مہتہ جی کی تقریر سے ہوا تھا۔ آج ان کی زندگی کا ایک سب سے اہم لمحہ تھا اور جب وہ اٹھے ہیں تو انھیں احساس تھا کہ ایک زمانہ کی نگاہیں ان پر اُٹھ رہی ہیں اور خاص طور سے وہ نگاہیں جو لیڈیز گیلری سے ان پر اٹھ رہی تھیں یہ تیز تیز نگاہیں ان کے رخساروں پر چبھتی ہوئی انیاں سی معلوم دے رہی تھیں۔ انھیں نگاہوں کے لیے انھوں نے خون پسینہ بہا کے یہ تقریر تیار کرائی تھی۔ اور پھر کل پریس میں ان کے الفاظ جلی حروف میں! ان کا نام عوام کی زبان پر! ان کی آواز ان کے کانوں میں گونج رہی ہوگی! آج دنیا کو پتا لگ جائے گا کہ ان میں کیا جوہر چھپے ہیں۔

مہتہ جی کی تقریر شروع ہوئی:۔

"جناب صدر! میں آپ کی توجہ اس خوفناک بے علمی اور جہالت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ہمارے عوام پر مسلط ہو۔ اگرچہ ہم آج اس ایوان میں ایک روشن خیال گروہ کے مابین ہیں مگر ماحول کی تاریکی کے مقابلے میں یہ گروہ ایک ٹمٹاتی ہوئی شمع سے زیادہ نہیں اور جناب صدر! یہ تاریکی کم نہیں ہو رہی۔ کسی جانب سے ہمیں امید اور آس کا اجالا ابھرتا نظر نہیں آرہا۔ یہ تاریکی کم نہیں بلکہ جیسا اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہو زیادہ ہو رہی ہو۔ اس کے سایے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اس کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی ہو اور ہمیں ڈر ہو کہ یہ تاریکی کہیں مدھم روشنی کے اس دائرے کو جس میں تعلیم یافتہ طبقہ اطمینان سے بیٹھا ہو ایک دن مٹا جائے۔ اس محفوظ اور خوبصورت جزیرے پر جس میں اونچے طبقوں نے اپنا زمینی بہشت بنا لیا ہو برابر مد کی لہریں چڑھتی جا رہی ہیں ہمیں دیکھنا ہو کہ کسی دن مہلک لہر کا وہ تھپیڑا آئے گا جو ایک مرتبہ

پھر اسے سطح آب کے برابر کر دے گا اور بے علمی کا سمندر پھر ایک دفعہ اپنی اس امانت کو واپس لے گا جو ہم نے صدیوں کی محنت اور خلوص سے اس کے سینے سے چھین لی تھی۔

"جناب صدر! ہماری دیہی آبادی کا یکسر بے علم رہ جانا ایک قومی المیہ ہے اور قوم کے اعضا میں سے ایک اہم عضو کا مفلوج ہو جانا وہ عضو جس سے کہ نظام ملی میں نئے خون کی تولید ہوتی ہے جو قوموں کی قسمت میں نئے امکانات پیدا کرتا ہے جس سے کہ زندگی کی نئی سوتیں پھوٹتی ہیں جو غیر ملوث سیدھے سادے قوا کا منبع ہے وہ قوا جو ایک طوفان کی طرح زوردار اور ایک دریا کی طرح بہاؤ رکھتے ہیں جب روس یا ٹرکی نے ان خوابیدہ قوا کو تعلیم کے ذریعہ بیدار کر دیا تو انھوں نے ملک بھر کو ایک نئے برق صفت ولولے، ایک نئی زندگی سے بیتاب کر دیا۔

"اگر میں آپ کے سامنے اعداد و شمار پیش کروں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ ہم زندگی کی دوڑ میں کس قدر مغربی ممالک سے پیچھے رہ گئے ہیں اور یہ دوڑ جو ہم دوڑ رہے ہیں اس میں سب سے کمزور اور سب سے زیادہ قابل رحم ساتھی ہمارا کسان ہے۔ آج اس بجٹ کے موقعہ پر میں نے مناسب سمجھا کہ حکومت کی توجہ وقت کے اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرائی جائے۔"

مہتہ جی اپنی تقریر ختم کر چکے تھے اور ان کی تقریر سے ایوان میں سنسنی سی پھیل گئی تھی ان کی تقریر روایات کے مطابق نہ تھی اس تقریر میں جذباتی عنصر نمایاں تھا اور ان کے الفاظ میں وہ توازن اور پر وقار احتیاط نہ تھی جو ایک رکن کے شایان شان ہے۔ یہاں کے کارگر ہتھیار دو ہی تھے ایک گرمی گفتار اور دوسری نرمی رفتار۔ گرمی گفتار ہو چکی تو نرمی رفتار کی باری آئی

اب آنریبل فنسٹر میدان میں آئے۔ ان کی تقریر میں وہ خود اعتمادی اور مربیانہ انداز موجود تھا جو ایک چھ فیٹ کے قد آور ویسٹ اینڈ کے بہترین سلے ہوئے سوٹ سے اٹھتا ہے اور دل و دماغ دونوں پر چھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دل خوش مزاح کا ترشح بھی ان کی تقریر میں موجود تھا۔ ان کا مرتبہ بہت بلند تھا وہ عہدہ اور سماجی لحاظ سے بہت اونچے تھے اس لیے وہ ہر ممبر کے ساتھ بعینہ اسی طرح سلوک کر سکتے تھے جیسے چھوٹے بچے خوبصورت پلوں کے ساتھ کرتے ہیں، پہلے تو چمکارتے ہیں پچکارتے ہیں

اور جب وہ خوشی میں خرخرانے اور دم ہلانے لگتے ہیں تو آہستہ سے ایک چپت سر پہ لگا دیتے ہیں مگر چپت بھی مربیانہ انداز میں ہی لگاتے ہیں کچھ ایسا ہی انداز ان کی آج کی تقریر میں بھی پایا جاتا تھا۔

مجھے آج فخر ہے کہ میں مہتہ جی کی تقریر کا جواب دے رہا ہوں مہتہ جی ہمارے پرانے کرم فرما ہیں اور ان سے تو ہماری چھیڑ برابر چلتی رہتی ہے اکثر اوقات ان کے سوالات سے جواب دیتے ہوئے مجھے پسینہ چھوٹ چھوٹ گیا ہے (اس جملہ پر مہتہ جی نے اپنے پاؤں ذرا پھیلا کر جائے اور ان کی نگاہیں غیر شعوری انداز میں لیڈیز گیلری کی طرف جھکیں) مہتہ جی کی تقریر خود فصاحت کا ایک بہتا ہوا دریا اور معلومات کا ذخیرہ ہے جملہ معترضہ معاف فرمایئے گا انھوں نے کرنل جعفر حسن کے اقتباسات میں سے کچھ پڑھا مجھے اس موقعہ پر جعفر حسن صاحب کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنا ہے جس دن سے محکمہ تعلیم نے ان کی خدمات شاہی رسالہ سے مستعار لیں اسی دن سے انھوں نے محکمہ کو ایسے شاندار فوجی نظام سے چلایا ہے کہ ہمارا محکمہ خوش انتظامی اور ضبط کے لیے ضرب المثل بن گیا ہے (اس قصیدہ خوانی میں پندرہ منٹ صرف ہوئے)

"اب میں موضوع بحث کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ حضرات! قابل مقرر نے فرمایا کہ فلاں ملک میں یہ ہوا فلاں میں وہ ہوا اور اس کے بعد یہ ہندوستان میں کیوں نہیں ہوا؟ جناب صدر! میں پوچھتا ہوں کہ میرے ہاں لڑکا ہوا فلاں صاحب کے ہاں بچہ ہوا آپ کے ہاں کیوں نہیں ہوا! ایسی جسارت آنریبل منسٹر ہی کر سکتے تھے، میرے ہاں آج شہزادہ ہوا آپ کے ہاں کیوں نہیں ہوا یہ کوئی منطقیانہ دلیل نہیں ہے۔ جناب صدر! اگر نہیں ہوا تو اس نہ ہونے کی ذمہ داری ہم پر نہیں یہ ذمہ داری لوکل باڈیز پر ہے۔ یہ ذمہ داری ڈسٹرکٹ بورڈ پر ہے یہ ذمہ داری مقامی احباب پر ہے۔ حضرات! اگر آپ پچھلے بجٹ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ لگ جائے گا کہ ہم لوگ تعلیم پر پہلے سے کتنا زیادہ خرچ کر رہے ہیں ہمارا ابتدائی تعلیم پر ہی خرچ آگے سے تگنا ہو گیا ہے"

ایک ممبر: کیا میں آنریبل منسٹر سے دریافت کر سکتا ہوں کہ تعداد خواندگان بھی پہلے سے تگنی ہو گئی ہے یا نہیں؟

آنریبل منسٹر: (تمکنت آمیز مسکراہٹ سے اوپر کا لب چڑھا کر) جناب صدر! میں تعلیم اور کلچر کے معاملہ میں

مادی اقدار اور ناپ تول کا قائل نہیں ہوں قوموں کی زندگیاں ترازو سے نہیں تولی جاتیں اور نہ ہی ان کی ترقی آنے پائیوں سے محسوب ہو سکتی ہے (اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) مگر جناب صدر! ابھی تو مجھے ان اہم مشکلات کا ذکر کرنا ہے جو تعلیم عوام کے راستے میں حائل ہیں (اس جملہ کو ادا کرتے ہوئے ان کے چہرے پر ہلکے رنج اور فکر کی بدلی سی چھا گئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس گراں بار بوجھ کے احساس سے دبے جا رہے ہیں (اس بوجھ کا اثر ان کی آواز پر بھی معلوم ہوتا تھا) ان میں سب سے بڑی اور سب سے اہم مشکل عورتوں کی کمی ہے (یہاں اُن کی مراد استانیوں سے تھی) کیونکہ اگر عورتوں کی کمی ہوتی تو بچوں کی زیادتی کا سد باب ہو جاتا اور تعلیم عوام کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اتنا شکر ہے کہ آنریبل منسٹر نے یہ نہیں کہدیا کہ ملک کو آج تک پڑھایا ہی استانیوں نے ہے۔ اس معاملہ میں ان سے کوئی چوک تو ہوئی نہیں تھی۔ انھوں نے پہلے سے اپنے اسسٹنٹ کو ایسا تاریخی مواد مہیا کرنے کو کہا تھا جس سے یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتا کہ ایک زمانے میں یہاں صرف عورتیں ہی عورتیں استادتھیں لیکن ان دنوں اس غریب کو گھر پر اتنے پردہ لگر سننے پڑے کہ یہ کام پورا نہ ہو سکا اور پھر جناب صدر! اکثر بچے تعلیم پوری ہونے سے پہلے ہی مدرسہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور ہر سو میں سے صرف ۸ ابچے چوتھی جماعت تک پہنچ پاتے ہیں۔

ایک ممبر "جناب صدر! کیا استادوں کے لیے ایکٹ اسلحہ نہیں ہے۔ اور کیا ڈنڈا قانون کی زد میں نہیں آتا؟"

ایک لبرل ممبر (یہ ممبر آزادی کے اصول کی خاطر ایک دفعہ جیل بھی جا چکے تھے) ہرگز نہیں۔ اگر بچہ کو آزاد اصول پر تعلیم کا حق حاصل ہے تو استاد کو آزاد طریق پر تعلیم دینے کا حق بھی ہے۔

اس کے بعد ایک صاحب پچھلے بنچوں سے کھڑے ہوئے کچھ اکڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی ابتدائی زمانے کا انسان انسانی تجربے میں پہلی مرتبہ پچھلے بنچوں پر توازن قایم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ایوان کے ان بے زبان گروہ میں سے تھے جو دیکھتا ہے مگر بولتا نہیں۔

"جناب صدر! میں کچھ ایسا مقرر تو نہیں ہوں تاہم میرے ذہن میں اس وقت ایک خیال آیا ہے جس کا اظہار ملک و قوم کی بہبودی کے لیے ضروری ہے میرے خیال میں جس نے تعلیم نہیں پائی وہ حیوان ہے

محض حیوان"

اتنے میں ایک سیاسیات کے پروفیسر جو بہت کچھ کھو کر ایوان میں پہنچے تھے ذہنی لحاظ سے نہیں بلکہ مالی لحاظ سے کھو کر، عالمانہ تمکنت سے اوپر کا ہونٹ سکوڑتے ہوئے زیر لب بڑبڑائے۔

آبے گدھے اگر حیوان نہ ہوتے تو تمھارے جیسوں کو انتخاب کر کے یہاں کیوں بھیجتے۔ ہابس! ہابس!! (Hobbes) انسانی ذہنیت کے اس پہلے نباض نے ہی انسان کو سمجھا۔ انسان کو نہیں بلکہ انسان میں جو حیوان ہے اس کو سمجھا اور اصل میں سیاست کی بساط کا اصل مہرہ تو یہی انسانی صورت میں چلتا پھرتا حیوان ہے عوام کی تعلیم! یہ لوگ جو عوام کی تعلیم کا راگ الاپ رہے ہیں انھیں کیا معلوم کہ وہ کس آگ سے کھیل رہے ہیں (خود ہی خود اپنے خیالات سے ایک ققنس کی طرح جوش میں گرماتے ہوئے) تم لوگ نہیں جانتے ہو کہ تم کس آگ کے ساتھ کھیل رہے ہو، یاد رکھو یہ تو ایک بمب ہے لکھا پڑھا بمب اَن پڑھ بمب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اَن پڑھ کا سیفٹی والو محض گھونسلا ہوتا ہے اور لکھے پڑھے کا کچھ پتا نہیں کہاں سے کدھر سے پھٹ پڑے (پروفیسر موصوف اکثر اس قسم کی تقریریں کرتے رہتے تھے جس میں وہ خود ہی صدر خود ہی مقرر اور خود سامع ہوتے تھے)

اس کے بعد مہاراج راجینولا نے تقریر کی یہ ممبر ایوان امرا کے درخشندہ ستارے تھے ان کی شہرت کا سبب ان کے مشہور گھوڑ دوڑ کے گھوڑے تھے جن کی انھوں نے خاص طور پر تربیت کی تھی اس تربیت میں انھوں نے سائنس کی بہترین اور جدید ترین معلومات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ پچھلے سالوں سے نظریۂ ارتقا نے ایوان کے ممبروں میں خاص مقبولیت حاصل کر لی تھی اور ایوان میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ انسانی تربیت کی اسکیم تیار کرتے وقت ان تمام تحقیقات کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے جو علم حیوانیات میں ہوتی رہی ہیں۔ اس رجحان کے سب سے بڑے اور سب سے پرجوش معتقد ہمارے راجہ صاحب تھے۔ جہاں بعض ممبروں کا یہ خیال تھا کہ حیوانی ارتقا کے تجربات کے مفید پہلوؤں کا تجزیہ کر کے انھیں انسانی تربیت کے حل کے لیے استعمال کیا جائے وہاں راجہ صاحب کا شروع میں ایمان یہ تھا کہ انسانی تربیت و تعلیم کو من و عن اسی لائن پر چلایا جائے جس پر کہ ان کے گھوڑوں کی

تربیت کی گئی ہے اور حق تو یہ ہے کہ اگر کسی ہندوستانی کسان کے لیے کھانے پینے رہنے سہنے، دوا دارو کی وہ تمام سہولتیں مہیا کر دی جائیں جو کہ راجہ صاحب کے اصطبل کے ایک پہاڑی ٹٹو کو میسر ہیں تو وہ کسان یقیناً راجہ صاحب سے ذہنی اور علمی لحاظ سے دو چار قدم آگے ہوتا لیکن پچھلے دنوں ان کے خیالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھا لیا تھا۔

راجہ صاحب اس بحث کے لیے اپنے ساتھ ایک ماہر حیوانیات کو بھی لائے تھے۔ جو کہ خاص طور سے اسی موقعہ کے لیے مدعو کئے گئے تھے۔ وہ مہمان گیلری میں موجود تھے۔ اس ماہر فن کا خیال تھا کہ گھوڑے نے اپنی ٹانگوں کی تیزی کش مکش حیات کی جدوجہد میں بڑھا لی ہے۔ انھوں نے ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس سے ارتقا کی اس رو کو جو گھوڑے کی چار ٹانگوں میں چل نکلی تھی ٹانگوں کی بجائے دماغ کی طرف ڈھال دیا جائے ان کا خیال تھا کہ اس زبردست اور اہم انکشاف سے راجہ صاحب کے گھوڑے دنیا بھر کی گھوڑ دوڑ کو اپنی دماغی ترقی کی وجہ سے جیت لیں گے اور دوڑنے میں ٹانگوں کے علاوہ ذہن سے بھی امداد لیں گے اور اس طریق پر ان کی رفتار بے تحاشا بڑھ جائے گی۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ سوچ اور فکر کی قوت کے ساتھ ساتھ ان میں کئی ایک اور باتیں بھی پیدا ہو گئیں اول تو ان کا دماغ ان کی ٹانگوں سے پہلے چل نکلا اور سوار کے لیے ان پر توازن رکھنا قریب قریب ناممکن ہو گیا کیونکہ توازن تو جب ہی قایم رہ سکتا تھا کہ سوار کی ران کے نیچے گھوڑا ہوا اور گھوڑے کا ذہن بھی ہو پھر بعض اُن گھوڑوں نے جن کے دماغ میں یہ ویکسین کچھ زیادہ چڑھ گئی تھی ذہنی طریق پر اَڑنا شروع کر دیا۔ اَڑا تو پہلے بھی کرتے تھے مگر وہ چیز محض شوخیٔ طبع تھی کبھی طبیعت زوروں پر آئی تو پچھلی ٹانگوں کو ہوا میں رقص کا دائرہ کرا دیا۔ یا گردن کو ایک شرمائی ہوئی دلہن کی طرح جو نہوڑایا تو سوار گردن سے زمین پر۔ اب معصوم بنے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کہئے کیسے مزاج ہیں ؟

لیکن اِس مرتبہ کا اَڑنا خالص ذہنی اَڑنا تھا اور اس مرض کے جراثیم جب پہلی دفعہ ماہر حیوانیات کو معلوم ہوئے تو انھیں ایک بار کپکپی سی چڑھ گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مرض خطرناک طور پر متعدی تھا ان تیز رفتار پہاڑی نالوں کی طرح جن میں پانی بڑھنے لگتا ہو تو دیکھتے دیکھتے گزرتے ہوئے مسافر کے

کندھوں سے اوپر ہو جاتا ہے یہ مرض بھی راتوں رات ایک گھوڑے سے دوسرے بلکہ گھوڑوں سے گزر کر کسانوں کو بھی لگ جاتا تھا اور اس کے بعد نہ تو وہ خود محفوظ تھے نہ راجہ صاحب۔

راجہ صاحب کی تقریر میں اِن تلخ تجربوں کا رنگ جھلک رہا تھا اُن کی آج کی تقریر میں سچے عقیدہ کی جھلک اور ان کی زبان میں صداقت کی فصاحت تھی انھوں نے کہا "میرے خیال میں عوام کو پڑھانا ایک ایسا گناہ کبیرہ ہوگا جس کا خمیازہ ہم کیا ہماری آئندہ نسلوں کو بھی بھگتنا ہوگا۔ میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں (چیلنج کرتے ہوئے ان کی آواز ایوان میں گرج رہی تھی اور مارے جذبات کے تھرتھرا رہی تھی) آپ عوام سے وہ رشتہ پیدا کریں جو میں نے کیا ہے تو آپ کو پتا چلے گا کہ وہ کتنے سچے دل سے تعلیم کے خلاف ہیں میں نے ایک تجربہ میں غلطی کھائی (ان کا اشارہ گھوڑوں کے تجربے سے تھا) میں نہیں چاہتا کہ آپ بھی ایسا دھوکا کھا جائیں اگر میں اپنے گھوڑوں سے ایک مرتبہ بھی پوچھ لیتا تو وہ ضرور ہنہنا کر کہتے کہ ہم تو بغیر اس ارتقائی عمل کے گھوڑ دوڑیں جیت لیتے ہیں ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو سوال میں اپنے گھوڑوں سے کرنا بھول گیا آپ عوام سے کریں وہ ضرور آپ سے کہیں گے کہ سرکار ہم تو بغیر تعلیم کے ہی سماج کی خدمت کر رہے ہیں ہمیں تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔"

راجہ صاحب کے بعد ایک مدراسی ممبر نے تقریر شروع کی۔ نواب صاحب آج شاید پہلی مرتبہ کسی تقریر کے دوران میں بیدار ہوئے تھے اور بڑے آدمی تو ٹھیرے ہی ایک دفعہ نیند اچاٹ ہوئی تو دوبارہ کہاں سے آتے آن کے آرام میں خلل اسی مدراسی ممبر نے ڈالا تھا یہ ممبر ایڈلٹ ایجوکیشن (تعلیم بالغان) کے لفظ کو اس طریق پر ادا کرتے تھے گویا ہو سٹرزگن سے گولے چھوٹ رہے ہوں چونکہ یہ لفظ ان کی تقریر میں بار بار آتا تھا معلوم یہ ہوتا تھا گویا کوئی خادر گول انداز تاک کر نشانے لگا رہا ہے ایک نشانہ ایسا کارگر بیٹھا کہ نواب صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں دلٹ۔ دلٹ۔ دلٹ ادھار۔ دلٹ ادھار سے انھیں شاید چڑ تھی ان کے علاقے میں اس تحریک کی وجہ سے پچھلے دھول کے دنوں میں کافی جھلش رہی انھوں نے ساتھ کے ایک مسلمان ممبر کو ٹہوکا دے کر پوچھ لیا "آپ سے صاحب کیا یہی سوالات ہیں" [illegible] تھی کہ نواب صاحب کی پہلی چند سالوں کے انجمن کی تعلیم وقت پر شروع ہوئی تھی

اور ان کا خیال تھا کہ ابھی تک سوالات چل رہے ہیں، یا کوئی دلت ادھار کا بل پیش ہو رہا ہے؟"

ان کے ساتھی مسکرائے اور کہنے لگے "حضرت یہ بحث تعلیم بالغان پر ہو رہی ہے۔"

نواب صاحب: تعلیم بالغان! ارے میاں ہمیں تعلیم بالغان سے کیا مطلب؟ میں خوب جانتا ہوں اس تجویز میں برادران وطن کا ہاتھ ضرور ہے۔"

یہ دو ٹوک اور حتمی فیصلہ بادی النظر میں محض جلد بازی کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا لیکن اگر نواب صاحب کے جذبات اور ان کے تاثرات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ ایک پورے طوفان کی لہروں سے گزر کر اس محفوظ چٹان پر پہنچے تھے۔ ان کے غصے نے پہلی جھرجھری تو اس وقت لی تھی جب ان کی نیند میں خلل انداز کی گئی اور جب دلت ادھار کی غلطی جتائی گئی تو ان کی کیفیت اس لہر کی سی ہو گئی جو ایک دفعہ دریا کے بند سے ٹکرا کر منہ میں جھاگ بھر لائے اور دوسری دفعہ ٹکر کھانے کو تیار ہو اور اس کے بعد تعلیم بالغان! اب تو پانی سر سے گزر گیا تھا ان کے غصہ کے تلاطم نے سب قید و بند ایک ایک کر کے توڑ ڈالے تعلیم بالغان! حضرت سچ کہیئے مسلمانوں کو تعلیم بالغان کی کیا ضرورت ہے؟"

حقیقت یہ ہے کہ نواب صاحب کو اس کا پورا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم بالغان کی مطلق ضرورت نہیں اور یہ فیصلہ ذاتی مشاہدہ پر مبنی تھا کیونکہ جب سے انھوں نے زمینداری سنبھالی تھی انھوں نے کوئی اَن پڑھ مسلمان دیکھا ہی نہیں تھا زمینداری سنبھالنے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنے علاقہ کی سکونت چھوڑ دی اور اس کے ساتھ پورا ماحول بھی چھوڑ دیا تھا ان کے خیال میں نئے زمینداری نظام کے لیے کچھ اس قسم کے عمل کی ضرورت تھی جس سے سانپ اپنی کینچلی اتار کر پرانے ماحول اور پرانے پن سے رخصت ہو لیتا ہے کینچلی بدلنے کے بعد اب وہ شہر کے بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ نواب صاحب نظام زمینداری کے ابھرتے ہوئے ستارے تھے اس تتلی کی طرح جو ابھی ابھی کوئے سے پر پھیلائے نکلی ہو جس کا کوئا کسی جھاڑی کے کانٹوں میں الجھ کر رہ گیا اب اس جھاڑی کی نیم تاریک دنیا کہیں پیچھے رہ گئی اور زندگی کی نئی پرواز رنگین پروں پر ایک جگمگاتی ہوئی دنیا میں چل نکلی تھی یہ دنیا ہوٹل کی دنیا پرتکلف ڈنر اور چائے پارٹیوں کی دنیا تھی اس دنیا کے بسانے والے نہیں اس کے سجانے

ان کے گوانی خانساماں، زینت بوا اور ان کا اینگلو انڈین شوفر تھے۔ خوبصورت ٹیبری کا بدصورت خول دیہات میں رہ گیا تھا اور اس خول میں ان کے ابا میاں کے خاندانی شاگرد پیشہ بدھو باورچی، شبراتی فراش اور کلوا عصا بردار کلبلا رہے تھے۔

میرن پور کی زمینداری ان کے ابا جان کے وقت میں اچھی خاصی پسنجر گاڑی تھی جس میں بدھو شبراتی، نھوا کلوا اور ان کے ساتھ بڑے نواب بھی سوار تھے کوئی اول درجہ میں تھا تو کوئی تیسرے میں اور تیسرے میں جگہ نہ ملی تو کس پل کر ملازموں کے ڈبے میں ہی ٹھنس گئے لیکن چھمن میاں کے زمانہ میں زمینداری وہ اسپیشل تھی جس کے ٹائم ٹیبل میں میرن پور جیسی جگہ ٹھیرنے کا کوئی وقت نہ تھا میاں شبراتی کی جھنڈیا اور بدھو کا نرل دھرا کا دھرا رہ گیا اور چھمن میاں کی زمینداری نے سیدھا لکھنؤ جا کے دم لیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ایک روشن خیال زمیندار کے ہاں ازمنۂ وسطیٰ کی ان تنگ و تاریک یادگاروں کی کیا ضرورت تھی ذلیل یادگاروں کو تو انھوں نے اسی دن مٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا جس دن کلکٹر صاحب نے باتوں باتوں میں کہا تھا کہ آج کل کسی شریف گھرانے میں ان پڑھ ملازم کا ہونا ایک بدنما داغ ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن نواب صاحب نے جو قبائے زمینداری کی دھلائی کیا گھسائی شروع کی ہے تو ان بدنما داغوں میں سے ایک بھی باقی نہ رہا بلکہ اب تو اس قبا کے بھی نیچے سے ریشے ڈھیلے ہو گئے تھے۔

بڑے نواب صاحب کے وقت میں ڈیوڑھی میں ہر روز مکتب لگتا تھا اور شاگرد پیشہ کے بچے چھمن میاں کے ہم مکتب تھے۔ اور ان کا خلیفہ نھوا بہشتی کا بڑا بیٹا شمو تھا۔ لیکن اب تو چھمن میاں کے بچے مسوری کے ایک یورپین اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کے پرانے ملازمین کے بچے باہر سڑک پر خاک دھول میں لوٹتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے ان کے اس جدید ماحول میں نہ تعلیم کی ضرورت تھی نہ تعلیم بالغان کی اور اگر نواب صاحب اس لفظ پر اس قدر جز بز ہو رہے تھے تو وہ ایک حد تک حق بجانب تھے۔ وہ پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ جہاں تک ان کے تجربے کا تعلق ہے تعلیم بالغان کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس وقت ان کے منہ میں ایک طوفان ابل رہا تھا اور وہ اس طوفان کی تندی کو پورے ایوان پر بکھیر دینا چاہتے تھے۔ یہ لپکتا ہوا شعلہ ان کے ہونٹوں تک آتا تھا اور پھر واپس ہو جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ

یہ تھی کہ اب تک وہ جناب صدر کی آنکھ کا اور نہ ہی اس کا اشارہ پا سکے تھے۔ اگرچہ نہ تو ایوان کوئی بزم ناز تھا اور نہ ہی صدر کی آنکھ چشم یار سے کہیں دور کی بھی مشابہت رکھتی تھی لیکن اس نگاہ کو لاکھ تھامنے کی کوشش کریں تھمتی نہ تھی اور ادھر رقیبوں کی زبان بند کرنے کی کوشش کی تو بند نہ ہوتی تھی

اس ایوان میں پہنچ کر نواب صاحب کو بعض عادتیں چھوڑ دینا پڑی تھیں اور بعض نے خود بخود ایسی قلابازی کھائی تھی کہ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو گئی تھیں۔ اب تک انھوں نے باہمی گفتگو میں جو بات دل میں آئی خوب سنا کر کہی لیکن اب ہر بات لکھ کر سنانا پڑ رہی تھی یعنی سنانا کسی کو چاہتے ہیں اور کہہ جناب صدر سے رہے ہیں۔ جمہوریت کے انجینئروں نے انسانی جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ انتظام کیا تھا کہ ہر طغیانی جناب صدر کے واسطے سے ہو کر پہنچے۔ اس سے نہ صرف جذبات کا زور مدھم پڑ جاتا تھا بلکہ یہ عمل اس قوت جاذبہ کا بھی اندازہ لگا لیتا تھا جس کی برکت سے جناب صدر کرسی صدارت پہ چپکے بیٹھے ہیں۔ اس عمل میں جناب صدر کو ان کا وزن اور اہلیت جمود خاص طور پر مدد و معاون ثابت ہوتی تھیں

نواب صاحب لاکھ بن بن کر بیٹھے مگر ان کے لاکھوں بناؤ پر ایک جہاں نگاہ کا، غالب آ گیا۔ وہ جناب صدر کا اشارہ نہ پا سکے اور ان کی تقریر ان سنی رہ گئی۔

اب سیٹھ جگدمبا لال کی باری تھی اور سچ تو یہ ہو کہ آج کسی کی باری کا سوال ہی نہ تھا۔ آج کی بحث عقاید اور اصولوں کے بلند معیار پر ہو رہی تھی اور اب تک جو مقررین بول چکے تھے ان کے منہ کے جھاگ اور ان کے پسینے کے قطروں سے یقین کی بو آ رہی تھی۔ سیٹھ جی بھی انہی لوگوں میں سے تھے عام طور پر وہ اس قدر ٹھنڈے مزاج آدمی واقع ہوئے تھے کہ معمولی مباحثوں کی ہاہمی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا ان کے توازن کو برقرار رکھنے میں ان کی توند بھی امداد دیتی تھی ایک تو اس توند پر دونوں ہاتھ رکھنے سے ایک ابدی طمانیت چہرے پر پھیل جاتی تھی اس جادو کے کرتے کی طرح جو اہل سیمیا اپنے ساتھ رکھتے تھے اس توند پہ ہاتھ رکھ کر معلوم ہوتا تھا گویا کامیابی و نصرت کا گولا ہاتھ میں آ گیا پھر جب کبھی کسی مسئلہ پر طبیعت حاضر ہوئی تو اکثر توند حاضر ہونے میں حائل ہو جاتی تھی اور جب تک سیٹھ جی ادھر ذہن کو بیدار اور ادھر توند کو ہشیار کر سکیں اس وقت تک کوئی اور رکن تقریر شروع کر چکا ہوتا تھا ان کے توندیل جیٹ پہ سے دیکھا

تقریریں بیسیوں احتجاج گرجتے برستے گزرے کئی طوفان اُٹھے اور ٹھنڈے ہوئے لیکن سیٹھ جی اپنی اس آہنی پناہ گاہ کے پیچھے اکثر چین کی نیند سوتے رہے لیکن آج بائیں جانب سے ایک آواز کان میں پڑی جس میں روپے آنے پائیوں کا ذکر تھا اس پر سیٹھ صاحب ہشیار ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک ممبر کہہ رہے تھے۔

"جناب صدر! آپ ہندوستان کے تعلیمی خرچ کا مقابلہ لندن کاؤنٹی کونسل کے خرچ سے کریں لیا ہم ۲۷ کروڑ کی آبادی پر حکومت کی طرف سے محض ۱۲ کروڑ روپیہ خرچ کر رہے ہیں جو اٹھنی فی کس سالانہ سے بھی کم پڑتا ہے لندن کی کونسل چالیس پچاس لاکھ کی آبادی کے لیے ۱۶، ۱۷ کروڑ روپیہ خرچ کر رہی ہے یعنی ۳۸ روپیہ فی کس سالانہ۔ جناب صدر میں حکومت کی توجہ........"

معزز ممبر ابھی جملہ ختم نہ کرنے پائے تھے کہ معلوم ہوا ایوان میں زلزلہ آگیا سیٹھ جی اپنی توند سمیت یکدم پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے، مارے جذبات کے ان کی توند تھرتھرا رہی تھی اور زبان منہ میں پھڑپھڑا رہی تھی یہ جذباتی زلزلہ دیکھنے والوں کو اتفاقیہ سا معلوم ہوتا تھا مگر وہ ارکان جنھیں اُن آتشیں طاقتوں کا اندازہ تھا جو اس کی تہہ میں بھبک رہی تھیں ان کے لیے سیٹھ جی کا یوں پھٹ پڑنا کچھ ایسا تعجب انگیز نہ تھا۔ اس ممبر نے نادانستہ طور پر ان کی بہت حساس رگ کو چھیڑا تھا۔ ان کی زندگی کا اصول پہلے دام بعدۂ کلام رہا تھا اور کاروباری دنیا کے اس اصول کو وہ پوری دنیا کے کاروبار پر مسلط کر دینا چاہتے تھے۔

یہ درست ہے کہ سیٹھ جی نے اپنی دولت بیشتر ٹھیکوں میں اکٹھی کی تھی مگر انھوں نے ہمیشہ پہلے بیج بویا اور پھر فصل کاٹنے کی امید رکھی تھی اور بیج کے بونے اور زمین کے تیار کرنے میں انھیں کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ صاحب کو ڈالیاں دیں، بابو کی بیوی کو ساڑی، اور جمعدار کے بیٹے کو پچھلی دیوالی پر رنگین جنڈول دیا تھا۔ ان کے خیال میں بحث کا سب سے کمزور پہلو یہی تھا بیج ڈالا نہیں گیا اور فصل کی امید کی جا رہی تھی۔

"جناب صدر ان سے (اس کے ساتھ انھوں نے اپنا ہاتھ تقریر کرنے والے رکن کی جانب ایسے انداز سے بڑھایا جو بالکل غیر پارلیمانی تھا) یہ تو پوچھیے کہ یہ دیتے کیا ہیں جو یہ کچھ مانگتے ہیں، ہمارا کسان حکومت کو کیا دیتا ہے تیسرے درجے کا مسافر ریلوے کو کیا ادا کرتا ہے جناب صدر! ہمارے مالیہ کی ولایت کے مالیہ سے کیا نسبت ہے ان جملوں کو ادا کرتے ہوئے ان کی بھویں تنی ہوئی تھیں اور ان کا ہاتھ اس تیزی سے کانپ

مانند جل رہا تھا جو کسی تابوت میں آخری کیلیں ٹھونک رہا ہو، جناب صدر اگر ہم حکومت کو کچھ دے نہیں رہے تو ہمیں کیا حق ہو کہ حکومت سے سب کچھ مانگیں میں مانتا ہوں کہ تعلیم عوام کا بنیادی حق ہو مگر یہ بتایا جائے کہ عوام اس حق کے لیے کیا مالی قربانی کر رہے ہیں؟"

سیٹھ جی کی تقریر کا ایوان پر کچھ ایسا اثر ہوا جیسے کسی تلیا کا بند ٹوٹ کر بہ نکلا ہو جمود کی فضا بدل سی گئی اور ایوان کے تاریک گوشوں میں سے بھی بعض ارکان آگے کو جھک آئے تھے۔ ان میں پنڈت جی بھی تھے پنڈت جی کے لیے یہ موضوع خاص دلچسپی کا باعث تھا۔ علم کے شجر ممنوعہ کو اس ملک میں برہمن نے خود تو اپنایا اور دوسروں کے لیے اسے مسموم قرار دے دیا۔ اور پھر خود اس کے برگ بار حاصل کرنے کے لالچ میں اتنا ہلایا اتنا ہلایا کہ جڑیں تک ڈھیلی کر دیں اور ابدالآباد تک کے لیے اسے ایک سوکھا ٹھنٹھ بنا دیا۔ ہمارے پنڈت جی بھی اسی سوکھے ٹھنٹھ کی ایک اداس بلبل تھے۔ اسی ٹھنٹھ کی آبیاری کی تجویز نے ان کی برسوں کی مردہ طلاقت لسانی کو بیدار کر دیا۔

"جناب صدر! ہندوستان ہمیشہ سے علم و ہنر کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین سے علم و ہنر کی کرنیں پھوٹیں اور ان سے ایک عالم جگمگا اٹھا۔ علم کا گرانبار نخل یہاں پھوٹا، پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ اس کے سایہ میں عوام اور خواص دونوں نے فیضان حاصل کیا۔ اسی سرچشمہ سے ایک طرف مصر و اسکندریہ تو دوسری طرف چین و جاپان سیراب ہوئے۔"

"جناب صدر! اگرچہ آج ہماری تعلیمی حالت اس قدر پس ماندہ ہے لیکن میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید اس ملک میں اس قیامت کی تاریکی پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ اشوک کے زمانے کے کتبے اس حقیقت کے سچے اور بے زبان ترجمان ہیں کہ اُس وقت تعلیم کس قدر عام اور ہر دل عزیز تھی۔ اشوک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا زریں زمانہ ہے۔ لیکن زریں کو چھوڑ کر اگر آپ کانسی اور پیتل کے زمانوں میں بھی دیکھیں ہم تعلیم کے معاملہ میں دنیا کی ہر قوم کے مقابلہ پر اپنا سر فخر سے اونچا رکھ سکتے تھے۔ ابھی پچھلی صدی کے پہلے نصف میں ہی صرف بنگال میں ایک لاکھ مکتب تھے اور آبادی کے چار سو افراد کے لیے ایک مدرسہ تھا۔ جناب صدر! اگر آپ ہمارے صوبوں کے تعلیمی اعداد و شمار کا مقابلہ برطانیہ سے کریں تو آپ کو

تعجب انگیز انکشافات ہوں گے۔ آج بھی برما میں لکھے پڑھوں کی تعداد فی صدی ہمارے ہاں سے گنا ہے اور اس کا سہرا برما کے پرانے نظام تعلیم اور پھونگیوں کے سر ہے۔ رگ وید میں لکھا.........

پنڈت جی ابھی تقریر کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب اپنی جگہ سے دفعتاً اچھل پڑے اور کہنے لگے "پائنٹ آف آرڈر سر" اگر پنڈت جی یہی تقریر اس ایوان کی بجائے آثار قدیمہ کے کسی عجائب گھر میں کرتے تو شاید زیادہ حق بجانب ہوتے (فرمائشی قہقہہ) وہاں کے پرانے بت ان کے خیالات کی اصلی قدر کر سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی زمانے کے بنے ہوئے ہیں جس کی رام کہانی پنڈت جی سنا رہے ہیں۔ کتبوں کی موجودگی سے تعلیم عامہ کا اندازہ لگا لینا میری سمجھ سے بالا تر ہے۔ کیا پنڈت جی کی مراد یہ ہے کہ ہر کتبے کے نیچے ہزارہا تعلیمی مردے گڑے ہیں۔ (مسلسل قہقہہ)

اتنے میں ایک دوسرے رکن نے دور سے پنڈت جی کو پرنام کیا "ہے شریمان! شما کیجئے کہاں وید بانی کھول بیٹھے۔ یہاں ہریجن ارکان بھی تو بیٹھے ہیں"

اس آخری وار سے تو ان کی خود اعتمادی کا آبلہ سا پھوٹ نکلا۔

پنڈت کو مارے ندامت کے پسینہ چھوٹ گیا، وہیں کے وہیں بیٹھ گئے اور چٹیا کھول کر آہستہ آہستہ سر سہلانے لگے۔

اس پر بائیں جانب کے ایک ممبر نے صدائے احتجاج بلند کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے آج ہندوستان کی فی صدی خواندگی کا مسئلہ ہے۔ یہ فی صدی بہت کم ہے اور کم سے کم ہوتی جا رہی ہے جناب صدر! کیا کوئی متمدن سماج روح کی اس دردناک افلاس کو، اس ویرانی کو برداشت کر سکتی ہے جو ایک اچھی ابتدائی تعلیم کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ جناب صدر ایک قوم کی علمی اور ذہنی اٹھان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑوں کو ابتدائی تعلیم کے جاں بخش سوتوں سے زندگی بخشی جائے اور ہمارے تقطیری تعلیم کے نظریے ہمارا ثانوی اور اونچی تعلیم کے لئے شور و غوغا کرنا کیا معنی رکھتے ہیں۔ ہم ملک کی ذہنی زندگی پر ایک ہلکا سا نمائشی رنگ ایک اوپری سی پوت پھیر رہے ہیں مگر اس کے نیچے وہی حیات کی بے حسی، ذہنی کور ذوقی۔ ہمارے ماہرین نے ہمارے لیے تقطیری تعلیم کا سراپہ بنایا۔ ان کے خیال میں وقت کی مصلحت یہی تھی کہ اونچے

طبقہ کو تعلیم دی جائے اور جب یہ طبقہ علم کے رس سے لبریز ہو جائے گا تو اس سے رس ٹپک ٹپک کر سب طبقوں کو سیراب کر دے گا۔ مگر جناب صدر! وقت نے بتا دیا کہ اونچے طبقہ میں کچھ نہ کچھ امر بیل کی سی خاصیت تھی جس نے پورے درخت کا ست کھینچ لیا اور کھوکھلا خول چھوڑ دیا تقطیر کا نظر فریب فانوس ابتدائی تعلیم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اوپر کی سطح میں کلیاں بھی کھلیں شگوفے بھی پھوٹے۔ مگر زمین کی لاتعداد نچلی تہیں صحرا کی طرح ویران، پتھر کی طرح بے ثمر رہ گئیں انہی نچلی تہوں کی آبیاری کا کام بعض ریاستوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ شروع کیا ہے آج ٹراونکور میں مدرسہ جانے والے بچوں کی تعداد بچانوے فی صدی ہے آپ کوچین، ٹراونکور یا بڑودہ کی تعداد خواندگان کا مقابلہ.....

ایک ممبر "پوائنٹ آف آرڈر سر" معزز رکن کے یہ الفاظ غیر متعلق ہیں۔ اس وقت ہمارا موضوع ہمارا اپنا ملک ہے ریاستیں خارج از بحث ہیں۔ جناب صدر! میں معزز رکن سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کو موضوع کی حدود میں رکھنے کی کوشش کریں۔"

مقرر نے دوبارہ اسی انداز بے نیازی سے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔ گویا کارواں جا رہا ہو اور اس کے لوازمات بھونکتے چلے جاتے ہیں۔ تاہم اس ہلکے سے اٹکاؤ سے ان کی تقریر کا بہاؤ اور بھی چل نکلا اور اس میں ایک والہانہ شان خطابت اور گرمیٔ گفتار پیدا ہو گئی۔

"جناب صدر! اب انہوں نے کچکچا کر مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بولنا شروع کیا گویا کسی چیز کا عرق کھینچنے کے بعد اس کا پلیتھن نکالنے کی فکر میں ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ حکومت اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری اپنے کندھوں پر سنبھالے اور طوطیہ کی پابندر کے سرار ایک دفتر کی بلا کسی دوسرے افسر کے سر نہ تھوپنے کی کوشش کرے ہماری ابتدائی تعلیم الف لیلہ کے اس کبڑے کی نعش کی طرح ہے جس کے گلے میں مچھلی کا کانٹا پھنسا تو درزی کے ہاں تھا لیکن اس کی نعش یہودی سوداگر اور کہاں کہاں ہوتی ہوئی بالآخر شاہی مودی کے ہاں پائی گئی ہم چاہتے ہیں کہ جن کے سر ابتدائی تعلیم کی نعش کی ذمہ داری ہے انہیں کے کندھوں پر اس کا جنازہ اٹھایا جائے ہم چاہتے ہیں کہ کوئی روایتی حجام روغن بلسان مل کر اس مردے کے حلق سے مچھلی کا کانٹا نکال دے اس مردے پر اس قسم کے کامیاب اپریشن غیر ممالک میں کئے جا چکے ہیں روس، ٹرکی اور جاپان......

اس پر ایک ممبر آپے سے باہر ہو کر: پھر وہی دوسرے ملکوں کی بات! دوسرے ملکوں کا حوالہ!

جناب صدر! (ادارے غصہ کے بیچ کے نیچے ہی نیچے آستینیں چڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں)

جناب صدر! پھر وہی دوسرے ملکوں کی بات!!

صدر- آرڈر! آرڈر!!

اب بحث کا وقت ختم ہونے کو تھا۔ صاحب صدر نے پہلے سے ہی اعلان کر دیا تھا کہ ایسے فروعی مسائل کے لیے غیر محدود وقت نہیں دیا جا سکتا۔

ایوان کا یہ دستور العمل اُن شاندار روایات کے خلاف تھا جس کی مثال خانگی ایوانات اکثر پیش کیا کرتے ہیں۔ ہم نے بھٹیاریوں کی لڑائیاں اکثر دیکھی ہیں جس میں دو پارٹیاں بعینہٖ اسی طرح دو مستقل محاذوں پر بھی ہوتی ہیں جیسے ایوان کا دایاں اور بایاں بازو۔ فرق محض اتنا ہے کہ آئینی ایوان میں صدر کا نشان امتیاز اس کا گرز ہوتا ہے اور نسوانی ایوان میں کالی ہنڈیا۔ نسوانی ایوان میں ہر مقررہ باری باری ایک دوسری کی جگہ لیتی ہے اور عارضی التوا کی صورت میں ہنڈیا کو اُلٹ دیا جاتا ہے لیکن اس ایوان کی ایک امتیازی شان یہ بھی ہے یہ ایوان زمان و مکان کی پابندیوں سے بالاتر ہے یہاں کسی مسئلہ پر کبھی بھی کسی وقت کسی مدت کے لیے بحث جاری رکھی جا سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ آئینی ایوان جو اِس پرانے جمہوری (واضح رہے کہ جمہوریت سب سے پہلے عورتوں میں آئی اور سب سے آخر میں جائے گی) ادارے کی ترقی یافتہ صورت ہے اس کی سب روایات کو اصلی حالت میں برقرار نہ رکھ سکا۔ اب جبکہ عورتوں کو حق رائے مل رہا ہے امید ہے کہ آئینی ایوان کے آداب اور دستور العمل میں خوشگوار تبدیلیاں ہوتی چلی جائیں گی۔

ارسطو نے ڈراما کے نفسیاتی عمل کو جذباتی تنقیہ سے تعبیر کیا ہے اسی طرح سیاسی ایوان کے عمل کو سیاسی تنقیہ کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ آج کی بحث نے ارکان کے دلوں پر سے غبار سا دھو ڈالا تھا۔ محرک کے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی چمک تھی۔ ان کی نگاہوں میں کل کے اخباروں کی سرخیاں رقص کر رہی تھیں اور ان کے کانوں میں دوستوں کی مبارکبادیاں گونج رہی تھیں۔ وہ ایسے بے ساختگی سے چپ بیٹھے تھے جیسے کوئی بچہ اپنا رنگین کھلونا دوبارہ مل جانے کے بعد خوش ہوتا ہے۔ اب بحث کے اخیر میں

جو وہ جواب دینے اُٹھے ہیں تو ان کا گول گپا سا چہرہ ایک شگفتہ تبسم بنا ہوا تھا۔

"جناب صدر! میں آپ اور سب معزز اراکین کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے نہایت صبر اور اطمینان سے میری تقریر سنی۔ اس بحث کے بعد میرے دل میں آنریبل منسٹر کی وقعت بہت بڑھ گئی ہو جس جرائت آمیز انداز میں انھوں نے مباحثہ میں حصہ لیا اور جن قیمتی خیالات سے ہمیں سرفراز فرمایا وہ تعلیم عوام کے لئے بڑے نیک شگون ہیں۔ ملک وملت کی بڑی خوش قسمتی ہو کہ اس کی تعلیمی کشتی کا ناخدا ایسا مخلص اور حوصلہ مند انسان ہو۔ مبارک ہو وہ قوم جس کی تعلیمی قسمت ایسے محفوظ ہاتھوں میں سپرد کر دی گئی ہو۔ میں تعلیم عوام کا معاملہ بھی اسی محترم ہستی کو سونپتا ہوں اور اپنی تجویز شکریہ کے ساتھ واپس لیتا ہوں۔"

ان کی تقریر کے بعد جو تالیاں بجی ہیں تو انھیں یوں معلوم ہوا گویا ان پر گیندے کی پتیوں کی بھوار پڑ رہی ہو۔ ان کا پورا جسم خوشبو سے بسی ہوئی رنگین لہروں میں ہلکورے لے رہا ہو۔ آنریبل منسٹر کی زبان سے تعریف کا ہر لفظ جو ان کی شان میں کہا گیا تھا ان کے دل میں یوں بیٹھ گیا جیسے کسی عنبریں تہ پر موتی جڑ دیئے گئے ہوں اور جب آخیر میں محرک نے ان کی خدمت میں عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں تو ان کے چہرے پر ایک سچے شیدائی کا خلوص اور نیازمندی تھی وہی اطمینان اور مذہبی عقیدت جو پرانے مصریوں کے چہرے پر ہوتی تھی جبکہ وہ سال کی حسین ترین دوشیزہ کو دریائے نیل کی نذر کرتے تھے اور اسے لہروں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ کوئی ایسی بہت بڑی بے اصولی نہ تھی۔ کیا ہم اپنے ایمان کو ایک ملا کے ہاتھ، اپنی صحت کو ایک نیم حکیم کے پاس گروی نہیں رکھ دیتے۔ پھر محرک نے اپنی تجویز کو ایسے مبارک ہاتھوں میں سونپ دیا تو کیا برا کیا؟

عبدالغفور ایم اے

لکھنویت کیا ہے؟

(سلسلے کے لیے ۱۵ مئی سنہ ۱۹۴۳ء کا رسالہ ملاحظہ ہو)

شاعری اور صنعت گری، جذبات نگاری اور الفاظ کے کھیل کو باہم ملا کر لکھنوی شعرا نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا لیکن ہر رنگ میں نمایاں خصوصیت پھر بھی صنعت ہی کو ٹھیرایا گیا۔ رعایت لفظی یا صنائع جگت جو اول الذکر کی ایک مکروہ شکل تھی اسی کے باعث ظہور میں آئی۔ تشبیہ اور استعارے میں سادہ اور نیچرل تشبیہات کے بجائے تشبیہ در تشبیہ یا مرکب تشبیہوں کے اجزا کی تحلیل ترکیب پر توجہ کی گئی۔ چونکہ غزل کے اشعار میں مثنوی کی سی طوالت عموماً ناپسند کی جاتی تھی اس لیے ایک نئے انداز میں دو غزلے سہ غزلے چو غزلے لکھنے کا رواج ہوا۔ خیال آفرینی جو شعرائے ایران اور فارسی گو شعرائے ہندوستان میں سے بعض نے بطور فن اختیار کی تھی اور جسے شعرائے لکھنؤ کے دور سے پہلے کم لوگوں نے ریختہ گوئی کے مسلک میں داخل کیا تھا یہاں آکر ایک مستقل خصوصیت بن گئی۔ یہ خیال آفرینی کبھی تو محسوس اشیا کے سلسلہ میں تخیل کے زور میں کی جاتی تھی اور کبھی محض وہمی اور تخئیلی مسائل پر توجہ صرف ہوتی تھی۔ آخر الذکر میں کوہ کندن اور کاہ بر آوردن کی مثل بالکل صادق آئی۔ اور شاعری کی کوشش کے سامنے جب ان کے کمالات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بڑی ناامیدی ہوتی ہے۔

صنعت گری کے ہی سلسلہ میں عربی فارسی کی تراکیب کی کثرت جسے ریختہ گو شعرا بالخصوص متقدمین نے بڑی کوشش سے رفتہ رفتہ زبان اردو سے دور کیا تھا دوبارہ رواج پا گئی۔ اشعار کو مرصع کرنے کے لیے فارسی کی رقصاں ترکیبیں دل کھول کر استعمال کی جاتی تھیں ان کے استعمال کی ایک اور وجہ بھی تھی یعنی لکھنؤ اور دہلی کی حریفانہ چشمک۔ دہلی کے وہ شعرا جو لکھنؤ میں شاعری کی بزم کے قیام کے وقت سخن گوئی میں مصروف تھے (میر و سودا وغیرہ) ہندی الفاظ، ہندی تراکیب، محاورات، ضرب الامثال اور ہندی تمثیلات کو بھی ریختہ کا جزو اہم سمجھتے تھے۔ میر کے کلام میں تو یہ خصوصیت

بہت ہی نمایاں ہو۔ ان کے ہاں ہندی کے ایسے سبک اور نازک نگینے جڑے ہیں کہ ان کو نکال کر فارسی کی جاکاری کی جائے تو سوائے بھدا پن پیدا ہو جانے کے اور کچھ امکان نہیں ہو۔ شعرائے لکھنو نے زبان میں تراش خراش کی آڑ سے کر زبان پر جو جای کا وہ عمل کیا کہ ہندی کے عناصر بالکل مٹ گئے۔ جن الفاظ اور تراکیب کو شعرائے لکھنو ایجاد کیتے ہیں وہ ان کی لاعلمی پر دلیل ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کے لیے نہایت موزوں مترادفات دہلی والوں کی زبان میں موجود ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ان میں کون زیادہ فصیح اور بلیغ ہیں تو اس کا انحصار استعمال اور کثرت استعمال پر ہو۔ جس لفظ کو شعرائے لکھنو نے کوشش کر کے ترک کرنا چاہا وہ ترک ہو گیا یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ زمانہ لکھنوی شاعری کے شباب کا تھا اور شعرائے لکھنو کی زبان کو لوگ مستند سمجھتے تھے۔ لکھنؤ میں دربار کی سرپرستی نے اسے اور بھی تقویت پہنچائی۔ دلی والوں کی سلطنت لٹ رہی تھی زبان کو سنبھالنے کا کسے ہوش تھا اور اگر ہوتا بھی تو دلی والوں میں اب وہ کون سی کشش باقی رہ گئی تھی جو دوسروں کو ان کی زبان، وضع قطع اور تراش کی طرف متوجہ کرتی۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی شعرائے لکھنؤ کی اس کوشش میں معاون ہوئی عوام ہر جدید کو لذیذ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ لکھنوی شاعری کا معیوب ترین رنگ اور اس کی مکروہ سے مکروہ صورت بھی ابتدا میں بے حد مقبول ہوئی۔ آخر ان ہی لکھنوی صحبتوں میں امانت کے ضلع جگت اور ان کے واسوخت کی داد ملتی تھی۔ یہی لوگ رنگین اور جان صاحب کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ انہی کے ہاں ہرزہ گوئی کو مرثیہ گوئی کے پہلو بہ پہلو قابل تحسین و آفریں سمجھا گیا۔

صنعت گری میں جس چیز نے زبان کی پگڑی اچھالی وہ معاملہ بندی ہو۔ اگرچہ معاملہ بندی کی ابتدا فارسی شاعری میں ہوئی تھی اور فارسی گو شعرا نے اسے بہ حیثیت ایک خاص فن کے بہت کچھ ترقی بخشی تھی تاہم اردو میں جرأت سے پہلے کسی نے اسے مستقل فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا۔ جرأت کے اس رنگ میں لکھنؤ کی مہذب سوسائٹی کے نقش و نگار ہیں جس کا نمونہ شعرائے لکھنؤ کے علاوہ۔ سوائے حکیم مومن خان مومن کے اور کسی کے کلام میں نہیں ملتا۔ لیکن مومن کے ہاں بھی یہ رنگ اتنا شوخ اور بے باک نہیں کہ طبع سلیم اور مذاق لطیف پر گراں گزرے۔ ناسخ کا کلام بیشتر اور آتش کا اکثر اور عام

شعرائے لکھنؤ کا کلیۃً معاملہ بندی کا ایک ناپاک دفتر ہے۔ حالی نے خوب کہا ہے کہ سوسائٹی شاعری کے اثر سے اتنی خراب نہیں ہوتی جتنی خراب سوسائٹی شاعری کو خراب کر دیتی ہے۔

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است ۔۔۔ بلکہ مے می شود از صحبت ناداں بدنام

یہ لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی زندگی کا عام پسند رنگ تھا جو شاعروں کے کلام میں جھلک گیا ہے اور جس کی داد علانیہ مجلسوں میں ان شاعروں کو ملا کرتی تھی۔ صنعت گری کی ان تمام صورتوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہو رعایت لفظی :-

یاد دُرِ دنداں میں مری جان گئی زند ۔۔۔ تقدیر نے کشتہ کیا ہیرے کی کنی کا

وصل کی شب پلنگ کے اوپر ۔۔۔ مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں۔

کہیں جو بھنی نظروں سے وہ دیکھے ۔۔۔ کہوں آنکھوں کو میں بادام شیریں

بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کبھی اس دن سے ۔۔۔ ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

نہ دکھلایا کسی دن بوند بھر پانی پسینے نے ۔۔۔ ترا چاہ ذقن اے جان جاں اندھا کنواں نکلا

ساری رگیں ہوئی ہیں تن زار پر نمود ۔۔۔ بے طاقتی نے جسم کو مسطر بنا دیا

پڑی جان اڑنے لگا میرے عیسیٰ ۔۔۔ روئی کا جو تو نے کبوتر بنایا

منہ کو اگر بجلی سے چھپاتے جو تم آکر شب وصل ۔۔۔ جلوۂ حسن چراغ تہہ داماں ہوتا

دیکھے قریب چشم جو گیسوے مشکبار ۔۔۔ تشبیہ دی کہ ہیں یہ غزال ختن کے پانو

نہ پیس اے گردش آسماں ۔۔۔ کہ ہر استخواں کا زدا ہو گیا

معطر اس کے نہانے سے بسکہ آب ہوا ۔۔۔ حباب بحر ہر ایک شیشۂ گلاب ہوا

دل دیکھا ہے کس کا تماشہ نہیں پتا ۔۔۔ پر چشم سیاہ کا یہ بادام نہیں پستا

کر خط سے بوسہ لب شیریں دہانہ ترک ۔۔۔ قند و نبات میں نہیں ہوتا ہے بال کیا

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت ۔۔۔ بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

مرغ جاں کو اڑنے کی ہاں تم سے روا کی ۔۔۔ خستہ تن کو کاٹنے کا چھا تمہاری ناک کا

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہو باغباں — لالہ کا پھول رکھنا امانت کی گور پر

معاملہ بندی:۔

رات کو چوری چھپے پہنچا جو میں — غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے
ڈوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو — نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل
مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے — بھاگا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا
کھیلتا ہے وہ کبڈی میں بھی کھیلوں جان پر — ہاتھ رکھ دوں جی میں ہے قاتل کی ننگی ران پہ
منھ پہ منھ رکھا تو بولے کیا خوب — پہلے منھ اپنا تو بنوائیے آپ
انگڑائیاں جو لیں مرے اس تنگ پوش نے — چولی نکل گئی کبھی شانہ مسک گیا
زبردستی لیا بوسہ جو اس کا وصل کی شب میں — بہت جھگڑا بہت بگڑا بہت جھنکا بہت پٹکا
جان جاں یاد ہے بولے کیلئے وصل کی شب — منتیں کرنا مرا منھ کو چھپانا تیرا

تشبیہ و استعارہ و تشبیہات میں شعرائے لکھنؤ نے بیشک اچھا اضافہ کیا ہے۔ راقم السطور کا دعویٰ ہے کہ صرف حضرت محسن کاکوری کے پاک نعتیہ کلام میں اس قدر تشبیہات اور اتنی پرکیف اور پر تصاویر ہیں کہ اردو شاعری کے پورے دفتر میں ان کا جواب نہیں۔ انیس کے ہاں بھی تشبیہات کا کمال موجود ہے اور بلا شبہ ان کی تشبیہیں فصیح اور سلیس ہیں۔ مرزا دبیر کی تشبیہات میں عالمانہ رنگ ہے لیکن وہ بھی بے مزہ نہیں۔ البتہ لکھنؤ کے بعض شاعروں نے تشبیہات میں بھی کہیں کہیں رکاکت پیدا کر دی ہے لیکن لکھنوی شاعری کے اماموں سے جن میں مذکورالصدر حضرات کے علاوہ نسیم صاحبِ مثنوی کا نام بھی شامل کرنا چاہیے اس میدان کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ حضرات دہلی کے یہاں اس قدر تشبیہات کا رواج نہیں ہے اور جو ہیں بھی وہ بہت سادہ اور نیچرل میر کے پورے کلام سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کی مثالوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ لکھنوی حضرات کی تشبیہات ملاحظہ ہوں:۔

محسن کاکوروی:۔ سبزہ ہے کنارِ آب جو پر — یا خضر ہے مستعد وضو پر
نوبت ہے صدائے قمریاں کی — تیاری ہے باغ میں اذاں کی

موہجبیر فاختہ ہے — قد قامت سرو دلربا ہے
اک شاخ رکوع میں رکی ہے — اور دوسری سجدہ میں جھکی ہے
سوسن کی زبان پر مناجات — جاری لب جو سے التحیات
غنچے میں ہے خامشی کا عالم — یا صوم سکوت میں ہے مریم
کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے — اور آب رواں طواف میں ہے
سالک ہے چمن میں نہر موزوں — مجذوب ہے شاخ بید مجنوں
ہے صوفی صاف دل صنوبر — تحریک نسیم حالت آور
جوگیا بھیس کیے ہر رخ لگائے ہے بھبوت — یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمل
لہریں لیتا ہے جو بجلی کے مقابل سبزہ — چرخ پر بادلا پھیلا ہے زمیں پر مخمل
جس طرح دیکھیے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں — لوگ کہتے ہیں کہ کہتے ہیں فرنگی کونسل

اب انیس کی بعض تشبیہات ملاحظہ ہوں۔

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے — جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے
کھنچی تھی یہ زرہ بدن بد خصال میں — پکڑا ہے بیل مست کو لوہے کے جال میں
ے دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

برچھیوں کے باہم ٹکرانے کی کیسی نادر تشبیہ ہے

تلوار کی تعریف۔

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آ کے اینچ کر
پیراک جس طرح نکل آتا ہے موج سے
کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں
غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں

؎ لہراتی ہو گیا نہر شال شکم مار۔

مصحفی کے یہاں ایک نہایت نادر تشبیہ ہو

جو پھر کے منہ کو اس نے نقاب اُٹھا | اِدھر آسمان اُٹھا اُدھر آفتاب اُٹھا

حق ہو کہ شعرائے دلی کبھی ایسی زور دار تشبیہیں پیش نہ کر سکے۔ ہاتھی کی تعریف میں مرزا داغ فرماتے ہیں

فلک آسا وہ تو افیل کہ جس کے آگے | ریزۂ سنگ دخوف سے ہیں سبک کوہ ودمن

چلتے چلتے جو ٹھر جائے، پڑے بوجھ ایسا | ماہی زیر زمیں کا بھی تو دہس جائے شکم

ایک اور لکھنوی شاعر کا شعر ہو

عرق آلودہ گردن زیر کاکل یوں دمکتی ہو | اندھیری رات ہو برسات ہو بجلی چمکتی ہو

خیال کے دو شعر ہیں۔

انشاں جبیں پہ دوش پہ کاکل چھٹے ہوئے | طرفہ چراغ چلتے ہیں کالوں کے سامنے

ساقی کی مست آنکھ پہ دل لوٹ جاتے ہیں | شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے

اچھے صاحب ذاتی کا ایک شعر ہو۔

لحد پر مہوشوں کے پا کا مجمع | ستارے ٹوٹے پڑتے ہیں زمیں پر

مثالیں جس قدر درکار ہوں مل سکتی ہیں طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیجئے۔

یہ چیزیں تو صنعت گری سے متعلق ہیں۔ اب لکھنویت کا خاص رنگ یعنی خارجی شاعری ملاحظہ ہو متقدمین شعرا نے اپنے کلام کی بنیاد واقعات اور جذبات پر رکھی تھی اور چنانچہ بیان کی خوبی کے ساتھ ساتھ مضمون کی خوبی کو بھی شعر کا جزو ضروری قرار دیا تھا۔ لکھنؤ والوں نے ضد میں بالکل ایک دوسرا رنگ ایجاد کیا یعنی حسن اور اس کی کیفیات سے قطع نظر کر کے محض خارجی متعلقات حسن پر اپنی تمام توجہ صرف کی صرف ناسخ کے کلام سے بعض جستہ جستہ مثالیں پیش ہیں۔ یہ صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں اور شاعروں کے کلام کا جائزہ لیجیے تو یہ دفتر شاید ہی تمام ہو۔

بالے کے موتی ہیں نارے روئے تاباں آفتاب — تیرے آنے سے ابھی بام آسمان ہو جائے گا
اس نے جو پوچھا پسینہ رخ سے مالتا کا — بن گیا رومال کمینہ چادر مہتاب کا
لکھوں کیا حال میں دیا نہ اپنی ناتوانی کا — ہوا طوق گراں گردن میں وہ چھلا نشانی کا
دمکتا ہو جو کندن سا بدن ہر ایک ملتے سے — تری جالی کی کرتی میں ہر عالم کا مداحی کا
بندے کانوں میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں — وہ ستارہ صبح کا ہو یہ ستارہ شام کا
کس قدر صاف ہو تمھارا پیٹ — صاف آئینہ سا ہو سارا پیٹ
پہنے کرتی اگر وہ جالی کی — کرے ہر حلقہ کو ستارا پیٹ
نقرئی پٹے کا تو نے نہیں ڈالا جواب — ہو سپہ سارا بدن اور دم مار سفید
گنگری ہو گلے میں کافر کے — دیکھیے جب ہو تان ہونٹوں پر
پہنے وہ صنم جو پیرہن زرد — ہو جائے سفید یاسمین زرد
دیکھی جو قبا تری بسنتی — پھاڑا گیندے نے پیرہن زرد

رنگ پاں سے سبز سونا بن گئے کندن سے گال
مبتذل تشبیہ ہو سونے پہ پیسا ہو گیا

بوسے لیتی ہو ترے بالے کی مچھلی اے صنم — ہو ہمارے دل میں عالم ماہی بے آب کا
چھٹے گی کان کی مچھلی نہ زلف جاناں سے — یہ ہو محال کہ بچ چھوڑے مار مچھلی کا
آتش رنگ حنا سے شمع ہیں سب انگلیاں — دست جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا
ساق سیمیں کی محبت ہو ہمارے دم کیا تم — اے پری تار نفس بھی تار سیمیں ہو گیا

اگر اس شاعری کے ساتھ ہزل گوئی اور ریختی کو بھی شامل کر لیں تو لکھنوی شاعری کا پورا اپنے کمل خد و خال کے ساتھ نظر آنے لگتا ہے ان دونوں کی مثالیں بکثرت ہیں لیکن ہمارے اور آپ کے معیار ظرافت و متانت سے اس درجہ گری ہوئی ہیں کہ ان کا اعادہ ناگوار ہے جرات، انشا، رنگین اور ان کے دور شاگرد اس عالم میں اکثر سب کے سب ننگے ہو گئے۔

اس سے یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے علاوہ لکھنؤ کی شاعری نے اور کوئی صاحبِ فن پیدا نہیں کیا۔ پیدا ہوئے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد ایسے چند نخلستانوں کی طرح ہو جو ایک ناپیدا کنار ریگستان میں کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔ محسن کاکوروی اور انیس اس قبیل کی درخشاں مثالیں ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام سے ردِ عمل کر کے لکھنویت کے اس سیلاب کو روکا اور آج لکھنؤ والے جو خود اپنے بچپن کی اس تشبیہ کو دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہیں وہ ان ہی بزرگوں کا اثر ہے۔ البتہ اس کا اعتراف کرنا ضرور ہوگا۔ لکھنؤ نے زبان کی حک و اصلاح کے علاوہ بعض اصناف میں ترقی کی، مرثیہ گوئی، مثنوی گوئی اور ڈرامہ نگاری ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا بیان کسی دوسری صحبت پر منحصر ہے۔

ابواللیث صدیقی ایم۔اے

علاّمہ اقبال کا فلسفہ

جوہر۔ آئیے باقی صاحب مزاج عالی، میں ماہ نومبر کے جامعہ میں اپنے مضمون پر آپ کی تنقید دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

باقی۔ شکریہ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کو اس تنقید سے اتفاق ہے یا اختلاف؟

جوہر۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو اختلاف ہے اور اگر ناراض ہوں تو اتفاق۔

باقی۔ آپ نے بھی کمال کیا، اختلاف تو اتفاق کی منزل پر پہنچنے کے لیے ایک زینہ ہے۔ جوہر صاحب آپ کے مضمون سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ علامہ کے کلام کی جراحی کرکے ان کی نثری تحریروں سے کلام کا منتشر تقابل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے پیام کا تعین کرسکیں مجھے افسوس ہے کہ اردو شعر و ادب سے یہ خام طریقۂ تنقید دور نہ ہو سکا۔

جوہر۔ باقی صاحب! میں نے مضمون میں اقبال کے فلسفہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سعی میں ان کی شاعری سے بھی مدد لی ہے اقبال کی شاعری پر کسی تنقید یا تقابل کا خیال میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور یہ امر مضمون سے واضح ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ
مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے　　انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

باقی صاحب! واقعہ یہ ہے کہ اقبال پہلے فلسفی ہیں اور بعد میں شاعر، چونکہ ایشیائی طبائع شعر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لیے اس نے اپنے فلسفہ کو شعر میں پیش کیا ہے اقبال کے فلسفۂ حیات کی بنیاد قرآن حکیم پر ہے اور انہیں احکامات کی روشنی میں علامہ کا پیام ملی ہے آپ نے بھی مانا ہے کہ علامہ کا کلام تخیلاتِ قرآنی سے روشن ہے وہ بانگ درا کے دور میں تلاش و جستجو کا شکار تھے ان کے دل میں سوالات کا ہجوم تھا۔ پیام مشرق میں وہ ان کا حل سوچتے ہیں اور ان کو مغرب کے سامنے

پیش کرتے ہیں اور جاوید نامہ میں یہ مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں تعجب ہے کہ آپ اس قدر اعتراف کے بعد فرماتے ہیں کہ شاعر اقبال فلسفی نہیں۔ آپ کی یہ بھی رائے ہے کہ فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ اقبال کو صرف شاعر خیال کرتے ہیں تو مندرجہ بالا خیال اس کی تردید کرتا ہے۔ آپ کے نزدیک تو سوال کرنا جستجو کرنا۔ مسائل کا حل کرنا اور ان کا اعلان کرنا شاعر کا کام ہی نہیں اقبال چونکہ بقول آپ کے ایسا کرتا ہے اور صرف جذبات و احساسات سے نہیں کھیلتا تو آپ کے استدلال کے بموجب اس کو شاعر ہی نہیں کہا جا سکتا ہے اور اگر اس کو فلسفی مان لیں تو وہ (آپ کے نظریہ کے بموجب) شاعر نہیں ہو سکتا۔ اگر اس ارشاد سے آپ کا یہ مطلب ہے کہ اقبال شاعر اور اقبال فلسفی دو الگ الگ چیزیں ہیں تو میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں اس سلسلہ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں نے اپنے مضمون میں اقبال فلسفی کی جو اصطلاح استعمال کی تھی لیکن میری اپنی یہ رائے ہے کہ علامہ کا مقصد فکر شاعری نہیں بلکہ فلسفہ کا درس ہے وہ فلسفی شاعر ہے اس لیے آپ کے مجوزہ اصول تنقید جو صرف جمالیاتی و جذباتی شاعر کو پرکھنے کے لیے شاید کافی ہو سکتے ہوں اقبال پر تنقید کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔

باقی۔ کیا آپ کو ان تین اصولوں سے بھی اختلاف ہے۔ جوہر صاحب وہ تو بدیہیات میں سے ہیں۔

جوہر۔ باقی صاحب! یہ بدیہیات ہو سکتے ہیں لیکن علامہ نے ادب کی تنقید کے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ آپ کے مجوزہ اصولوں سے بالکل مختلف ہیں اس اختلاف کی یہ وجہ ہے کہ آپ کے نزدیک شاعر فلسفی نہیں ہوتا اور اقبال کے نزدیک وہ شاعر جو فلسفی نہیں یا جس کا کوئی خاص پیام نہیں وہ ایک بدبودار رنگین پھول کی مانند ہے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال کے کلام کو اقبال کے مجوزہ اصولوں پر پرکھنا چاہیے۔ اقبال کے معین کردہ تنقیدی اصول پر غور کرنے سے یہ روشن ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال ادب کی تنقید کے لیے اس امر کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ادبیت کی وجدانی دنیا کی تعمیر میں کس قسم کے تخیلات سے کام لیا گیا ہے۔ وہ ادیب کی طرز تحریر اور طرز ادا کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ تخیل کی بلندی اور فکر کی گہرائی پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے جذباتی نظریہ کو بیان کرتے ہوئے بہت سادگی سے

یہ تحریر کر دیا ہو کہ شاعر وہ ہو جو زندگی کی چند صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کرتا ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ وہ صداقتیں کیا ہیں۔ یہیں سے فلسفہ کی حد شروع ہو جاتی ہو یعنی اول تو شاعر کا یہ فرض ہوا کہ وہ صداقت سے روشناس ہو پھر اس کا اظہار شدت احساس سے کرے یعنی پہلے شاعر کو فلسفی ہونا چاہیے پھر شاعر۔ اقبال خود اسلامی تخیل کو شعر کی زبان میں پیش کرتا ہوا اور اسلام کے ہر پہلو پر انہاک علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا ہے۔ اقبال موجودہ زمانہ کے رجحانات سے رد و قدح کرکے اسلامی نظام فکر کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس نظام فکر میں معقولیت، مرکزیت، ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزیں ہو۔

باقی۔ تو کیا آپ کی رائے میں ایک جذباتی انسان جو شعور، منطق، ادراک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیائے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنا لیتا ہو شاعر نہیں۔ جوہر صاحب! شاعر وہ ہو جو بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کرکے اس طرح پیش کرے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکیں۔

جوہر۔ باقی صاحب یہ بھی ایک نظریہ ہو سکتا ہو لیکن دیکھنا یہ ہو کہ کیا علامہ بھی آپ کے جمالیاتی اور جذباتی نظریہ سے متفق تھے۔ حقیقت نگار کو جمالیاتی اور جذباتی نظریہ کے مطابق پرکھنا اس کے کلام کی اہمیت کو گرانا ہو۔ اب میں آپ کے سامنے اقبال کا کلام پیش کیے دیتا ہوں جس سے یہ صاف ہو جائے گا کہ ادب کو پرکھنے کے لیے علامہ نے آپ کے اصولوں سے مختلف اصول بیان کیے اور شعر و شاعری کے متعلق ان کا اپنا تصور آپ کے تخیل سے بالکل جدا ہو۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر   گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات   نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہو زیر فلک امتوں کی رسوائی   خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

شعر کو خودی کی حفاظت کرنی چاہیئے ورنہ جذباتی گورکھ دھندہ رہ جاتا ہو۔ جمالیاتی ادب فسون و افسانہ ہو کیونکہ وہ خودی کو کند کرتا ہو لیکن دقت یہ ہو کہ اگر اس تخیل کو مان لیا جائے تو اردو ادب

کا ایک کثیر حصہ حدودِ ادب سے خارج ہو جاتا ہے۔ والٹیر کہا کرتا تھا جو باتیں اتنی ناپاک ہوتی ہیں کہ ان کو نثر میں بیان کرنا شرمناک معلوم ہوتا ہے ان کو شعر کی شکل میں گا کر بیان کیا جاتا ہے" والٹیر کا یہ قول ہماری جذباتی شاعری پر پوری طرح عاید ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ملوان دونوں ہم سے اک رات جانی ۔ کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی (میر)

لیتے تھے لب کے بوسے ہم دیتے تھے منہ میں وہ زباں ۔ ہائے تھے کامیاب عیش دونوں ہم کہ ناگہاں

صبح دمید شب گزشت ماشبینہ خانہ رفت ۔ روئے سحر سیاہ کنیم یار بہ ایں بہانہ رفت (مومن)

یہ سب اشعار شدت احساس سے احساس کو ابھارنے کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن اقبال کے نزدیک نہ یہ شعر ہیں اور نہ ان لمحات میں جبکہ ان بزرگوں نے یہ شعر کہے ان کو شاعر کہنا مناسب ہے۔ کہاں ہمارے پرانے شاعروں یہ عصمت سوز جمالیاتی کلام اور کہاں اقبال کا یہ نظریہ۔

اے کہ ہے زیرِ فلک مثل شرر تیری نمود ۔ کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر ۔ وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

مکتب و مے کدہ جز درس نبودن ندہند ۔ بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی برد

جس شاعری سے تعمیرِ خودی نہ ہو اس پر اقبال آنسو بہاتے ہیں اور باقی صاحب آپ کی جمالیاتی شاعری اسی قابل ہے کہ اس پر نوحہ کیا جائے۔ ہماری شاعری زوال کے زمانے کی شاعری ہے اور شاید اسی قسم کی جمالیاتی اور جذباتی شاعری کو سراہنے کے لیے آپ کے بیان کردہ اصول وجود میں لائے گئے ان شاعروں اور ان کی شاعری کے سراہنے والوں کی بابت علامہ فرماتے ہیں ؎

آہ! وہ کافر بے چارہ کہ ہیں اس کے صنم ۔ عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات

تو ہے میت! یہ ہنر تیرے جنازے کا امام ۔ نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن ۔ جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

دیکھئے باقی صاحب اقبال کے نزدیک شاعر وہ ہے جو حقیقت کو سمجھے اور حقیقت جذباتی طریقہ پر سمجھ میں نہیں آسکتی اس کی بابت علامہ نے اپنے خطبات میں اشارہ کیا ہے۔ اگلے شعر میں علامہ فرماتے ہیں ؎

مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے ۔۔۔ یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو ۔۔۔ جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں ۔۔۔ جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اگر شاعر کی نوا خودی کو نہ ابھارے تو وہ شاعری بیکار ہے۔ ہنر کا مقصد ساجی زندگی کی تشکیل کرنا ہے جس ہنر میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور جو زلف و کاکل کے جمالیات اور بوس و کنار کے جذبات سے آگے نہ بڑھے وہ ہنر نہیں بلکہ بے ہنری ہے۔ باقی صاحب آپ کچھ اکتا سے گئے۔

باقی۔ نہیں نہیں آپ فرمائیے میں سن رہا ہوں مفصل جواب دوں گا۔

جوہر۔ باقی صاحب! میں اس مسئلہ کو اس لیے زیادہ وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میرے چند عزیز دوستوں نے بھی میرا مضمون دیکھ کر یہی فرمایا کہ اقبال تو شاعر ہے اس کی فلسفیانہ نقطہ نظر سے تنقید بے معنی ہے اس سے مجھے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر یہی خیال ذہن نشیں ہو گیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ خود علامہ کے کلام سے نوجوانوں کے اس خیال کی تردید کر دوں۔ اقبال جمالیاتی و جذباتی شاعر نہیں ہے بلکہ فلسفی ہے جو حقیقت کو سمجھتا اور سمجھانا چاہتا ہے شاعر کے عنوان سے ضربِ کلیم میں علامہ فرماتے ہیں۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نَے ۔۔۔ شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم ۔۔۔ اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لَے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو ۔۔۔ شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے ۔۔۔ بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

جو قوم غلامی میں جکڑی ہوئی ہو اس کے لیے جمالیاتی شاعری سم قاتل ہے جس طرح اگر گھر میں چوہے

قلابازیاں کھائیں تو سکین کرناچ و رنگ دیکھنا تا ہی کو دعوت دیتا ہے اسی طرح غلامی میں جالیات کی طرف جانا بربادی ہے۔ اقبال شاعر کو حقیقت سے معرکہ آرا دیکھنا چاہتا ہے جمال سے مبہوت نہیں دیکھنا چاہتا ہماری شاعری کی بابت کہتا ہے۔

ہر شعر مجسم گرچہ طربناک و دلاویز | اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں | بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز
اقبال یہ ہے خارا تراشی کا زمانہ | از ہر چہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز

شاعر اگر حقیقت آشنا نہیں ہے اور وہ اپنے کلام سے خودی کو نہیں ابھار سکتا تو اس کو خاموش رہنا چاہئے ایک دوسری جگہ ہنرورانِ ہند کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا | ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں | زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند | کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس | آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

باقی صاحب یہ ہے آپ کے جالیاتی ادیبوں کی حقیقت علامہ کی نظر میں جسے آپ اپنی جالیاتی عینک سے دیکھنے کی سعی فرما رہے ہیں۔ در اصل جذبات و احساسات بھی کسی فلسفہ اور زندگی کے مطابق ہوتے ہیں شاعر پہلے فلسفی ہوتا ہے پھر اس فلسفہ کی روشنی میں خاص قسم کے جذبات و احساسات کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال فلسفی شاعر ہے جو اسلام کی دعوت دیتا ہے اسلام ایک خاص قسم کی سماجی زندگی کا موید ہے اس زندگی کی تشکیل کے لیے ایک خاص لائحہ عمل پر چلنا ضروری ہے اقبال اس زندگی اس لائحہ عمل اور اس نصب العین کی طرف برابر دعوت دے رہا ہے جو کچھ علامہ نے نظم میں کہا ہے وہی نثر میں کہا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے یہ حق ضرور دیں گے کہ میں علامہ کی نظم کو ان کی تحریر کردہ نثر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کروں اور شعرا کی طرح اقبال کا مسلک یہ نہیں کہ قافیہ اور ردیف نے جو خیال دل میں پیدا کیا اس کو پرشوکت اور دلگداز الفاظ میں باندھ دیا بلکہ وہ قافیہ و ردیف کو فلسفہ

کے تابع رکھتا ہو قافیہ ردیف کی خاطر اپنے خاص پیغام سے ایک انچ ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتا باقی صاحب آپ کے تینوں بدیہیات علامہ کے بدیہیات سے مختلف ہیں علامہ کے کلام پر تنقید آپ کے زاویہ نگاہ کے مطابق نہیں کی جا سکتی اور اگر آپ ایسا کریں گے تو اس کے پیغام کی اہمیت ختم ہو جائے گی جمالیاتی اور جذباتی شاعری کی بھی سماجی زندگی میں جگہ ہے لیکن ناچ و رنگ کی طرح شام کو ایک آدھ گھنٹہ ہی اس کو دیا جا سکتا ہے اور بس۔

باقی۔ جوہر صاحب! بڑی دقت یہ آگئی کہ آپ شعر کی جادوگری کو نہیں سمجھتے۔ دراصل جو خیالات نثر میں معمولی طور پر بیان کیے جاتے ہیں وہ جب شعر بن کر جلوہ گر ہوتے ہیں تو ان میں اتنی رنگ آمیزی وسعت اور اثر پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی دوسری شئے ہو جاتے ہیں۔

جوہر۔ باقی صاحب اشعار اور نثر کے طریقہ بیان میں فرق ہوتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ نثر میں اگر الحاد کی تبلیغ کی جا رہی ہو تو جب اس خیال کو نظم کریں تو وہ خدا کے وجود و وحدانیت کا ذکر معلوم ہوگا۔ مثنوی اسرار و رموز تو آپ کی نظر سے گزری ہوگی اس میں تمام تر علامہ کا وہی فلسفہ ہے جو انھوں نے اپنے مقالوں میں بیان کیا ہے۔ مثنوی کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱- دربیان اینکہ اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات تعیناتِ وجود بر استحکام خودی انحصار دارد۔

۲- دربیان اینکہ حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است۔

۳- دربیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام پذیرد۔

۴- در حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ۔

ساری مثنوی میں اسی قسم کے مطالب کا اظہار کیا گیا ہے۔ شاید آپ یہ فرمادیں کہ یہ مثنوی ہے۔ ضرب کلیم کو لیجئے اس کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

اجتہاد۔ تقدیر۔ توحید۔ جہاد۔ قوت اور دین۔ فلسفہ۔ نکتہ توحید۔ خودی کی تربیت۔ خودی کی زندگی عقل و دل۔ تسلیم و رضا۔ مرگ خودی۔ آزادیٔ نسواں۔ وجود۔ دین و ہنر۔ اشتراکیت۔ انقلاب۔ فقر

یہ وہی باتیں ہیں جن کو علامہ نے نہایت جامع طور پر اپنے خطبوں میں بیان کیا ہے کیونکہ نثر میں خیالات کا اظہار آزادی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لیے علامہ کے کلام کو ان کے خطبوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ شعر میں استعارات، تشبیہات حسن ادا وغیرہ اتنی جاذب توجہ چیزیں ہوتی ہیں کہ نفس مضمون کی طرف توجہ مشکل ہی سے جاتی ہے لیکن نثر میں تمام تر توجہ نفس مضمون کی طرف رہتی ہے۔ اس لیے مطالب سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں جو صاحب اقبال کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کو علامہ کے خطبے پڑھنے چاہییں اور ان پر پوری طرح حاوی ہونے کے بعد اس کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

باقی۔ اچھا ان امور کو چھوڑیے ان کا جواب میں مفصل دوں گا۔ اب یہ فرمائیے کہ علامہ کا فلسفہ کیا تھا۔

جوہر۔ یہ اب دوسری صحبت کے لیے اٹھا رکھیے لیکن باقی صاحب! یہ عرض کر دوں کہ آپ نے اقبال کے فلسفہ کی تحلیل جس طرح کی ہے مجھے اس سے اختلاف ہے۔

باقی۔ اچھا تو رخصت کیونکہ کافی رات چلی گئی اور اگر یہ گفتگو چھڑ گئی تو طویل ہو گی۔ اچھا شب بخیر۔

جوہر۔ خدا حافظ!

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

مومن کی غزل گوئی

مومنؔ بہت سی باتوں میں اپنے ماحول سے الگ ہیں۔ کہیں تو اسی پر ترقی کی ہے اور کہیں اپنی انفرادیت الگ قائم کر لی ہے۔ پہلی بات تو ان کا اپنا غزل کا نظریہ ہے۔ ان کے نزدیک غزل کو محض لغوی معنوں میں برتنا چاہیے اور اس طرح غزل کو انہیں مضامین پر محدود کر دینا چاہیے جو عشق و عاشقی خصوصاً معاملہ بندی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس اصول کو جو غالباً ان کی عربی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ مومن خاں نے اپنے کلام میں سختی سے برتا اور آخر تک بڑے استقلال سے برقرار و قایم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہم کو وحدت الوجود، ہمہ اوست یا ہمہ از اوست کے مسئلے نہیں ملتے۔ تصوف کی خیالی بلندیوں پر چڑھنا نہیں ہوتا اور فلسفہ کی پر پیچ دقت سے ہم صاف بچ جاتے ہیں۔ ان کے ہاں محض عشق و عاشقی ہے، معاملہ بندی اور معشوق سے باتیں ہیں اور معشوق بھی اسی دنیا کا۔

پیدائش ۱۸۰۰ء مطابق ۱۲۱۵ھ۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں نجبائے کشمیر سے تھے۔ حکیم نامدار خاں و حکیم کامدار خاں دو بھائی عہد سلطنت مغلیہ میں دہلی آئے اور شاہ عالم کی سرکار سے پرگنہ نارنول جاگیر عطا ہوئی جو بعد کو ضبط ہو گئی اور پنشن مقرر ہو گئی۔ حکیم مومن خاں ۱۲۱۵ھ میں کوچہ چیلاں میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز نے نام رکھا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں شاہ عبدالقادر دہلوی سے پڑھیں۔ طب باپ اور چچا سے۔ نجوم اہل فن سے۔ اس کے علاوہ رمل اور ریاضی میں کافی شغف رکھتے تھے۔ شطرنج سے مناسبت تھی۔ موسیقی میں طاق تھے اور عملیات میں بھی دخل تھا۔ شاعری سے عاشق مزاجی کے سبب لگاؤ ہوا۔ کلام شروع میں شاہ نصیر کو دکھایا۔

تصانیف: کلیات اردو، کلیات فارسی، انشائے فارسی، رسائل طب نایاب۔

معاش: حکیم نامدار خاں کے وارثوں کی جو پنشن مقرر تھی اس میں مومن نے بھی اپنا حصہ پایا۔ اس کے علاوہ کچھ سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ شاعری یا طبابت کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ حالانکہ اکثر مختلف ضرورتوں کی خاطر جہانگیر آباد، بدایوں، سہسوان، رامپور، بلندشہر، جہانگیرآباد، پٹیالہ کا سفر کیا تاہم دریوزہ گری نہ کی۔ اور باوجود ذرائع محدود ہونے کے امیرانہ انداز سے زندگی بسر کرتے تھے۔

دراصل مومن کا یہ نظریہ کئی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ایک تو عربی میں غزل کی تعریف دوسرے ان کی خود کی سخت عاشقانہ طبیعت اور تیسرے اس وجہ سے ان پر جرأت کا اثر۔ عربی میں غزل معشوق سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں عاشقانہ اور ایک دوسرے کی تفریح کی ہوں گی۔ اس لئے مومن طبیعتاً اسی طرف راغب ہوئے اور غزل کو اصولاً اسی معنی میں برتنے میں زندگی گزار دی۔ چونکہ جوانی جوانیوں میں کٹی تھی اس لیے اس کوچے سے خوب واقف تھے اور واقعی طبیعت پر ظلم کرتے اگر وہ معاملہ بندی کی طرف نہ آتے۔ لازماً جرأت کا رنگ آگیا اور اس کو وہ خود بھی مانتے تھے لیکن جرأت میں اور ان میں کافی فرق ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ جرأت کا ماحول تمام تر رنگ رلیوں کا شیدائی تھا۔ کیا بادشاہ اور کیا فقیر ہر ایک پر سرخوشی چھائی ہوئی تھی۔ لکھنؤ مرفہ حالی کے لحاظ سے اپنے شباب پر تھا اور بادشاہ کے اثر سے طبائع اور شاعری دونوں پر مستی چھائی ہوئی تھی۔ صلحا اور زہاد کی پگڑیاں اچھالی جاتی تھیں۔ اسی اسباب کی بنا پر جرأت کی شاعری ایک بے دھڑک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شادی درد کے گھرانے میں ہوئی۔ ساس اور سسر میر درد کی پوتی اور نواسے تھے۔ ایک بیٹا احمد نصیر خاں (ان کے بیٹے محمد نصیر خاں اور بیٹی عزیز بیگم حیات ہیں) ایک بیٹی (عبدالغنی سیتاپوری سے بیاہی گئی) یادگار چھوڑے۔ اسی بیٹی کی تاریخ ولادت کہی تھی

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے — کہی تاریخ دختر مومن

۱۳۴۰-۸۱ = ۱۲۵۹ھ

ابتدائی زندگی جوانیوں میں کٹی بعد میں سید احمد رائے بریلوی سے بیعت کی اور صلاح اور تقویٰ میں بسر کردی مذہبی شغف زیادہ تھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل ان کے ہم سبق و ہم جلسہ تھے۔ اکثر جگہ مقلدین اور شیعوں پر چوٹیں کی ہیں ۱۲۶۸ھ میں کوٹھے سے گر کر چھ مہینے بعد انتقال کیا۔ جیسا خود حساب لگایا تھا ۵۲ سال کی عمر پائی۔

گرنے کی تاریخ خود کہی بشکست دست و بازو۔ مرنے کی تاریخ ان کے شاگرد آہی نے کہی۔ ماتم مومن خاں غالب نے لکھا

شرطیست کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر — خونابہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن — چوں کعبہ سیاہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

شاگرد: نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ مرزا قربان علی سالک۔ نواب اصغر علی خاں نسیم۔ میر حسین تسکین۔ میر عبدالرحمن آہی۔ حکیم سند علی آشفتہ۔ سالک۔ قیصر اسد العالم صاحب یاس وغیرہ

کلام: شیفتہ کے نسخہ سے آہی نے صاف کر کے مومن کی علالت میں مجتمع کر دیا تھا۔ غزل دردناک اور دلپذیر ترنم سے پڑھتے تھے

چھایا چھائی نظر آتی تھی۔ مومن کا ماحول اس کے برخلاف مغلس اور مولویانہ اور فاضلانہ تھا اس لیے جو بات مومن کو کہنا ہوتی وہ سنجیدگی اور علمیت کے پردے میں کہنا پڑتی تھی کیونکہ سامعین و نقاد وہی لوگ تھے۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا فرق یہ کہ جرأت خود کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اس لیے بیشتر کھل جاتے تھے مومن برخلاف اس کے علوم متداولہ میں کافی وقوف رکھتے تھے لازماً ان کو اپنے پڑھے لکھے کا بھرم رکھنا ہی پڑتا تھا اس لیے پردے پڑے ہی رہتے اور قیس محل کے گرد محض چکر کاٹا کرتا۔

عوام کی تقلید اور پابندی کے لحاظ سے جس کے مومن خلاف تھے یہ تغزل کا نظریہ ایک جدت کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مضامین کے لحاظ سے مومن نے اپنے تغزل میں وہی مسلمات برقرار و قایم رکھے جو ان کے زمانے میں مروج اور عام تھے اور اسی تقلید نے ان کے تغزل کو بڑی حد تک محدود بنا دیا ہے۔

حالانکہ مضامین کی اس محدود دنیا میں انھوں نے کافی جولانیاں اور نازک خیالیاں برتی اور دکھائی ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک محدود آسمان ایک محدود زمین ہے جس میں وہ بجلیاں چمکایا کرتے ہیں اور اس سے سر مو تجاوز نہیں کرتے۔ یہ کبھی نہیں کرتے کہ کبھی اس فلک کو توڑ کر باہر نکلیں اور اپنا آشیانہ اس عرش سے پرے بنانے کی کوشش کریں یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھتے وقت مسلمات شعری کا ایک خاص کاسہ سر اوڑھ لینا پڑتا ہے جس میں مضامین و تصورات محدود ہیں اور اگر کوئی نازک خیالی ندرت اسلوب یا شوخی ادا برتی جاتی ہے تو اسی محدود دائرہ کے اندر۔

مومن رعایت لفظی اور ایہام کے عاشق ہیں اور اس حیثیت سے اپنے دور کے پابند نصیر کے شاگرد

ؔ۱ شاید کہ دن پھرے ہیں کسی تیرہ روز کے | اب اس گلی میں غیر نہیں پھرتے شام کو
تھے وہ دست غیر میں دیے ہاتھ | آس ٹوٹی شکستہ پائی کی
اس پری وش کو لگاتے ہیں مجھے | لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے
لے گئی جان یاد رونق ہائے وصل | گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے
کشادِ دل پہ باندھی ہے کمر آج | نہیں خیر آپ کے بند قبا کی
منہ کو مرے سینا صبح کی بخیہ گری ہے | ورنہ ہیں بھی ابھی تھے ہی پردہ دری آتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

چکے تھے اور ناسخ کے ماننے والوں میں سے تھے اس لیے ان پر یہ رنگ چڑھ گیا حالانکہ انھوں نے اپنا سکے اور دیگر خصوصیات قبول نہیں کیے مثلاً محاورہ بندی، سنگلاخ زمینیں (ان کو محض زور بیان دکھانے کے لیے کہی گئیں) لیکن رعایت لفظی کو وہ قادر الکلامی کی پہچان سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ اس کو اصل غایت نہ سمجھتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یاس دیکھ کر غیر سے کسدی — بات اپنی امیدواری کی

اب اور سے لو لگائیں گے ہم — جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

سر دوش عدو پہ رکھ کے بیٹھے — جانا کہ نہ سر اٹھائیں گے ہم

دل دے کے اک اور لالہ رو کو — ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

گر خواب میں بھی اُدھر کو دیکھا — آنکھیں مژہ کو دکھائیں گے ہم

گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو — منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو — جی ہی کر ہوا بنائیں گے ہم

اتنا ہی گلے سے دھیان تیرے — خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

برباد نہ جائے گی کدورت — کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

بگڑے تو کریں گے اور سے صلح — تجھ پر بھی بری بنائیں گے ہم

لب کا ترے دعوئے مسیحی — مر اور پہ آزمائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری — کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا — کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا — سوتے مرے جگائیں گے ہم

بت خانہ ہمیں ہو گر ترا گھر — مومن ہیں تو پوجائیں گے ہم

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اس لب لعل کی شکایت ہے — کیونکہ رنگین نہ ہو کلام مرا

آنسو اشکوں کے ابر آنے نے ڈبویا مجھے — چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہو گیا

تے لیکن معیار استادی کا ایک ضروری جزو ضرور گردانتے تھے اور یہی مومن اور ذوق کی رعایت لفظی کا فرق ہے کہ اول الذکر معانی آفرینی کو پیش نظر رکھتے تھے اور رعایت لفظی کو مقصود شعر نہیں بناتے موخر الذکر کا نظریہ بالکل برعکس ہے۔ مومن کو یہ شوق دراصل ابتدا میں نصیر و ناسخ سے حاصل ہوا اور اس وقت تک اکثر اشعار محض رعایت ہی کی خاطر لکھے ہیں لیکن بعد کو محض ایک ذریعہ و ترکیب اظہار کا رہ گیا نہ کہ مقصود اظہار لیکن پیچھا عمر بھر نہ چھوڑا۔

لیکن دراصل مومن کا مسلک معنی؎۱ آفرینی اور نزاکت خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ مومن کی شاعری

؎۱ دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے — اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

کرہ خاک ہے گردش میں تپش سے میری — میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے — فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

روز جزا جو قاتل دل جو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

پس شکستن خم زجر محتسب معقول — گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف — خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو — کہتے تھے تاب لائیں گے ہم

جراح کیا سوچا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا — کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر کو دیکھ کر

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لیے — سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا — میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو — ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

کیا سنتے ہو کہ جیتے ہیں جینا مشکل — تم سے جدا ہو کے مرنے تو آساں ہوگا

بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر

ذاتی رجحانات اور خارجی معیار و مذاق شعری کی کش مکش کا ایک عجیب مرقع ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری گنجلک سی نظر آتی ہے۔ یہ مرد میدان آخر تک اپنا میدان پا نہ سکا کبھی زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے رعایات لفظی و خارجی حسن شعر پر مائل ہو جاتا لیکن اپنی ذاتی افتاد سے مجبور ہو کر اپنی خداداد زور تخیل و نزاکت تخیل کو کام میں لائے بغیر نہ رہ سکتا کبھی ملیت، دہلوی سنجیدگی اور متانت کا نقشہ پیش کرتا جو ماحول کا اثر تھا لیکن اپنی طبیعت کی جولانیوں کو کہاں لے کر جائے کہ اس مصنوعی متانت کو چاک کر ڈالنا چاہتی تھیں۔ مختصر یہ کہ پیشہ او ظاہری رکھ رکھاؤ اور برتاؤ فاضلانہ تھا لیکن طبیعت شاعرانہ اور منچلی تھی۔ مومن اس کشاکش میں ایک لائحہ عمل اپنے لیے بنانا چاہتے تھے (اور یقیناً ایک خوشگوار رویہ اختیار کر لیتے اگر مرنے پر اس قدر جلد نہ تیار ہو جاتے) یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں کبھی تو غالب کی طرح عوام کی تقلید سے نفرت جدت سے شوق۔ نزاکت تخیل سے رغبت ملتی ہے اور کبھی ذوق کی طرح محض الفاظ کے الٹ پھیر میں دقت نظری۔ نتیجہ یہ کہ محض گنجلک حاصل ہوا جسے ہم ان کا خاص رنگ کہتے ہیں۔ نہ لکھنوی خارجی کمالات آئے نہ دہلوی حسن بیان، سلاست سادگی اور روانی میں کچھ اپنے ماحول سے باوجود اپنی صلاحیتوں کے زیادہ ہونے کے زیادہ بلند نہ ہو سکے اس لیے ہم ان کو ذوق اور غالب کے درمیان کی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں۔

بعض طبائع دقت پسند ہوتی ہیں اور ان کو گرہیں ڈال کر کھولنا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے ان کی قدرت گرہ کشائی بر روئے کار آتی ہے اور عوام سے بلندی ظاہر کرتی ہے۔ مومن یقینی اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ ان کی نازک خیالی، مضمون آفرینی اور دقت نظری کچھ تو اس سبب سے اور کچھ متاخرین شعراء

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

قتل دشمن کا ہے ارادہ اسے
یہ سزا اپنی جاں نثاری کی

حیرت حسن سے یہ شکل بنی
کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

نہ ربط اس سے نہ یاری آسمان سے
جا بہر مدد لاؤں کہاں سے

کس طرح مایوس ہوں تاثیر سے
دم رکے ہے نالۂ شبگیر سے

فارسی کے مطالعہ سے نہ صرف وجود میں آئی بلکہ ان اثرات کے سبب سے مغلق اور دقیق ہو گئی یہ گنجلک یا اغلاق مومن کے یہاں عموماً مبالغہ کے دور از کار ہونے یا ایہام و رعایت لفظی پر شعر کے مبنی ہونے یا استعارہ در استعارہ کے استعمال یا بڑے خیال کو مختصر کرنے کی خواہش (جس کی وجہ سے اکثر الفاظ حذف کر دینا پڑتے ہیں) سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا انھوں نے اپنے تخیل کو بھی ایک فن بنا لیا تھا اور تعجب یہ کہ اپنے جنونی شعروں میں بھی یہ التزام قایم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار محض دماغی معمے ہو کر رہ گئے جن کو حل کر لینے پر بھی کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کا تعلق نفسیات بشری سے نہیں بلکہ عقلیات سے ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کی تڑپ نہیں بلکہ تعقل انسانی کی پیچیدگیاں ہیں ؎

شاعری اپنی ہوئی نیرنگیِ دانشوری　　جو سخن ہے سو طلسم رازِ بطلیموس ہے

اور یہی غالب و مومن کے درمیان بڑا فرق ہے۔ غالب کے مشکل اشعار حل کرنے پر خوشی محسوس ہوتی ہے اور کائنات یا فطرت انسانی کا ایک نہ ایک مخفی راز کا علم حاصل ہوتا ہے لیکن مومن کی گتھیاں سلجھانے پر محض گتھیوں کا سلجھانا ہی ہاتھ آتا ہے۔ مومن کے اشعار گویا ان کی شطرنج کے نقشے ہیں جن کے حل کرنے پر محض اسی بات کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ حل ہو گیا یا دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ مومن کے یہاں تصنع آمیز پیچیدگی اور دقت نظر ہے۔ علو تخیل اور بلندی فکر نہیں

بظاہر مومن توبہ کر چکے تھے لیکن جن باتوں کے حل سے انھوں نے توبہ کی تھی اب وہ محض شعر ہو کر رہ گئی تھیں یہی وجہ ہے کہ مومن معاملہ بندی کے معاملات میں اپنے صحیح رنگ میں نظر آتے ہیں حالانکہ ماحول اور طبیعت کی وجہ سے متانت کا رکھ رکھاؤ برتتے لیکن طبیعت کو نہ مارتے۔ ان کا عشق مجازی و بوالہوسی کی طرف مائل ہے لیکن پستی اور ابتذال کم ہے۔ اور ان کے معاملے بیشتر کسی پردہ نشین سے ہیں معاملہ بندی در اصل گہری تصورات کا نتیجہ ہے اس لیے اس بیان میں تسلسل ہو تو خوب ہے۔ مومن کی معاملہ بندی میں تسلسل اکثر ملتا ہے خصوصاً جب وہ خود

دعا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح　　اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

لے تاب جب ملی ہے تو آرام وصل میں　　کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

[illegible]　　قربان [illegible]

اپنے کسی معشوق سے خفا ہو جاتے ہیں۔ مومن اور جرأت کی معاملہ بندی میں ایک خاص فرق یہ بھی ہے

[illegible] (شعر) نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین یاں — کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہان میں — کرتا ہے ظلم کون کسی پر تری طرح

ہوں جاں بلب بتان ستمگر کے ہاتھ سے — کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب — وہ آئے بھی تو نیند نہ آئی تمام شب

واں طعنہ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز — باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں — اس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے — یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے — تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایماں عقل و ہوش — ہائے کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

دیکھیے انجام کیا ہو مومن صورت پرست — شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر — مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو — وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم — گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی — تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا تم نے آنے کا وعدہ تھا — سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی — تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا — وہ نہیں نہیں کی ہر آں ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے بے وفا — میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

[illegible]

کہ مومن اپنے کہے کو برا سمجھنے لگے تھے جرأت برخلاف اس کے اسی کو اچھا سمجھتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

رات کس کس طرح کہا نہ رہا   نہ رہا پر وہ مدعا نہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے مزے   جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
مومن اس بت کی نیم نازی پر   ہم کو دعوئے اتقا نہ رہا
جیسا مجھے آرام ترے ہاتھ سے آیا   اللہ کرے یوں ہی تھا سینہ مرا ہاتھ
دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا   الجھا ہے ان سے شوخ کے بند قبا کیا
کود کر گھر میں تو پہنچا میں ترے پر کیا کروں   دم نکل جاتا تھا کھٹکے سے برابر رات کو
یاد دلوائی تپش نے تیری شوخی وصل کی   مر گئے ہم دیکھ کر چین ہائے بستر رات کو
وہ ہو بغل میں تو بھی تو یاں نیند آ گئی   یہ سوچ ہو گیا نہ ہوا عدا کے خواب میں
نیند میں یارب ڈوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا   ہے زمیں سے روشنی افلاک نور افشاں تلک
شوق وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر   سو جا نہ کچھ مجھے شب مہتاب دیکھ کر
لگی پھبکی ہو سر زانوئے غم پر ہے کہ یاد آیا   کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ تھ تھ کر
اے سوزش سینہ مجھے وہ سینہ دکھا دے   کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے کمر بند
ہائے رے چھیڑ رات سن سن کے   حال میرا کہا کہ کیا صاحب؛
وحشت سے مری سارے احبا چلے گئے   آنا ہو گر تو آؤ کہ خالی مکاں ہوا اب
کشادہ دل پہ باندھی ہے کمر آج   نہیں ہے خیر آپ کے بند قبا کی
کیا جب التفات اس نے ذرا سا   پڑی ہم کو حصول مدعا کی
ہیں ایک نظر ہم تو دلے ذوق فزا عشق   بے چاشنی بوسہ دشنام نہ ہوگا
غیروں سے اس نے چھوڑی ہرگز نہ ہاتھا پائی   جب تک اجل کا صدمہ دو چار تک نہ پہنچا
اتنا تو نہ گھبراؤ راحت یہیں فرماؤ   گھر میں مرے رہ جاؤ آج آئے ہو کل جانا
غیر کو سینے کے پر سیب دکھلا دیا   تم نے کیا کچھ کسی کو اتنی بات پہ دکھلا دیا!

طنز و تعریض اور مکر عاشقانہ جو محبت کے خاص چونچلے ہیں اسی معاملہ بندی کے تحت میں آ سکتے ہیں۔ اھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کوئی بیٹھے پڑے دل کو بہلا میں — کس نے کی اس سے ہے ہکاری آج

پھرتے ہیں سو سودے جی میں ان کے سودے کتنے ہیں — کوٹھے پر وہ دھوپ میں اپنے بال کھلے سکھلاتے ہیں

شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم ان کے کوچہ میں — ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں

کرتے ہیں آوازیں فقیری، دیتے ہیں دستک سو سو بار — گھر میں پتھر پھینکتے ہیں زنجیر در کھٹکاتے ہیں

اب اختیار سے ہاتھا پائی ہو کیوں — نزاکت بس اتنے ناز میں ہو چکی!

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے — خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

کب ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھے گا کوئی — ان کو بے تابی ہو کیوں اس خواب کی تعبیر سے

ارمان نکلنے دے بس لے بیم نزاکت — ہاں ہاتھ تصور میں مرا زیر کمر ہے

اس ستم کیش نے یہ اپنے نصیبوں کا لکھا — خط بھی لکھا تو سلام اس میں رقیبوں کا لکھا

(سلہ ؍؍ ہو) دیکھیے غزل مسلسل گزشتہ صفحہ پر یا غزلیں جن کے مطلعے درج ذیل ہیں۔

توبہ ہے کہ ہم عشق بتاں کا نہ کریں گے — وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

منظور نظر غیر بھی اب ہمیں کیا ہے — لے دید تری دید سے دل پہلے بھرا ہے

گر نہیں ملتے ملوں گا اور سے — کیوں مجھے کیا پاس رسوائی نہیں

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

کیونکر نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

سلہ سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہیے دل اپنے راز داں کے لیے

شب ہجر میں کیا کیا ہجوم بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

اب اور سے بھی لگائیں گے ہم — جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے — وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

سہ سہ کے نادرست تری خو بگاڑ دی — ہم نے خراب آپ کیا اپنے کام کو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

اس میں شک نہیں کہ طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے مومن نے اس میں دادِ سخن خوب اور بہت کافی دی ہے؛ جب وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو متانت و بزرگی کا وہ جامۂ تصنع جو انھوں نے اوڑھ رکھا ہے شانوں سے کھسکتا نظر آتا ہے۔ شاعرانہ مکر کے مومن موجد ہیں اور خاتم بھی۔

شوخی[1] و ظرافت کہ فطری ہے نیز اس زمانہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ مومن کے ہاں بہت شوخ ادا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہم حال کہے جائیں گے سنیے کہ نہ سنیے — اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے

[2] ،، ،، ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں — عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

مرگیں آنکھوں میں تم سرمہ لگاتے کیوں ہو — خاک میں نام کو دشمن کے لگاتے کیوں ہو

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

[1] ہم حال کہے جائیں گے سنیے کہ نہ سنیے — اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے زاہد — یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار رہا ہے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق — ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

گو حد سے ہو پر اب بھی ہے وہی ناصح کی یاد — ناحق اس جان جہاں کو اک نظر دکھلا دیا

مے نہ اتری گلے سے جو اس بن — مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

جو ملیں تجھ سے بعد شوق وہ کیا ہوں گے نہ کر — بس مرے سامنے حوروں کا بیاں اے واعظ

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف — دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

مومن کو یہ ہے دولت دنیا و دوں نصیب — شب بتکدہ میں گزرے ہے دن خانقاہ میں

پی ہے جو حضرت مومن نے کبھی مضمضہ کو — آفتابے کئی ہنگام وضو کرتے ہیں

یہ کون کہے اس سے کہ ترک وفا نہ کیجے — کرتی ہی ذرا ناصح بیتابی اتنی

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم — لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

ہاں اب ترک عشق کا سہی گر مومن — یہ کیا سبب کہ ستاتے ہو بار بار مجھے

کرکے پھیلوں [illegible] — ہم نہ مانیں گے کہ مومن زاہد پارسا ہے

زیادہ ہو۔ واعظ، ناصح، اور زاہد کی جس کامیابی سے اور جن کھول کے دھجیاں انھوں نے اڑائی ہیں اور جس قدر جملے انھوں نے کسے ہیں اتنی کامیابی سے غالباً کسی نے نہیں برتے اور اس کی وجہ خاص کر یہ تھی کہ ان کے دل میں بھی سخت اور کٹر ناصح بسا ہوا تھا

مومن کی شاعری میں ان کے تعقیدی طرز کے علاوہ ایک دو اندرونی باتیں بھی حائل تھیں یعنی ان کی علمیت[1] اور مذہبیت۔ علمیت کی وجہ سے وہ اکثر اوقات کسی نہ کسی علم کی اصطلاح لے آتے ہیں جس کی وجہ سے شعر کا سمجھنا یا شعر کا حل مشکل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کی شعریت ان کی علمیت پر غالب ہے پھر بھی جب کبھی وہ شعر بناتے ہیں تو یہ علمیت ضرور سامنے آ جاتی ہے۔ تصوف میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے (اور اسی لیے ان کا معشوق زمین ہی پر رہتا تھا ورنہ وہ شعر میں مذاق زمانہ کے مطابق خوب کھپ جاتا اور یہ خشک علمیت گراں نہ گزرتی) مذہبیت دوسرا روڑا تھا۔ تمام خاندان ان کا سخت قسم کا مسلمان، خود موحد۔ عامل بالحدیث اور بیعت کے بعد اور بھی سخت ہو گئے تھے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر مذہبی اصطلاحیں آ جاتی ہیں اور اکثر بندا در ظاہر دوسرے مذاہب والوں پر سودا کی طرح چوٹیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں مناظرہ یا وعظ میں ہوں تو لطف دیتی ہیں۔ شاعری میں ذرا اُکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔

طرز ادا مومن کا خاص گرا اور جوہر ہے۔ جب کبھی رعایت اور صنائع کے پیچ سے اس طرف آتے ہیں تو اپنے خاص رنگ میں ہوتے ہیں۔ ندرت اسلوب کی خاص کر ان کے یہاں بے حد فراوانی ہے کبھی نادر تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں کبھی کسی امر کو مسلم مان کر اس کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتے ہیں

---

[1] صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے — رجعت قہقری شمس و قمر آخر شب
کیوں نہ مجھ سے رہے وہ ہوش اب زیادہ ترکہ — بدگماں ہے سبعہ سیارہ کی تاثیر سے
علاج خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا — وہ کافر گور میں مومن مرا لاشا نہ لاتا ہے
ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ — آکے میری نعش پر وہ رو گیا
مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا — ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم
ہم بندگی بت سے ہوتے نہ کبھی کافر — ہو جائے اگر مومن موجود خدا ہوتا

وغیرہ وغیرہ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی ندرت اسلوب دقیق زیادہ تھی بجائے لطیف ہونے کے البتہ شوخیٔ ادا میں کافی خوشگوار شوخیاں دکھلائی ہیں۔ ان کی جدید فارسی ترکیبیں ان کی مشکل پسند طبیعت اور فارسیت کا نتیجہ ہیں۔ ان کے کلام میں جگہیں ملتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اکثر خوب ہیں۔ لیکن بیشتر لائی ہوئی ہیں نہ کہ آئی ہوئی اسی لیے رواں اور رائج نہ ہو سکیں۔ ان کی ترکیبوں اور غالبؔ کی ترکیبوں میں بھی فرق تھا۔ جدید ترکیبیں وہ بھلی معلوم ہوتی ہیں جو جوشِ تصور سے بن جائیں نہ وہ جو ایک ریاضی داں یا انجینیر سوچ کر نکالے۔ شاعری میں عموماً ترکیب کی جدت جوشِ تصور اور وسعتِ تصور کو چند الفاظ میں محصور کر دینے کی تدبیر ہوا کرتی ہے خواہ کسی تشبیہ کی بابت ہو یا واقعہ کی بابت۔ مومنؔ کا جوشِ تصور تعقید پسند تھا نہ کہ وسعت پسند۔ اس لیے ان کی تشبیہوں میں حرکت نہیں ہے اور انجماد کی وجہ سے ان کی تراکیب بھی روشن اور اتنی دلکش نہیں ہیں جتنی غالبؔ کے یہاں۔

مومنؔ اپنے تخلص سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ مومن کی رعایت سے بت پرستی اور کافر پرستی کے مضامین نہایت آسانی اور خوبی سے لائے جا سکتے ہیں۔

مومن عرصے تک روشناس نہیں ہو سکے جس کی وجہ خاص ان کی تعقید تھی۔ اس کے علاوہ انھیں حالیؔ یا آزادؔ جیسا شاگرد نہ ملا کہ موجودہ طرزِ تنقید کے مطابق انھیں اجاگر کرتا بلکہ صاحب آب حیات و گلستان بے خزاں نے تو ان کے کمالات پر شروع میں پردہ ہی ڈال دیا تھا لیکن اب جبکہ مومنؔ روشناس ہوئے ہیں انھیں غالبؔ کے برابر ٹھہرایا جاتا ہے یہ بھی زیادتی ہے۔ دونوں کے طبائع مختلف۔ افتادِ مزاج جداگانہ، ایک کر کے توبہ کرنے والا، ایک توبہ کو اپنی ہتک سمجھنے والا۔ ایک کٹر مومن مسلمان دوسرا صرف انسانیت میں اعتقاد رکھنے والا۔ تغزل کا نظریہ بھی جداگانہ۔ مومن کی غزلوں میں محض تغزل ہے غالبؔ کے یہاں گوناگوں جذبات کے علاوہ تصوف۔ اعتقادات و فلسفہ بھی ہے یعنی تخیل کے میدان میں ایک محدود ہے دوسرا محدود ایک کے یہاں بے چینیٔ روح ہے دوسرے کے یہاں محض بے چینیٔ دماغ۔ ایک کا تخیل تمام نفسیاتِ انسانی کی سیر میں مصروف ہے دوسرے کا محض ایک ہی جذبے کے تلطف میں گرہ در گرہ۔ ایک کی زندگی تمامتر بے چینی خیالی، جذباتی، اعتقادی اور دنیا کی طرف سے دوسرے کی زندگی تمامتر منظم حسن

مالی حیثیت سے مطمئن تھے۔ جذبات آسودہ، اعتقادات مستحکم اور دل ظاہر ہے کہ جہاں وہ دماغ پریشان کہاں یہ روح مطمئن اور وجہ یہی ہے کہ مومن تھوڑا بہت لفظی صناعی سے کہ مثل علائق دنیوی سے ہو وابستہ ہے اور وہ روح بے چین کہ آزاد تھی اس مایا میں نہ پھنس سکی مومن اگر عمر طبعی پاتے تب بھی غالب تک نہ پہنچ سکتے اکثر جگہ یہ صحیح ہے کہ ہم طرحی غزلوں میں مومن کے اشعار غالب سے بہت کم نہیں معلوم ہوتے یا اکثر فارسی ترکیبیں مومن کی بھی کچھ کم عمدہ نہیں ہیں لیکن ان اشعار میں خوبی محض فن کی ہے جس میں مومن اس زمانے کے معیار کے مطابق غالب سے کم نہ تھے لیکن تنوع مضامین اور طرفگی ادا کی متابلۃً کمی کی وجہ سے اب مومن و غالب کے مقامات نہایت آسانی سے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ دونوں کی دماغی قابلیتیں عوام کی سطح سے بہت بلند تھیں ایک مسلم حقیقت ہے لیکن روش دونوں کی جداگانہ تھی ورنہ ایسے معاملہ بندی کی باتیں تو ہر عاشق شاعر کے یہاں ایک ہی جیسی ملیں گی۔

نورالحسن ہاشمی

فانی کی موت

ایک منظر

(اندھیری رات ہے آسمان تمام سیاہ نظر آرہا ہے۔ اس سیاہی میں صرف دو تارے جگمگا رہے ہیں۔ ایک تارہ کہتا ہے)

ایک تارہ۔ ہے منور ظلمت سے میرے نور میں یہ آب تاب — منظر تاریک ہے یا روشنی کا انقلاب!

سرفرازی کو مری تھامے ہوئے دوش علم — منزل حسن و لطافت کی طرف میرے قدم

آئینہ ساز نظر ہے جلوہ سامانی مری — جگمگاتی ہے تجلی بن کے حیرانی مری

صبح کے سیمیں اجالے سے لرز جاتا ہوں میں — چھانو میں اسرار دو عالم کے چھپ جاتا ہوں میں

دوسرا تارہ۔ رات کی تاریکیوں میں نور کا پیغام ہوں — میں کسی بے تابیٔ آغاز کا انجام ہوں

جل رہی ہے مجھ میں شاید آہ و فریاد ازل — میری جان زار سے قائم ہے بنیاد ازل

ہر نفس لرزاں ہے میرا اہتمام زندگی — جھومتا ہے عرش پر میرا نظام زندگی

آنکھ کی مانند ہر لحظہ جھپک جاتا ہوں میں — اشک غم کی طرح دامن میں ٹپک جاتا ہوں میں

(یہ کہہ کے تارہ ٹوٹتا ہے اور سیاہ بلندیاں طے کرتا ہوا نیچے آتا ہے۔ زمین کے ایک رقبے لیکن سیاہ پہاڑ پر ایک جنازہ گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جسے دو پیکر کندھوں پر اٹھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک پیکر کا نام زندگی ہے دوسرے کا نام موت۔ موت کا پیکر یہ زمزمہ کرتا ہے۔)

موت کا پیکر۔ تھم گیا وہ سینۂ بیتاب جس میں راز تھا — یہ کوئی دریا تھا یا ٹوٹا ہوا اک ساز تھا

چند سانسوں کے تموج میں تھا اک طوفان غم — اک دل مایوس اور فریادیٔ ذوق ستم

بند ہے وہ آنکھ جس میں حسن کا پیغام تھا — ختم ہے وہ زیست جس میں عشق کا انجام تھا

بند ہیں وہ گوش جو سنتے تھے آواز سروش — ہو گئے دنیائے رنج و غم کے افسانے خموش

زندگی کی گود میں پالا ہوا اک جسم ناز — ہو گیا افسوس بیداد فنا سے گداز

وہ تجلی کہ جس پہ نازاں تھی فضائے کائنات — بن گیا اس وقت اک [illegible] حیات

[illegible] — [illegible]

داغِ دل جس کے نمایاں اہلِ محشر کیلیے　　جو ستارے توڑتا تھا دیدۂ تر کے لیے
وہ فغاں جس میں نظر آتا تھا دل صیاد کا　　وہ صدا جس میں تھا نغمہ حسرتِ بیداد کا
آج دنیائے خموشی کا فسانہ بن گئی!　　موت کے پہلو میں آنے کا بہانہ بن گئی!

(زندگی یوں ماتم کرتی ہے)

زندگی [illegible] ہستی کا آئینہ غم دیتا نہ دیکھ　　مرگ فانی کا شبِ تاریک میں جلوہ نہ دیکھ
اس میں آئیں گی نظر تجھ کو ہزاروں عبرتیں　　اک سیہ چادر نہیں ہیں زندگی کی حسرتیں
جا رہی ہے اوڑھ کر اس کو وہ خودداری کی لاش　　موت کے دامن میں خوابیدہ ہے دل کا ارتعاش
اہلِ دنیا میرے شعلے کو بجھائیں کس طرح　　بے بصر اک گوہرِ نایاب پائیں کس طرح
جو شبِ دیجورِ ہستی میں فروزاں ہی رہا　　ریشمی دامن میں دنیا کے جو غلطاں ہی رہا
حسرتیں بیدار تھیں جس کی صدائے ناز سے　　جس نے دنیا کو پکارا درد کی آواز سے
جس نے سنجیدہ بنایا ہستیٔ ناکام کو　　جس نے زندہ کر دیا تکلیف کے انجام کو
نطقِ انسانی کو بخشے جس نے کچھ راز و نیاز　　بن گیا غم جس کے نغموں سے پیامِ دلگداز
رکھ دیا سر جس نے رو رو کر ازل کے دوش پر　　سو گیا جو آج میرے سینۂ خاموش پر!

(یہ زمزمہ سن کر ٹوٹتا ہوا تارہ اس جنازہ کے اطراف ایک نور کا حلقہ سا ڈال دیتا ہے۔ اندھیری فضا میں نظر آتا ہے کہ ایک روحِ سفید اس حلقہ میں بلند ہو رہی ہے۔ موت، زندگی اور آسمان کا مسکراتا ہوا تارہ مل کر گاتے ہیں)

اُٹھ گئی آج بزمِ راز و نیاز　　بے صدا ہو گیا ہے پردۂ ساز
زندگی مختصر تھی انساں کی　　ڈھونڈ لی اس نے راہ دور و دراز
نغمۂ درد اس قدر بے تاب　　آہ و فریاد، اتنی سینہ گداز
مطربِ خوش نوا تری مرضی　　چھوڑ دی تو نے بزمِ درد نواز
ہم سمجھتے ہیں تیری ہستی کو　　آ رہی ہے سروش کی آواز
"آج روزِ وصالِ فانی ہے　　موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز"

محمد عبد القیوم خاں باقی

تجلیات

یاد تری شراب ہے، ذکر ترا سرود ہے!
کیفِ طرب میں موجزن میرا یہ وجود ہے؛
اپنی ہی دُھن میں عرش سے دور نکل گیا ہوں میں
اتنی بلندیوں پہ بھی مجھ کو غمِ صعود ہے!
اس میں کہاں سرور و نور، آگ ہی آگ ہے ہوس
مثلِ سموم ہر نفس، آہ بہ رنگِ دود ہے!
آنکھ ہو حق شناس اگر، آتا ہے تو ہی تو نظر
ورنہ تمام کائنات بتکدۂ نمود ہے!
پچھلے پہر کی چاندنی نور میں ہے دھلی ہوئی
عرشِ بریں سے پے بہ پے قدسیوں کا درود ہے!
فکرِ دل و جگر نہ کر عشق میں جان سے بھی گزر
اس میں کہیں زیاں نہیں اس میں زیاں بھی سود ہے!
غرقِ سرور و نور ہوں جام و سبو سے دور ہوں
میرے لیے کھلا ہوا میکدۂ شہود ہے!

اختر صہبائی

اس دور میں!

ہر شعر مرا اصل میں تاریخِ امم ہے
مجھکو مری آفاق نوردی کی قسم ہے

اُس مردِ قلندر کو سڑی کہتی ہے دنیا
اس دور میں جو طالبِ انصاف و کرم ہے

ہر روح کی خلوت میں جو آباد ہے ابتک
وہ خالقِ اکبر بھی تصور کا صنم ہے

حل کرتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخنور
جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے

خلوت میں یہ عفریتِ تعیش ہے مگر اب
منبر پہ بھی استادہ ہے اور آنکھ بھی نم ہے

ہر شخص ہے سنگین حقایق سے گریزاں
ہر فرد کو محبوب یہی شیوۂ رم ہے

جو قیصر و فغفور کے آگے نہ جھکا تھا
مدت ہوئی وہ سر درِ الحاد پہ خم ہے

جذبات میں جدت نہ خیالات میں وسعت
تحریر میں رعنائی نہ تقریر میں دم ہے

یخ بستہ ہے نوخیز جوانی کا ارادہ
اور ڈھلتے بڑھاپے پہ گرانباریٔ غم ہے

مشرق کی نگاہوں میں ہے ہم پلۂ قرآں
وہ بات جو مغرب کی کتابوں میں رقم ہے

جینے کے لیے اذن ہے قانون کا مطلوب
اللہ ستم ہے مرے اللہ ستم ہے!

احمد ندیم قاسمی

نوائے سحر

زندگی میں کوئی محشر بکنار آ جائے
قلب لرزاں کو کسی طور قرار آ جائے
سینچتا ہوں دل خاک اشک سحرگاہی سے
شاید اجڑے ہوئے گلشن میں بہار آ جائے

دل کی قندیل ہے روشن نہیں قوموں کا نظام
بندۂ سود و زیاں ہے شب ہستی کا غلام
زندگی میں اثر دانشِ امروز نہ پوچھ
تیری دنیائے تجلی پہ ہے چھائی ہوئی شام

دل سو رہے ہیں اک دیس میں رہتا ہوں میں
سختیاں گردشِ ایام کی سہتا ہوں میں
قصۂ درد و الم پچھلی شبوں کو اکثر
چپکے چپکے ترے افلاک سے کہتا ہوں میں

ساقیٔ دہر ہے تو مجھ کو تنک جام نہ کر
اس خرد زار میں آئینِ جنوں عام نہ کر
شرم رکھ لے مری تقدیر کی اے روز جزا
ایک بدنام زمانہ کو تو بدنام نہ کر

تیرا پیغام سناتے ہیں ستارے مجھ کو
کرتے ہیں رات کو آنکھوں سے اشارے مجھ کو
توڑ دیتا ہے جنوں جب کہ تصور کے حدود
کھینچ لیتے ہیں سمندر کے کنارے مجھ کو

ضربِ غم سے ابھی دستورِ نفس چاک نہیں
حالِ موجِ شررِ خس و خاشاک نہیں
تیری تقدیر نے بخشا غم پایاں بھی مجھے
کہ دل مردہ مزار دار غم پاک نہیں

فضل حسین کیف اسرائیلی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کتاب العلم (جزاوّل):- ناشران دی ایسٹرن پبلشنگ اینڈ اسٹیشنری لمٹیڈ۔ لاہور صفحات ۵۰۰ اسائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت ۱۲/؁۔ طباعت و کتابت کاغذ نفیس مع متعدد یک رنگی و سہ رنگی تصاویر۔

محمد سعید بیگ و محمد اسمٰعیل صاحبان نے ایک بہت بڑے سرمایے سے یہ کتاب 'بک آف نالج' کی وضع کی نکالی ہے۔ خوبی طباعت اور اشاعت کی نفاست کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہر علم کی معلومات ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائیں۔ کتاب العلم کا یہ پہلا حصہ ہے بقیہ حصے بھی اسی نمونے پر تیار کیے جائیں گے۔ فہرست مضامین سے اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ کائنات۔ معدنیات۔ حیاتیات انسانیات۔ ملکیات۔ کیمیا و طبیعیات، ایجادات۔ فنون لطیفہ۔ تاریخیات۔ زرعیات، ادبیات۔ نظمیات۔ دینیات قصہ جات۔ شخصیات۔ استفسارات۔ میکانیکیات۔ تفریحیات۔ صحتیات اور اقتصادیات۔ دراصل یہ کتاب انگریزی کی 'بک آف نالج'، 'ورلڈ آف ونڈرز'، 'ورلڈ آف سائنس' وغیرہ عام معلومات کی قسم کی کتابوں سے لکھی گئی ہے۔ زیادہ تر تصاویر اور مضامین ان ہی سے لیے گئے ہیں لیکن اصطلاحات کا ترجمہ بہت ہی معرب زبان میں کیا گیا ہے۔ یوں بھی عبارت میں عربیت اور فارسی انشا پردازی بہت زیادہ ہے۔ عموماً ایسی کتابیں عوام لڑکوں بچوں اور طالب علموں کے لیے زیادہ اور خواص کے لیے کمتر مخصوص ہوتی ہیں اس لیے زبان ایسی رکھنی چاہیے جو بہت سادہ اور آسان ہو تاکہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکے اور معمولی پڑھا لکھا بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکے۔ موجودہ اسلوب بیان سے زیادہ لوگ کم مستفید ہو سکتے ہیں۔ امید ہے آئندہ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایک بات اور اس کتاب میں نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی مذہبیت ہے کہیں جگہ علمی مضامین میں آدم و حوا کا قصہ دہرایا گیا ہے یا دیگر مذاہب اور اسلام کے نقطۂ نظر دیے گئے ہیں۔ خالص علمی مضامین میں (اور پھر جبکہ یہ کتاب ہر فرقے کے لیے ہے صرف مسلمانوں

سکے لیے نہیں) مذہب کو جگہ جگہ بیچ میں نہیں لانا چاہیے تھا مثلاً عمرانیات، ادبیات، وغیرہ میں بہتر ہوتا اگر دینیات کے عنوان ہی میں یہ مباحث رکھے جاتے یا اسلام ہی کے متعلق لکھنا تھا تو اسلامیات کا موضوع وضع کیا جاتا۔ دیگر لحاظ سے کتاب کی افادیت میں کلام نہیں ضروری ہے کہ یہ کتاب ہر لائبریری میں ہو۔ کتاب پر لاگت تو یقینی زیادہ آئی ہوگی پھر بھی قیمت کچھ زیادہ ہے۔

اسلام اور مسیحیت — از ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری ملنے کا پتہ دفتر اہلحدیث امرتسر۔ صفحات ۲۴۴۔ سائز ۲۲×۱۸۔ قیمت عہ۔ کاغذ، کتابت و طباعت معمولی۔

مولانا موصوف کی یہ کتاب عیسائیوں کی کئی کتابوں کے جواب میں لکھی گئی تھی اور بہت سی ان غلطیوں کو دلائل کے ساتھ رد کیا گیا ہے جو عیسائی مبلغین پھیلاتے رہتے ہیں۔ عیسائیت کا فتنہ مسلمانوں کے لیے پنجاب میں خصوصیت سے بڑے خطروں کا حامل ہے ضرورت تھی کہ ان مشنریوں کے خلاف جو وہاں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پھیلاتے رہتے ہیں سخت جد و جہد کی جائے۔ اور ان کو ان ہی کے دلائل سے بند کر دیا جائے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب عرصے سے اس جد و جہد میں مصروف ہیں خدا انھیں ثواب عظیم عطا کرے مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کی تصانیف خرید کر ان کو زیادہ سے زیادہ کام کرسکنے کا موقع دیں۔

مسئلہ قومیت — از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور سائز ۲۰×۲۶ صفحات ۱۴۶، قیمت بے جلد عمر کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

مولانا موصوف نے یہ مقالہ قومیت کے مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے لکھا ہے کہ اصل مقصد قوم اور قوم پرستی سے کیا ہے اور اسلام میں قومیت کے کیا معنی ہیں۔ جماعت، قوم اور امت کے معانی میں کیا فرق ہے اور مسلمانوں کی قومیت کن معنوں میں دوسروں کی قومیت سے جداگانہ ہے۔ یہ مقالہ دراصل پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات یہ ہیں۔ قومیت اسلام، کلمہ جامعہ، متحدہ قومیت اور اسلام، کیا ہندوستان کی نجات نشنلزم میں ہے، اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم ہر موضوع کو بڑی وضاحت اور انشراح سے واضح کیا ہے تا بقدر کچھ

ہفت اورنگ — معاصر از اقبال حسین صاحب انصاری چونیدی ملنے کا پتہ ابو محمد انصاری محلہ سیاہ چونیدی سائز ۲۰×۲۶ صفحات ۲۰۴ قیمت عمر کاغذ کتابت و طباعت معمولی۔

یہ سات مضمونوں کا مجموعہ ہے جو فارسی ادب سے متعلق مضامین پر لکھے گئے ہیں۔ فہرست مضامین یہ ہے۔ زرتشت، ایران میں شاعری، ادب، فردوسی طوسی، چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی۔ صوفیانہ لٹریچر، لسان الغیب، شیخ علی حزیں۔ ان مضامین میں کوئی داد تحقیق نہیں دی گئی ہے لیکن جو کچھ ہر موضوع پہ موجود تھا اس کو ایک جگہ جمع کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور اس لیے فارسی ادب کے طالب علموں کے لیے ایک مفید چیز ہے۔

ذکر و فکر:۔ از مقصود زاہدی ملنے کا پتہ نمبر ۱ زاہدی برادرز زاہدیان میرٹھ۔ سائز ۲۲×۲۰/۱۶ صفحات ۱۲۰ قیمت ۸ / کاغذ معمولی، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ مقصود صاحب کے چند سماجی، سیاسی اور نفسیاتی چھوٹے چھوٹے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں وہ مطالعے خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہیں جو نفسیاتی جزئیات نگاری پر مبنی ہیں۔ مثلاً میلے کو، بندگی و بیچارگی، فریب خیال، ڈاکٹر نیگی وغیرہ۔ مقصود صاحب کے بیان میں ہلکا سا طنز ہے جو ہمارے سماجی تکلفات کا پردہ اٹھانے میں بہت کامیاب ہوتا ہے۔ مقصود صاحب کی قوت مشاہدہ باریک بیں ہے اور واقعیت نگاری کے لیے یہی چاہئے۔ ہمیں امید ہے کہ مقصود صاحب اس ذکر و فکر کو جاری رکھیں گے اور بہت جلد وہ اپنے لیے اردو ادب میں اچھی جگہ بنا سکیں گے۔

میرے نغمے:۔ از سلام مچھلی شہری ملنے کا پتہ اردو سوسائٹی دفتر ماہنامہ "اضطراب" جاپلنگ مارٹ نظیر آباد لکھنؤ۔ صفحات ۱۰۲، سائز ۲۲×۲۹/۱۶ قیمت ایک روپیہ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی تھی پھول اور انگارے۔ اول الذکر میں رومانی نظمیں اور دوسرے حصہ میں انقلابی نظمیں شائع ہونا تھیں لیکن سرکاری اجازت نہ ملنے کے باعث صرف پہلا ہی حصہ شائع ہو سکا ہے۔

سلام مچھلی شہری صاحب اردو کے ان نوجوان شعرا میں سے ہیں جو ادب کو زندگی سے قریب تر دیکھنا چاہتے ہیں جو تمام نظام معاشرت میں مساوات کے حامی ہیں اور جو موجودہ سیاسی تنظیم کو پلٹ کر ایسے نظام کے حامی ہیں جس میں ہر ایک کو برابر کے مواقع ملیں نہ کوئی ظالم ہو نہ مظلوم نہ کوئی آقا ہو نہ غلام

شکوئی سرمایہ دار ہو خواہ کوئی مزدور، سلام کی گہری تخیل اور شدت احساس ان موضوع کے لیے یقیناً مناسبت رکھتی ہو۔ ان کی سیاسی نظمیں کافی معروف ہیں، زیر نظر رومانی نظموں میں بھی ان کا شدت احساس بدرجہ اتم نمایاں ہو۔ عید کی مبارکباد، گیا ایسا ہی ہوا کرتا ہو، افسانہ در افسانہ، محبت کے گیت، بھلا دو، دہان، حسین تعارف اچھے مطالعے ہیں اور ہمیں توی امید ہو کہ یہ نوجوان شاعر آئندہ اپنے آرٹ میں اور ترقی کرے گا

قاعدہ مفتاح القراۃ:- از حکیم عبداللہ رشید نواب رشد کی مطبوعہ ایس ایم حسن ستارہ ہند پریس لمیٹڈ نمبر ۲۵ نیا پوکھر لین کلکتہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۴۴، قیمت درج نہیں۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔

فن تجوید پر یہ قاعدہ حکیم عبداللہ رشید صاحب نے بڑے غور و خوض نیز ان تجربات کے بعد شائع کیا ہو جو موصوف نے مسلم ہائی اسکول اریشسٹ میں کیے۔ اس میں مختلف نقشوں کے ذریعہ طلبا کو حروف کے جو شان کے صحیح تلفظ اور صحیح آوازوں کے متعلق صحیح رہبری کی گئی ہو۔ طلبا کے لیے بہت مفید چیز ہو۔ امید ہو عربی اور فن تجوید کے طالب علم اس سے ضرور استفادہ کریں گے۔

پارہ عم:- مرتبہ شعبہ اشاعت قرآن ادارہ دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۹۲ قیمت ۸ر کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ پارہ عم دارالاسلام نے مع ترجمہ و تفسیر و معانی الفاظ شائع کیا ہو۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہو کہ ہر لفظ کے معنی الگ الگ بھی دے دیے ہیں اس سے عربی دانی میں بڑی مدد مل سکتی ہو۔ امید ہو کہ ادارہ دارالاسلام پورا قرآن شریف اسی اہتمام سے شائع کر سکے گا طلبا اور عوام کے لیے یکساں مفید ہو۔

شمیم کے سو شعر:- مرتبہ سید جمیل الدین ملنے کا پتہ عثمانیہ بکڈپو دکان نمبر ۱ محمد علی بلڈنگ بمبئی نمبر ۳ صفحات ۴۸ تقطیع چھوٹی قیمت ۴ر کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

جناب سید مظفر حسین صاحب شمیم کے یہ سو منتخب اشعار جمیل الدین صاحب نے پیش کیے ہیں۔ مختصر پیش لفظ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب نے لکھا ہو۔ انھوں نے صحیح تحریر فرمایا ہو کہ شمیم صاحب کے کلام میں صداقت نیز معنوی گہرائی بھی ہو اور دل پرسوزی بھی۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

سینے میں اک چراغ سا جلتا گیا جانے کب بجھ گیا   پوچھ رہے ہو دل کی حالت صدیاں بیت گئیں

بھیگے ہوئے یہ بادل مہکی ہوئی یہ راتیں   یاد آگئیں پھر مجھ کو بھولی ہوئی برساتیں
لب پہ نالہ نہیں، شکوہ نہیں فریاد نہیں   سچ تو یہ ہے کہ ترا کوئی ستم یاد نہیں

سالنامہ نظامیہ:۔ مرتبہ ابو الخیر کنج نشیں۔ ملنے کا پتہ ادارہ ترقی تعلیم اسلامی حیدر آباد دکن صفحات ۹۶ قیمت ۸ سائز ـــــ کتابت طباعت اچھی کاغذ معمولی۔

حیدر آباد دکن کی ایک قدیم مذہبی درسگاہ کا نام جامعہ نظامیہ ہے چند سالوں سے اس جامعہ کا یوم تاسیس منایا جاتا ہے۔ اس سال فروری ۱۹۴۱ء میں منایا گیا۔ اس سلسلے میں جامعہ نظامیہ کی علمی مذہبی خدمات نیز کارگزاریوں اور حالات میں جو مقالے اور مضامین ترتیب دیے گئے وہ اس رسالہ میں درج ہیں۔ چند مضامین اس سلسلے کے علاوہ بھی شامل کیے گئے ہیں مثلاً تاریخ قراۃ و تجوید آزادی نسواں اور مسئلہ حجاب و حدود دستر و نظر، شعر العرب (جو پہلے کتابی صورت میں بھی شایع ہو چکا ہے) وغیرہ جو قابل مطالعہ ہیں۔

نصاب تعلیمی مرکز:۔ انجمن خدمت خلق، عربک کالج دہلی

تعلیم بالغان کے اس بڑے مرکز نے اپنا نصاب حال ہی میں شایع کیا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرکز کتنی تن دہی اور جاں فشانی سے بلا کسی معاوضے کے اس کام کو کامیابی کے ساتھ کر رہا ہے۔ تعلیم اور سامان تعلیم سب مفت مہیا کیا جاتا ہے۔ مرکز میں کل چار جماعتیں ہیں ہر جماعت کے نصاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ لکھائی پڑھائی، حساب اور عام معلومات۔ اصل میں خواندگی کا نصاب تو پہلی جماعت میں ختم ہو جاتا ہے باقی اگلی تین جماعتوں میں ان کی مشق کو مستحکم کیا جاتا ہے اور شوق کو ابھارا جاتا ہے۔

ایک اخبار، ایک دار المطالعہ، ایک لائبریری اور ایک انجمن بھی قایم ہے۔ ضرورت ہے کہ صاحب استعداد حضرات ضرور حتی الوسع اس کی مالی امداد کریں نیز لوگ اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھائیں۔ نصاب مندرجہ بالا پتہ پر کارڈ لکھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شیطان کا انتقام (دور حاضرہ کے علمی، ادارتی اور سیاسی رجحانات پر ایک تیز و تند اور تلخ تبصرہ) از جلال الدین اشک قیمت ۸ صفحات ۹۲۔ پتہ درج نہیں۔

سلک گوہریں (ایک غنائی تمثیل) از جلال الدین اشک قیمت ہ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

اشک صاحب کی پہلی کتاب اس تلخی اور مایوسی کی آئینہ دار ہے جو اس دور کے اکثر ذہین اور ہونہار نوجوانوں میں پائی جاتی ہے اور جو دراصل اس دور کی روح ہے۔ اس میں انھوں نے موجودہ دنیا اور اس کی تمام برکتوں کو شیطانی بتایا ہے اُن کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان باوجود بہت سی نعمتوں کے چونکہ مسرت سے محروم ہو گیا ہے اس لیے وہ اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتا ہے۔ مسرت سے محرومی اشک صاحب کے نزدیک شیطان کا کرشمہ ہے۔ انسانی اعمال کی ذمہ داری اتنی آسانی سے شیطان پر نہیں رکھی جا سکتی۔ دراصل ملکوتیت اور شیطنیت خود انسان کے اندر موجود ہے۔ اس کش مکش سے انسانی زندگی کی دلچسپیاں قایم ہیں۔ "ارتسامات" کے تحت میں ایک صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اشک صاحب کا شیطان کا استعمال اچھوتا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں اگر دوسرے ادبیات سے قطع نظر کی جائے تو بھی اردو میں سجاد انصاری، فلک پیما۔ رشید احمد صدیقی، اقبال ان سب کے ہاں یہی تصور ملتا ہے۔ دراصل اردو میں سب سے پہلے شیطان کو سجاد انصاری نے محرم راز کی حیثیت سے پیش کیا۔ اقبال اسے خواجہ اہل فراق بھی کہتے ہیں اور اس کے "سوز نفس سے کار عالم کی استواری" بھی عبارت سمجھتے ہیں۔

اشک صاحب نے زیادہ سے زیادہ اپنی پوری کتاب میں اقبال ہی کے بعض افکار کو واضح کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شعر و ادب، تنقید، فلسفہ، آرٹ، عورت سب اس لیے گردن زدنی ہیں کہ بعض شیطانوں نے انھیں اپنی اغراض کے پورا کرنے کا آلہ سمجھا ہے۔ یہ ذہنیت دلچسپ ضرور ہے۔ اور پرخلوص بھی۔ مگر بالکل صحیح نہیں۔ ایک مسرت وہ ہوتی ہے جو احساس زیاں نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک وہ ہے جو سود و زیاں دونوں سمجھنے سے۔ دراصل انسان پہلے احساس زیادہ رکھتا ہی نہ تھا اس لیے اگرچہ وہ خوش تھا مگر اس کی خوشی بچوں کی سی تھی۔ وہ صرف خوش رہنے کے لیے نہیں آیا، وہ رنج و راحت، بلندی و پستی کو ہموار کرنے کے لیے آیا ہے۔ اقبال کے ابلیس نے جو دنیا کی تعریف کی ہے وہ دراصل اشک صاحب کے تصور سے زیادہ حقیقی ہے۔

سوز و ساز و درد و رنج و آرزو و جستجو

وہاں دیکھیے تو مسرت کی کمی اتنا بڑا جرم نہیں رہ جاتی بلکہ اس سے محرومی اس بے حسی سے بہتر ہو جو بعض وقت مسرت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہو۔

دراصل زندگی پر ایک بہتر تبصرہ اشک صاحب کی دوسری کتاب "سلک گوہر" میں ملتا ہو۔ اگرچہ یہ بہت مختصر ہو۔ اس میں شاعری، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور اس قسم کے دوسرے سانچوں سے آزاد طبع ہو۔ فنائی شاعری اردو میں اب شروع ہوئی ہو۔ اس لیے اس کی اٹھان ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ دیکھنی چاہیئے اشک صاحب کے اشعار میں شعر کی روح ضرور موجود ہو مگر ابھی طریقۂ اظہار پر قدرت حاصل نہیں ہوئی اور بعض مصرعے اور شعر اعتراف عجز کی زندہ مثالیں ہیں۔

دونوں کتابیں توجہ سے پڑھنے کے لایق ہیں۔ شیطان کا انتقام پرجوش نثر میں لکھا گیا ہو۔ کاش خیالات اور گہرے اور پختہ ہوتے تاکہ سطحیت بالکل نہ آنے پاتی۔

ہمارے مزدور۔ از محمد عبدالقادر صاحب لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی صفحات ۷۰، قیمت درج نہیں کاغذ، کتابت و طباعت بہت اچھی۔

انجمن ترقی اردو نے اپنے پروگرام کے ماتحت یہ چھوٹا سا رسالہ اس لیے نکالا ہو تاکہ عام لوگ معاشیاتی مسائل سے اچھی طرح باخبر ہو سکیں۔ عبدالقادر صاحب نے یہ رسالہ بڑی تحقیق سے مرتب کیا ہو اور اس میں وہ تمام معاشیاتی مسائل آ گئے جو ہندوستان کے ایوان قانون سازی میں منظور ہو کر عمل پذیر ہوتے رہے ہیں۔ آکسفورڈ پریس کی طرح یہ عام فہم طریقہ علوم پھیلانے کا یقیناً بہت مفید اور اچھا ہو۔ امید ہو کہ انجمن مذکور اس قسم کے دیگر رسائل بھی ملک کے سامنے جلد رکھ سکے گی۔ اگر آئندہ زبان اور آسان ہو تو بہتر ہوگا اور عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

رسالے:-

اضطراب:- ایڈیٹر مسعود اختر جمال۔ دارالاشاعت دفتر اضطراب پانڈے حویلی بنارس صفحات ۴۸ چندہ سالانہ ۳ روپے کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جگر مرادآبادی صاحب کی نگرانی اور مسعود اختر جمال صاحب کی ادارت میں کچھ عرصہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اس عرصہ میں اس نے کافی ترقی کر لی ہے۔ مضامین، افسانوں، نظموں اور غزلوں کا اچھا مجموعہ ہوتا ہے بعض اچھے مضامین دوسرے رسالوں سے بھی مستعار لیے جاتے ہیں اس صورت سے اس کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔ زیر نظر نمبر جولائی و اگست کا ہے۔ اس میں بھی اچھے اچھے رسالوں کے اچھے اچھے ادبی و علمی مضامین مجتمع ہیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ انگریزی میں کئی رسالے اس قسم کے نکلتے ہیں جن میں تمام دیگر رسالوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں اس نچوڑ کے علاوہ اس کے اپنے مضمون نگاروں کے بھی مضامین اور نظمیں ہیں اگر یہی رفتار اضطراب کی رہی تو امید ہے کہ وہ اپنی جگہ مضبوط تر پیدا کرے گا۔

سُہیل (خاص نمبر) مدیران عارف سنبھاردی و قیصر عثمانی صاحبان۔ صفحات تقریباً ۲۱۶۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ سہیل گیا۔ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

رسالہ سہیل کا خاص نمبر بڑی خصوصیت کے ساتھ نکلا کرتا ہے اور بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اچھے اور تحقیق سے لکھے ہوئے مقالے، دلچسپ نظمیں اور اچھے ڈرامے ہوتے ہیں۔ زیر نظر نمبر میں بھی "آغا حشر اور اس کا آرٹ"، "موازنہ غالب و مومن میری نظر میں"، "دقیقی اور فردوسی" وغیرہ مضامین بہت اچھے ہیں اسی طرح افسانوں، ڈراموں، نظموں اور غزلوں کا معیار بھی برا نہیں ہے۔ شائقین کے لیے ...یک اچھے مطالعہ کا سامان ہیں۔

فہرست مضامین پر اگر صفحات دے دیے جاتے تو اچھا تھا نیز ان کی ترتیب بھی جیسی عام طور پر ...تی ہے ویسی ہونا چاہیے تھی تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔ اشتہارات کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ ادبی رسالہ ...ا جنسی امراض کے اشتہارات نہ ہونے چاہئیں۔

...ا زندگی — مدیر انیس الرحمٰن صاحب۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ نئی زندگی ۹۴ طرسپلیمنٹری زیرو روڈ الہ آباد ...ہ سالانہ صرف ۱۰؍ فی پرچہ ۸؍ صفحات ۹۴، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء سے ڈاکٹر سید محمود کی سرپرستی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ مقصد اس ...لنے کا یہ ہے اس میں خالص ہندوستانی کلچرل مسائل پر بحث کی جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں کے

اوروں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے مشترک کلچرل ترکے کو پیش کریں تاکہ ایک دوسرے سے گزشتہ کی طرح قریب آسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے رسالے کی سخت ضرورت تھی موجودہ ہندوستان کی فضا دیکھتے ہوئے۔ اس قسم کے رسائل کا نکلنا مفید اور پرنتائج ثابت ہوگا۔ زیر نظر اگست نمبر میں خاص خاص مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ (۱) مسلم عہد حکومت میں ہندؤں کی حالت (۲) سندھ پر عربوں کا حملہ (۳) یورپین سامراج کی اسلام نوازیاں۔ (۴) ہندوستان میں زبان کا مسئلہ، آنند (افسانہ)۔ (۶) تمام مذاہب عالم کی حیرت انگیز یکسانیت۔ (۷) مرہٹہ حکمراں فرقہ پرست نہ تھے۔ مضمون نگاروں کی فہرست جو صفحہ ۲ پر دی گئی ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ نئی زندگی والوں نے کس قدر ستھرا انتخاب کیا ہے۔ ہمیں نوجوان طبقہ ہی سے آیندہ کی بہتری کی امید ہوسکتی ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ اور اس کا مقصد و معیار قائم رہے۔

ہمارا اخبار۔ مرتبہ سید محمد ادریس ڈپٹی کلکٹر بلیا۔ صفحات ۱۰۔ سائز ۱۷×۲۷/۴ چندہ سالانہ عہ

یہ پندرہ روزہ اخبار جنگ کی حقیقتوں کو جاری رکھنے کے لیے نکالا گیا ہے۔ اپنے مقاصد کے پیش نظر اس کی ترتیب بہت معقول اور مناسب ہے۔ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں نکل رہا ہے۔

رفتار زمانہ

اس مہینہ میں، اب تک جنگ کے کوئی کارنامے، خاص طور سے بیان کے قابل نہیں ہیں لیکن تقریریں کئی ہوئی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر فتوحات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہم ان کی تعریف کریں تو اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہم ان کا اصل مطلب نہیں سمجھے، انھیں نظر انداز کریں اور بات اسی کو مانیں، جو توپ کے مُنہ سے کی جائے تو یہ بھی غلط ہوگا۔ یہ تقریریں ہمیں سیاست کے وہ بھید بتاتی ہیں، جو اور کسی طرح سے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ تبصرے ہیں ان واقعات پر جو ہمیں روز کی خبروں میں تھوڑے تھوڑے بتائے جاتے ہیں اس طرح کہ ان کی مجموعی شکل ہمارے سامنے نہیں آتی جنگ کی خبر صرف یہ ہے کہ جرمنی کا قریب قریب پورے جزیرہ نما کریمیا پر قبضہ ہو گیا ہے اور جرمن ہوائی جہاز، دون (Don) اور وولگا دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اس پر منڈلا رہے ہیں، یعنی قفقاز کو روس سے الگ کرنے کی کارروائی شروع ہو گئی ہے، کریمیا پر قبضہ کرنے کا خیال بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک ہوائی مرکز بنایا جائے، جہاں سے بحر کیسپین کے کناروں تک مشرق میں اور ترکی کے ساحل تک جنوب میں ہوائی جہاز بھیجے جا سکیں۔ ماسکو کے گرد لڑائی ہو رہی ہے جرمنوں کو جان اور مال کا بہت نقصان ہو رہا ہے لیکن وہ ماسکو کا محاصرہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ روسیوں نے یہ ہوشیاری کی کہ ماسکو کے جنوب میں جتنے کارخانے تھے، ان میں سے کام کی چیزیں پہلے ہی اُٹھا لے گئے اور محاذ سے دور مشرق کی طرف جا کر نئے کارخانے قائم کر دیے اور یہ یوکرائن میں جلے ہوئے ڈھیروں کے سوا جرمنی کے کچھ ہاتھ نہ لگا تھا ایسے ہی یہاں بھی ہو رہا ہے۔ جنگ کے شور اور خطرے میں یہ کام کر لے جانا بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن روسیوں کے پاس سامان جنگ کی پہلے ہی کمی تھی کارخانوں کو اس طرح منتقل کرکے انھوں نے اس کا انتظام کر لیا ہے کہ سامان تیار ہوتا رہے گر وہ [illegible] [illegible]

دشمن کو نقصان پہنچاتی ہے، لیکن گھیرے سے نکل نہیں پاتی۔ یہ حالت بہت مایوسی کی ہوتی اگر روسی ہمت ہار جاتے۔ وہ ہمت نہیں ہارتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان کا استقلال بڑھتا جاتا ہے اور اسٹالن کی جو تقریر حال میں ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ناکامی اور نقصان روسیوں کے ارادے کو اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے اس کے مقابلے پر ہر ہٹلر کی وہ تقریر رکھنا چاہئے جو انھوں نے کچھ دن ہوئے میونخ میں کی تھی اور جس میں طرح طرح سے بات بنا کر دکھایا گیا ہے کہ جرمنی کو کوئی ناکامیابی نہیں ہوئی ہے، ہر ہٹلر کی تقریریں اور بہت سے نکتے بھی تھے، جن کا تعلق روس کی جنگ سے نہیں، بلکہ دنیا کی سیاست سے ہے۔ جنگ ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس وقت ذرا ان تقریروں پر غور کیجئے جو اس جنگ کا حال بتاتی ہیں اور اس سیاست کا جس کی خاطر یہ جنگ ہو رہی ہے۔

ہر ہٹلر کی تمام تقریریں ایک سی ہوتی ہیں۔ ان کے اصول وہی ہیں، جو ہر بڑے پیمانے کی صنعت کا، کہ الگ الگ کل پرزے تیار کرلئے جائیں اور پھر انھیں جوڑ کر جو چیز بنانا ہو تیار کر لی جائے۔ ہر ہٹلر کی تقریر میں بہت سی پرانی باتیں تھیں اور بالکل نئی بات شاید کوئی بھی نہیں تھی۔ لیکن دنیا کی حالت بدلتی رہتی ہے اور ہر ہٹلر اپنی پرانی تقریروں میں کچھ بڑھا کر اور کچھ گھٹا کر جو نئی تقریر کرتے ہیں، اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ روس کی جنگ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ہم جس طرح چاہتے ہیں لڑتے ہیں، کبھی آگے بڑھتے ہیں، کبھی موسم کو ناموافق دیکھ کر یا رسد کا انتظام کرنے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں۔ ہمارا مقصد تماشا دکھانا نہیں ہے، ہم دشمن کی فوج کو ختم کرنا اور ملک پر پورا قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہر ہٹلر پہلے بھی کہہ چکے ہیں، لیکن چند دن کے اندر ماسکو فتح کرنے کا دعویٰ جو انھوں نے پہلے کیا تھا وہ اس مرتبہ دہرایا نہیں گیا۔ اس کے بجائے انھوں نے لینن گراڈ کے محاصرہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اس شہر کو گھیرے بیٹھے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ایک دن یہاں کی فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس کے پاس نہ کھانے کو کچھ رہے گا اور نہ گولہ بارود۔ ہم محاصرے میں ایک سپاہی کی جان بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے، بس محاصرے کو جاری رکھیں گے اور اگر روسی دوسرے شہروں کی طرح لینن گراڈ کو اڑا دیں گے تو بھی ہمارا کام ہے جو ان کے ہاتھوں اور خود بخود ہو جائے گا۔ خود بخود [illegible]

کام کتنے دنوں میں ہوگا یہ ہر ہٹلر نے نہیں بتایا اور وہ بتا بھی نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ اب جاڑا شروع ہوگیا ہے اور ان کا وعدہ تھا کہ اس کی جنگ جاڑوں سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔

سیاست پر جو تبصرہ ہر ہٹلر نے کیا ہے، وہ بھی اسی انداز میں تھا، وہ برطانیہ پر جنگ جوئی کا الزام لگاتے ہیں جس کا مطلب ہماری زبان میں یہ ہے کہ برطانیہ ان سے صلح کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہر ہٹلر اپنی طرف سے کئی مرتبہ صلح کی بحث چھیڑ چکے ہیں۔ اس کی استالن نے بھی تصدیق کی ہے۔ کہ ہر ہٹلر نے مغربی ملکوں کو روس کے خلاف ملانا چاہا۔ اپنی تقریر میں استالن نے یہاں تک کہا کہ ہر ہیس اصل میں جرمنی اور برطانیہ کے درمیان صلح کرانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ جنگ کی ذمہ داری برطانیہ پر ڈالنے میں ہر ہٹلر کا منشا یہ واضح کرنا ہے کہ برطانیہ یورپ کی اس نئی تنظیم میں حائل ہے وہ جو کرنا چاہتے ہیں اور جس کے لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اب فضا موافق ہے، اٹلی ان کے قابو میں ہے، فرانس کو انھوں نے اس حد تک راضی کر لیا ہے کہ اب فرانسیسی فوج روس کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کی جا رہی ہے، یورپ کی باقی تمام قومیں ہر ہٹلر کے ماتحت یا ان کی دست نگر ہیں۔ اس لئے جرمنی کے پروپیگنڈا ڈیپارٹمنٹ کو اس بات کا چرچا کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی ہوگی کہ یورپ کی تمام قوموں کی ایک کانفرنس جلد ہونے والی ہے۔ کانفرنس کا اشتہار دینے کے لئے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے پہلے کہا گیا تھا کہ اس کا اجلاس ماسکو کے مشہور محل کریملن میں ہوگا، لیکن جرمن قومیں ابھی تک ماسکو نہیں پہنچ سکی ہیں۔ اس لئے کانفرنس مجبوراً ویانا میں ہوگی۔ کانفرنس کا غالباً ایک مقصد یہ ہوگا کہ جرمنی نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کی تصدیق ہو جائے اور آگے کے لئے جرمنی کو اس کا باضابطہ طور پر اختیار ہو جائے گا کہ جس طرح سے چاہے جنگ کرے اور جس طرح چاہے صلح کی تدبیریں کرے۔ یہ بات شاید صاف صاف کہی تو نہیں جاتی لیکن کانفرنس میں صلح کی تحریک بھی اٹھائی جائے گی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ جنگ کا اصل ذمہ دار وہ ہے جو اس وقت صلح سے انکار کرے۔

ویسے تو کانفرنس کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن اس سے لوگ غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں، ترکی میں جرمنی کے اشارے پر یہ غلط فہمی جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی ہے، ترک دیکھتے ہیں کہ جنگ روز بروز ان کے ملک کے

ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ انھیں اندیشہ ہے کہ وہ اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے، اس لئے ترک علما چاہتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے جرمنی اور برطانیہ میں صلح کرا دی جائے۔ ترکوں کی اس خواہش سے فائدہ اٹھا کر جرمن کہتے پھرتے ہیں کہ ہاں ہاں اب صلح ہو جانا چاہئے۔ اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ جنگ جاری رکھی جائے اور ترک جو دل سے صلح پسند ہیں اب اس کی کوشش کریں تو صلح اور بھی جلدی ہو سکتی ہے۔ ترکوں کو سب اپنا دوست سمجھتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ صلح کانفرنس قسطنطنیہ میں ہو، واقف کار ترک تو یہ سمجھتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو کہ ترکی کے صدر عصمت پاشا نے جمہوریہ کی برسی کے موقع پر اپنی تقریر میں بیان کیا تھا، لیکن سب لوگ واقف کار اور ہوشیار نہیں ہوتے وہ تو جنگ سے بیزار ہیں اور ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

سمجھدار ترک تو جانتے ہیں کہ برطانیہ جرمنی سے صلح نہیں کرے گا اور ابھی صلح کا نام لینا فضول ہے لیکن ہرہٹلر کے دماغ میں یہ بات نہیں سماتی، وہ صلح اور جنگ کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق فرانس کو شکست کے بعد برطانیہ کو صلح کر لینا چاہئے تھا۔ اب برلن کے نزدیک روس کی شکست کے بعد صلح کی گفتگو کرنے کا موقع آئے گا۔ ہمارے لئے اول تو روس کی شکست کا ابھی کوئی سوال ہی نہیں ہے اس لئے کہ روس اپنی موجودہ حالت میں بھی مہینوں لڑ سکتا ہے، دوسرے اگر خدانخواستہ روس نے شکست بھی کھائی تو برطانیہ صلح کی گفتگو کرنے کے بجائے، جنگ جاری رکھنے کا نئے سرے سے عہد کرے گا۔ مسٹر چرچل پچھلے سال کہہ چکے ہیں کہ برطانیہ اگر ضروری ہوا تو برسوں تک اور ضروری ہوا تو اکیلا لڑتا رہے گا۔ استالن نے اپنی پچھلی تقریر میں روس کی طرف سے ایسا ہی کچھ کہا تھا۔ استالن، مسٹر چرچل اور پریزیڈنٹ روزولٹ کی تقریروں سے دنیا پر ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرا کا ساتھ کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتے اور جہاں تک ممکن ہو گا وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہیں گے۔ متحدہ ریاستوں نے روس کو بہت بڑی رقم قرض دی ہے پریزیڈنٹ روزولٹ نے اس کا انتظام کر لیا ہے کہ اگر جلد فیصلہ کرنا ہو تو ان کی اور استالن کی گفتگو براہ راست ہو جائے اس طرح روس کے لئے جنگ جاری رکھنے کا سامان ہو گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر استالن کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے کہ مغربی یورپ میں کہیں پر برطانوی فوجیں اتریں اور جرمنی کے خلاف محاذ قائم کریں۔

[illegible] روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ انہیں صرف صحیح تدبیر سوچنے میں مشکل حائل ہوئی ہے [illegible] قوم کوئی مصلحت سمجھا ہی سکتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ لینڈ اینڈ لیز ـــــ ادھار بنانا قانون منظور ہوا [illegible] کا نتیجہ ہے کہ اب قانون غیر جانب داری میں ترمیم کی جا رہی ہے اس کے بعد متحدہ ریاستوں کے تمام تجارتی جہاز مسلح ہو جائیں گے امریکہ سے انگلستان ہر قسم کا مال امریکہ کے جنگی جہازوں کی حفاظت میں پہنچایا جا سکے گا اور برطانوی بیڑا خالص جنگی کارروائیوں کے لئے وقف کیا جا سکے گا۔ اس طرح وہ اتحاد جو اب تک دل میں تھا، ایک بہت معقول عملی صورت اختیار کرے گا اور متحدہ ریاستیں، برطانیہ اور روس ایک دوسرے سے مل جائیں گے کہ فاشسٹ قوموں کا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔

جاڑا شروع ہو گیا ہے اور جنگ ایک نئی سی کیفیت کی طرح ان میدانوں میں بھی پھیل رہی ہے جہاں اب تک دھوپ اور ریت نے مورچوں اور خندقوں سے نکلنا مشکل کر دیا تھا۔ پچھلے سال برطانوی سپہ سالار نے لیبیا میں پیش قدمی دسمبر کے دوسرے ہفتے میں شروع کی تھی اس مرتبہ دشمن زیادہ چالاک اور مستعد ہے اس لئے ضروری تھا کہ اسے تیار ہونے کا موقع کم سے کم دیا جائے۔ موسم کے ناموافق ہو جانے کا امکان ابھی باقی ہے۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ بارش کی وجہ سے فوجی کارروائیوں میں خلل پڑتا ہے لیکن اچانک حملہ کرنے میں بھی بڑے فائدے ہیں۔ ان کو خالی اس بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ موسم اپنا رنگ بدل کر پریشان کرے گا۔

واقف کار لوگوں کے اخباروں میں جو بیانات شائع کرتے ہیں ان سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ریگستان کی لڑائی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ زمین ایسی ہوتی ہے جو کسی کو سہارا نہیں دیتی جس پر کسی کے قدم جمنے نہیں پاتے۔ کبھی آدمی اس کے اوپر ہوتا ہے تو کبھی یہ آدمی کے اوپر ہو جاتی ہے اس میں نہ راستہ بنایا جا سکتا ہے نہ ٹھکانہ اور اگر کسی کو اس کا پتہ بھی ہے کہ وہ کہاں ہے اور اس کی منزل کدھر ہے تو بھی [illegible] ایسی زمین میں کوئی مستقل محاذ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تھوڑی تھوڑی کر کے [illegible] کی جا سکتی [illegible] اگر آپ کی سمجھ میں فوراً نہ آ جائے کہ لیبیا میں برطانوی اور جرمن فوجوں کی لڑائی [illegible]

[illegible]

[illegible] سے اور بڑھائے جاتے ہیں جیسے سمندر میں جنگی جہاز [illegible] جو [illegible] ہوتے ہیں انہیں خیال رکھنا ہوتا ہے کہ پٹرول بھرنے کے لئے میدان [illegible] ان سے جو مقابلے ہوتے ہیں وہ بھی شدید اور مختصر ہوتے ہیں جیسے جنگی جہازوں کے مقابلے۔

لیبیا کا سارا میدان جنگ ریگستان نہیں ہے، ساحلی علاقہ میں پہاڑیاں ہیں [illegible] ان پہاڑیوں میں خود بستیاں اور مورچے ہیں جن میں برطانوی اور جرمن فوجیں اب تک قدم جمائے بیٹھی تھیں۔ برطانیہ کی موجودہ پیش قدمی کا مقصد یہ ہے کہ جرمن فوجوں کو ان کے مورچے سے نکال کر اور انہیں گھیر گھیر کر ختم کر دیا جائے۔ یہ مورچے ساحل کے قریب ہیں اور سمندر پر برطانیہ کا قبضہ ہے۔ اس لئے برطانیہ کا بیڑا بھی فوج کی مدد کر رہا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی نہ ہو۔ اٹلی کی فوجیں تو پچھلی دفعہ کی طرح اس مرتبہ بھی گرفتار ہو کر جنگ سے چھٹکارا حاصل کرنے پر تیار ہوں گی۔ اٹلی کے سرکاری ریڈیو نے جنگ کی دشواریوں کو بیان کرنا بھی شروع کر دیا ہے مگر جرمن فوجوں کا معاملہ کچھ اور ہے، ان کی طرف سے بھی ہر ہٹلر کہہ چکے ہیں کہ جنگ کا حساب کتاب تفصیلی نہیں ہوتا مجموعی ہوتا ہے، یعنی کہیں کامیابی ہوتی ہے اور کہیں شکست اور جیت اس کی سمجھنا چاہئے جس کی کامیابی کے کھاتے میں سب سے زیادہ رقم نکلے۔ یہ بات ٹھیک ہے اور اسے ہر ہٹلر ہی نہیں، برطانیہ کے رہنما بھی کہتے ہیں۔ لیکن ہر ہٹلر جانتے ہیں کہ ان کی سیاست اور جنگ ناکامیوں کو برداشت نہیں کر سکتی، وہ اپنے کھاتے میں اس مد کو رکھ ہی نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے جنوبی اٹلی، کریٹ اور یونان میں جرمن فوجیں تیار رکھی گئی ہیں، لیبیا کے محاذ پر سامان جنگ بھی پہنچایا گیا ہوگا اب تک اٹلی سے افریقہ تک سامان جہازوں میں آتا تھا، اب معلوم ہوتا ہے کہ سامان اور رسد ہوائی جہازوں سے بھیجے جا رہے ہیں، کیونکہ جہاز انہیں وقت پر نہیں پہنچا سکتے ہیں۔ یہ طریقہ کریٹ میں کارآمد ثابت ہوا تھا مگر وہ لڑائی بہت چھوٹے پیمانہ پر تھی اور وہاں بھی جرمنی نے بہت نقصان اٹھایا تھا۔ لیبیا کے محاذ پر اسی طریقہ سے سامان بھیجا جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جرمنی کو لیبیا پر قدم جمائے رکھنے کی بہت فکر ہے، اور لیبیا کا ہاتھ سے نکل جانا اس کے لئے بڑا صدمہ ہوگا۔

لیبیا پر قبضہ رکھنے کی مصلحت بھی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جرمنی کے لئے شمالی اور مغربی [illegible]

[illegible] مراکو اکر میں ہے اور دوسرا لیبیا میں [illegible]
[illegible] کو جرمنی آہستہ آہستہ قابو میں کر چکا ہے، اور سنا ہے وہاں سے جرمن جواب [illegible]
[illegible] کا پیش خیمہ بتائے تھے، اپنی فوجی وردیاں پہن کر جرمن سیاست کے چہرے سے نقاب اٹھا
رہے ہیں۔ (Tangiers) کے علاقہ پر، جہاں حکومت کا انتظام بین الاقوامی تھا، کئی مہینے
ہوئے جنرل فرانکو نے قبضہ کر لیا اور وہ بھی جرمنی کے حوالہ کر دیا گیا ہوگا۔ اس سلسلہ کی آخری کارروائی
یہ ہوئی کہ شمالی افریقہ کی فرانسیسی نوآبادیوں کا حاکم جنرل ویگان، جو جرمنی کے کسی قدر خلاف تھے
اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان نوآبادیوں میں ہٹلر کی عملداری ہو جائے، اپنے عہدے سے ہٹا دیئے
گئے ہیں اور فرانسیسی حکومت اب ان کی جگہ ایسے حاکم کو مقرر کرے گی جو جرمنی کی ہر خواہش کو
پورا کرنے پر راضی ہو جائے۔ شمالی افریقہ سے ڈاکر تک ریلوے لائن بننے کی خبر ایک مدت سے
آرہی ہے اور یہ کام اتنی تیزی سے کرایا جا رہا تھا کہ اب تک پورا ہو گیا ہوگا، ایسی صورت میں اگر
برطانوی فوجیں فرانسیسی نوآبادیوں، طونس اور الجیریا کی سرحد پر پہنچ جائیں تو جرمنی کے تمام منصوبے
خاک میں مل جائیں گے۔ اسی وجہ سے جنرل ویگان معزول کئے گئے اور اسی وجہ سے خیال ہوتا ہے
کہ لیبیا کی جرمن فوجیں جم کر لڑیں گی۔ بحر روم پر برطانیہ کا پورا قبضہ ہے، افریقہ کے شمالی ساحل پر بھی قدم
رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر ڈاکر کی بندرگاہ پر متحدہ ریاستوں نے جنگی جہازوں کا پہرہ لگا دیا تو صرف
مغرب نہیں بلکہ بحر اٹلانٹک پر بھی جرمنی کو دسترس نہ رہے گا۔

جرمنی کے لئے بہت اچھا ہوتا اگر اسے اس وقت تک روس سے فراغت ہو گئی ہوتی۔ جو
[illegible] پروگرام بھی یہ تھا کہ اور محاذوں پر جنگ شروع ہونے سے پہلے روس کی طرف سے اطمینان
[illegible] کر لیا جائے۔ روسیوں کی جوانمردی نے جرمنی کی یہ تدبیر الٹ دی ہے اور اس سے صرف
[illegible] قوموں کو بھی بہت سہارا ملا ہے۔ جرمن فوجوں کے لئے بہت [illegible]
[illegible]

[illegible] پر قبضہ کر کے وہ جلد سے جلد جنوب کی طرف بڑھیں گی اور جزیرہ [illegible] پر قدم
[illegible] اس میں وہ فوج اتاریں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ لیکن جلدی کی بھی ایک حد [illegible]
[illegible] کہ جرمن خود جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بھی ناکافی نہیں۔ اس لئے ترکی کے وزیر اعظم ہر [illegible]
[illegible] کے لئے بلائے گئے ہیں اس امید میں کہ شاید ترکوں کی مدد سے کام کچھ اور جلدی ہو جائے۔ [illegible]
[illegible] ترک کسی کی دھونس میں نہ آئیں گے۔ جرمنی جتنا اصرار کرے گا اتنا ہی وہ انکار کریں گے اور [illegible]
[illegible] ممکن ہے ہر ہٹلر جلدی میں اپنا کام اس طرح بگاڑ دیں کہ پھر وہ بنائے نہ بن سکے۔ فی الحال تو ہم [illegible]
کہہ سکتے ہیں کہ لیبیا میں برطانیہ کی پیش قدمی نے صرف ایک میدان میں نہیں۔ سیاست اور جنگ کے
بہت سے میدانوں میں دشمن کو مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ اب لڑائی صرف لیبیا میں نہ ہوگی
بلکہ اس کا محاذ ڈاکر سے شمالی ایران تک ہوگا۔

مغل لائن لمٹیڈ

زائرین کعبہ کے لئے مژدہ

مغل لائن نے گذشتہ سال برطانوی اور ہندوستانی بیڑوں اور ہوائی جہازوں کی حفاظت میں زائرین حج کے لئے نہایت اطمینان بخش انتظام کیا تھا۔ نہایت فخر اور مسرت کے ساتھ مغل لائن اعلان کرتی ہے کہ اس نے حکومت سے مشورہ کے بعد امسال بھی حاجیوں کی بزیارت کی تمام ممکن سہولتیں اور آسائشیں مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے۔

جنگ کی وجہ سے روانگی کی صحیح تاریخیں نہیں دی جاسکتیں۔ لیکن حاجیوں کو چاہئے کہ مندرجہ ذیل تاریخوں تک بندرگاہوں پر ضرور پہنچ جائیں۔ وقت مقررہ کے علاوہ پانچ دن کا مزید انتظام رکھیں ممکن ہے کہ کسی وجہ سے دیر ہوجائے

بمبئی ---------- ۱۰ ر دسمبر ۱۹۴۱ء

کراچی ---------- ۱۰ ر دسمبر ۱۹۴۱ء

بمبئی اور کراچی سے ان کے علاوہ اور جہاز بھی روانہ ہوں گے۔ کرایہ حسب ذیل ہے۔

	بمبئی تا جدہ	کراچی تا جدہ
درجہ اول واپسی مع طعام	۲۴۴/ روپئے	۲۱۶/ روپئے
عرشہ (چھت) " "	۲۰۲ "	۱۹۶ "

مندرجہ بالا کرایوں کے علاوہ بندرگاہوں کے قلی وغیرہ کے اخراجات کے سلسلہ میں ہر حاجی کو تین روپئے ۳ ، اور دینے ہوں گے۔

مزید تفصیل کے لئے ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کیجئے

میسرز مورسن اینڈ کمپنی لمٹیڈ، ۱۵ بنک اسٹریٹ بمبئی

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے زمانہ کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل عطر سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کیجیے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہو۔

مشتہر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر [illegible] لکھنؤ

قرآن حکیم کی بہترین تفسیر

"نظام القرآن"

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتاب الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے ان کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ علیہ کی تفسیر "نظام القرآن" سے بڑھ کر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں، پھر آیات سورہ کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں، پھر سورہ کے فلسفہ اسرار اور غوامض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور صحیح نقل اور صحیح اصل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں اہل علم اس کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الفیل	اردو ۴ر	عربی ۴ر	تفسیر سورۂ لہب	اردو ۶ر	عربی ۴ر
" کوثر	" ۴ر	" ۴ر	" کافرون	" ۴ر	
" والتین	" ۶ر	" ۴ر	" عصر	" ۶ر	
" عبس	" ۶ر	" ۴ر	" اخلاص	" ۵ر	
" قیامہ	"	۴ر	" والشمس	" ۵ر	.

تفسیر سورۂ مرسلات اردو ۵ر

قرآن سے متعلق دوسری کتابیں

مفردات القرآن (عربی)	۱۲ر	جمہرۃ البلاغۃ (عربی)	۱۲ر
اقسام القرآن (مطبوعہ مصر)	۴ر	الرای الصحیح فی من ہو الذبیح "	۱۰ر
[illegible] القرآن (عربی)	۱۲ر	ایک عمدہ عربی ریڈر	۴ر

مکتبہ [illegible] مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

ندوۃ المصنفین کی دو نئی کتابیں

قصص القرآن

کتاب کے اس حصہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات قبل عبور تک پوری تحقیق و تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے حالات اور قصص قرآنی پر اردو اور دوسری زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ قصص القرآن کے درجہ کی کوئی کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی جس میں موضوع کے اس عظیم الشان ذخیرہ کو ایسی جامعیت اور تحقیق کیساتھ یکجا کیا گیا ہو۔ قصص القرآن نہ صرف انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات کی مستند ترین تاریخ ہے بلکہ قرآن پاک کے ایک بہت بڑے حصہ کی بلند پایہ محققانہ تفسیر بھی ہے جسکی خوبیوں اور خصوصیتوں کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ذیل میں چند خصوصیتیں درج کیجاتی ہیں۔

۱۔ تمام حالات و واقعات کی اساس قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیث صحیحہ اور تاریخی بیانات سے انکی توضیح و تشریح کیگئی ہے۔ ۲۔ جدید تاریخ اور کتب عہد قدیم کے درمیان اور قرآن عزیز کے بیان کے درمیان اگر کہیں تعارض و اختلاف ہو گیا ہے تو کھلے ہوئے دلائل و براہین کے ذریعہ اس اختلاف میں تطبیق دینے کی کوشش کیگئی ہے اور بہر صورت قرآن کی وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے۔ ۳۔ اسرائیلی خرافات اور معاندین کے عقائد و اعتراضات کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ۴۔ خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی مشکلات پر بحث کے بعد سلف صالح کے مسلک کے مطابق ان مشکلات کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ۵۔ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ واقعات کے اصل مقصد یعنی غرض و غایت یعنی عبرت و بصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ صفحات ۴۰۰ بڑی تقطیع کتابت طباعت نہایت اعلیٰ۔

قیمت غیر مجلد چار روپیہ آٹھ آنہ، مجلد للعہ

تاریخ انقلاب روس

ٹراٹسکی کی مشہور و معروف کتاب تاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جس میں روس کے حیرت انگیز سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے اسباب و نتائج اور دیگر واقعات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اگر آپ موجودہ روسی نظام کے پس منظر کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں [illegible] تو اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں ضرور رکھئے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ

[illegible]

البیان

اپنے معاصرین کی نظر میں

۱۔ یہ پرچہ اپنے علمی مذہبی، تاریخی مضامین کے اعتبار سے دیگر جرائد پر فوقیت رکھتا ہے۔ (مسلم)

۲۔ اس کے تمام مضامین خاص نقطۂ نظر سے لکھے جاتے ہیں۔ (معارف)

۳۔ "البیان" نے تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کے متعدد دینی و علمی رسائل کی صف میں جگہ حاصل کر لی ہے (شہاب)

۴۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ ہمارے نئے پرانے تعلیم یافتہ اس کا مطالعہ کریں (ہمدرد صحت)

۵۔ ایک مذہبی پرچے میں جو خصوصیات ہونی چاہئیں "البیان" ان سب کا حامل ہے۔ (پیام نسواں)

۶۔ "البیان" ایک عرصے سے حقائق اسلامی کی ترجمانی کر رہا ہے۔ (احسان)

۷۔ "البیان" میں قرآنی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر اعلیٰ معیار کے مضامین شائع ہوتے رہیں۔ (سیاست)

۸۔ جہاں تک قرآن کریم کی مرکزیت کا سوال ہے "البیان" کے مضامین لوگوں کے لئے ایک تنبیہ کا کام دیتے ہیں۔ مذہبی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمانوں کے لئے "البیان" کا مطالعہ بیدار کن ثابت ہوگا۔ (پیامبر)

۹۔ رسالہ عمدہ ہے (مائدہ)

۱۰۔ رسالے کے آخری تفسیر بیان للناس کو بہ اقساط شائع کیا جا رہا ہے۔ (سبدس)

لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت تین روپے سالانہ (نوٹ) جو اصحاب سالانہ چندے کے ساتھ مزید ۱ شامل کرکے للعہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں گے۔ انھیں رسالہ "بلاغ" ۲۴ پرانے پرچے اور کچھ نہایت عمدہ دینی کتابیں مفت بھیجی جائیں گی۔ اس سارے لٹریچر کا مجموعی حجم ۲ ہزار صفحے ہے۔

ملنے کا پتہ

منیجر رسالہ "البیان" امرتسر پنجاب

چند نئی کتابیں

جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی اس کتاب میں نہایت تفصیل کے ساتھ، موجودہ جنگ کے علل و اسباب پر بحث کی گئی ہے۔ اور جنگ عظیم سے لے کر آج تک جتنے اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے ہیں ان پر مختصر مگر جامع نظر ڈالی گئی ہے۔ "ہٹلر کی فرعونیت" کے عنوان سے ابتدا میں ۲۰ صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ آٹھ نقشے بھی شامل ہیں۔

قیمت عہ

جنگ روس و جرمنی روس و جرمنی کی جنگ پر نہایت ہی دلچسپ اور پر از معلومات کتاب ہے، اشتراکیت، فسطائیت، روس کی خارجی حکمت عملی، روس کی طاقت جیسے اہم عنوانات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت عہ (جنوری میں مل سکتی ہے)

رضا شاہ پہلوی آج کل ایران جس طرح سیاست کا شکار ہوا ہے۔ اس سے پڑھا لکھا طبقہ بخوبی واقف ہے۔ ایسی شکل میں ایران کے نجات دہندہ رضا شاہ پہلوی کے حالات زندگی کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

قیمت ۸ر

پاکستان اور ہندوستان پاکستان کے مسئلہ کو ہندوستان کی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ سید عبد القدوس صاحب ہاشمی نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ قائد اعظم کی تصویر بھی شامل ہے۔

قیمت مجلد ۸ر

لیگ آف نیشنز یعنی جمعیۃ الاقوام جمعیۃ الاقوام پر ایک مفید کتاب جس میں لیگ کی کہانی، میثاق، نظام لیگ، اسمبلی، کونسل، سکریٹریٹ، تخفیف اسلحہ، مستقل بین الاقوامی عدالت، لیگ کی جدوجہد، لیگ اور مزدور، لیگ اور ہندوستان، ساتویں اسمبلی [illegible] جیسے اہم عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ (جنوری میں مل سکتی ہے)

قیمت ۱۲ر

[illegible] ہٹلر کے مقاصد کیا ہیں اور وہ کیا چاہتا ہے؟ اس پر اس کتاب میں بحث [illegible] کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نازیوں کا اقتصادی پروگرام، ہٹلر کے سیاسی ہتھکنڈے، میونخ پیکٹ، نوآبادیاتی مطالبہ، جرمنی اور پولینڈ کی کشمکش، جنگ کا آغاز، ہندوستان اور ہٹلرزم، خاتمۂ کلام ...... قیمت مجلد ۱۲؍

اسٹالن روس کی موجودہ جنگ نے اسٹالن کی شخصیت کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا، خالی از دلچسپی نہیں۔ اس کی شخصیت پر تین کتابیں ہیں (۱) مصنفہ اسکرلے۔ قیمت ۱۲؍، مصنفہ سٹیفن گراہم عمر، مولفہ گوپال متل بی اے۔ قیمت ۶؍

خوراک صحت صحت کے بنانے میں غذا کو بہت دخل ہے۔ گاندھی جی نے ذاتی تجربے سے معلوم کیا ہے کہ کونسی غذا صحت کے لئے مفید ہے اور کونسی مضر ہے۔ اس کتاب میں ان کے تجربات بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۱۴؍

وجدانیات محمد شوکت علی خاں فانی بدایونی کا تغزل کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ مرحوم کے ناز کلام کا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

مزدور کی دنیا مزدور کی پُر درد زندگی پر ہندوستان بھر کے چوٹی کے شعراء کا جدید جدید کلام قیمت مجلد ۱۲؍

محسوسات ماہر شاعر حیات جناب ماہر القادری کے کلام کا پہلا مجموعہ۔ قیمت مجلد عا؍

پریت کے گیت الطاف صاحب مشہدی کے کلام کا مجموعہ جو سلاست اور روانی، بےساختہ پن اور جذبات نگاری کا بہترین مثال ہے۔ قیمت مجلد عہ

ذکر و فکر مقصود زاہدی صاحب کے مضامین اور مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ماحول تعصب جیسے کوئی بیمار گی، ہندوستان میں طبقاتی تقسیم۔ قرب خیال، ڈاکٹر نیگی، شاہ کی ڈائری۔ ویدِ تعلیم کا ایک موثر ذریعہ، دکھنی رگ، مغنی جیسے عنوانات کے ماتحت نوجوان مصنف نے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ شروع میں ساغر نظامی صاحب نے ایک مختصر سا تعارف بھی لکھا ہے ...... قیمت عہ

انگریزی کی چند اہم کتابیں

ستان اے نیشن اس کتاب میں ان لوگوں کے اعتراضات کے جوابات دئے گئے ہیں جو پاکستان کی اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور ہندوستانی ایک قوم ہیں اس میں نہایت اہم مسئلوں پر نہایت سنجیدہ اور عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی تصویر بھی ہے۔

قیمت مجلد ۳؎

اکستان اور اچھوت یہ کتاب بھی مسئلہ پاکستان پر لکھی گئی ہے اور نفس مسئلہ کے علاوہ حسب ذیل عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ مذہب، معاشی مسائل، زبان، سیاست، تین قومیں، خاتمہ۔ قیمت مجلد ۱۲؎

یشنل لینگویج فار انڈیا ہندوستان کے لئے قومی زبان کے مسئلے نے بہت اہمیت اختیار کرلی ہے اور اس کے متعلق لیڈروں اور اہل قلم حضرات میں بڑا اختلاف ہے اس کتاب میں تمام مقتدر رہنماؤں اور اصحاب کے مثلاً مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، سروجنی نائیڈو، آصف علی، بشیر احمد، راجندر پرشاد وغیرہ کے افکار و خیالات نہایت عمدگی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔

قیمت مجلد ۶؎

الفاروق حصہ اول مولانا شبلیؒ کی الفاروق نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے ہیں یہ پہلے حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہے

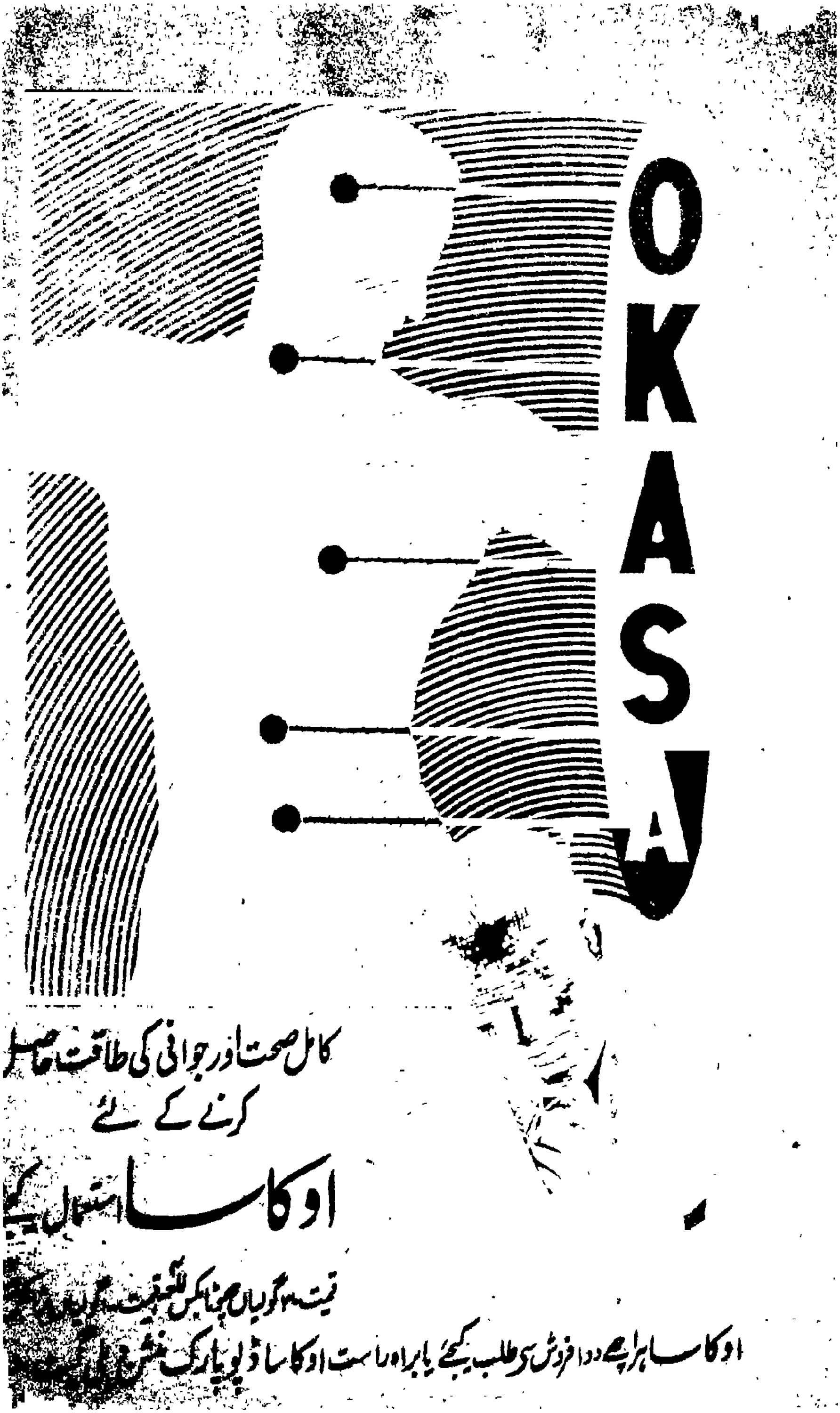
قیمت مجلد ۴؎

ابن خلدون اس کتاب میں ابن خلدون کی زندگی پیش کی گئی ہے اور اس کے کارناموں پر مختصر تنقید کی گئی ہے مصر کے مشہور اہل قلم محمد عبداللہ عنان نے عربی سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت ۳؎

محمد (صلعم) آنحضرت صلعم کے حالات و سوانح مولفہ حافظ غلام سرور صاحب۔ قیمت مجلد ۳؎

[illegible] یہ کتاب مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق ہے۔ مولفہ مولانا ظفر علیخاں صاحب۔ قیمت مجلد ۲؎

مکتبہ جامعہ دہلی قرول باغ



OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو

چند نئی کتابیں

تنظیم کتب خانہ یہ اپنے موضوع پر بالکل نئی کتاب ہے اس میں ڈیوی کے اعشاریائی تقسیم کے علاوہ یورپ کے دوسرے مشہور طریقوں پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے اور اس میں کتب خانہ کی تنظیم پر اسقدر وافر معلومات جمع کر دی گئی ہیں کہ ان کی روشنی میں بڑی آسانی سے کتب خانوں کی تنظیم کی جا سکتی ہے۔ کتاب میں حتی الوسع اصطلاحوں سے اجتناب کیا گیا ہے۔ اور اسلوب بیان نہایت سادہ اور سلیس ہے تاکہ عوام بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ قیمت ۸؍

شمس المیلاد اردو زبان میں، میلاد شریف پر بیشمار کتابیں موجود ہیں۔ مگر ان میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے عام خواتین آسانی سے پڑھ یا سمجھ سکیں اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے محترمہ شمسی عباد الرحمٰن صاحبہ نے اس رسالہ کو مرتب فرمایا ہے۔ اس کا طرز تحریر سادہ و شائستہ اور انداز بیان خطیبانہ اور دلنشین ہے۔ اس قسم کے رسالے ہمارے گھروں کی مجالس میلاد شریف میں پڑھنے کے لئے بہت مفید ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ یہ رسالہ خواتین کے حلقے میں خصوصیت کے ساتھ حسن قبول حاصل کرے گا۔ قیمت ۸؍

صحت و صفائی اس چھوٹی سی کتاب میں ہوا، پانی، خوراک، اور بخار اور دیگر بیماریاں جیسے تیرہ عنوانات پر افسانے کی شکل میں مفید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ قیمت ۸؍

مکتبہ جامعہ

نئی دہلی

رجسٹرڈ [illegible]

ایک معلّم کی زندگی

شائع ہوگئی

اس کتاب کو ماسٹر عبدالغفار صاحب مدہولی استاد مدرسۂ ابتدائی جامعہ نے بڑی محنت سے مرتب فرمایا ہے۔ یہ محض ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر دلعزیز درسگاہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ یہ کتاب ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ہر ایک جلد پانچ سو صفحات کی اور مجلد ہے۔ جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں خوبصورت گرد پوش نے کتاب کے ظاہری حسن میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت جس کی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحات ہے، کاغذ کی غیر معمولی گرانی کے باوجود محض پانچ روپے ہے۔ گو ترتیب کے وقت بچوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن یقین ہے کہ بڑے بھی پسند کریں گے۔ خصوصاً تعلیمی کام اور تجربہ کرنے والوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ جو جامعہ کے تعلیمی تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی قرولباغ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی